خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی

(1947 - 2002)

شبنم شکیل

ڈاکٹر سلیم اختر - خالدہ حسین

وزارتِ ترقیٔ خواتین، حکومتِ پاکستان - اسلام آباد

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

خواتین کی شاعری میں عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی

1947-2002

شبنم شکیل
ڈاکٹر سلیم اختر ۔ خالدہ حسین

وزارتِ ترقیِٔ خواتین، حکومتِ پاکستان ۔ اِسلام آباد

اشاعت اوّل : 2005ء

تعداد : 1000

ناشر : وزارتِ ترقیٔ خواتین، حکومتِ پاکستان، اِسلام آباد

مطبع : سگما پریس، راولپنڈی/اِسلام آباد۔ پاکستان

Rs. 500/-

Treatment of Women Issues
in the Works of Pakistani Poetesses
(A Project of Ministry of Women Development)
2005-2006
Islamabad.

پیش لفظ

حکومتِ پاکستان خواتین کی ترقی کا بھرپور احساس اور ادراک رکھتے ہوئے اس رہنما اصول پر کاربند ہے کہ ترقی کے عمل میں خواتین کی شرکت ایک لازم شرط ہے۔ اسی لئے خواتین کو قومی دھارے میں شامل کرنے اور ان کی اَن گنت صلاحیتوں اور توانائیوں سے بیش بہا فائدہ اٹھانے کیلئے وزارت ترقیٔ خواتین نے گزشتہ چند برسوں میں دوررس اور اہم نوعیت کے متعدد منصوبوں کا آغاز کیا ہے۔ پچھلے تین سالوں میں خواتین کو فیصلہ سازی کے عمل میں بااختیار بنانے کیلئے حکومت کی جانب سے قومی پالیسی کا باضابطہ اعلان ہوا۔ ملک میں پہلی بار ہزاروں خواتین کونسلروں کے براہِ راست انتخاب کے ذریعے اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں بھی خواتین کی خاطر خواہ نمائندگی کا موقع فراہم کیا گیا ہے تاکہ وہ مستقبل کو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی مرضی کے مطابق تعمیر کریں یہ اقدامات اس ملک کی تاریخ میں عورتوں کے حوالے سے ان کی حالت بہتر بنانے کے لئے یقیناً ایک انتہائی مضبوط اور ٹھوس بنیاد مُہیا کرتے ہیں۔ جن سے مستقبل میں خواتین کی زندگیوں میں بہت سی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔

خواتین کو مواقع فراہم کئے جارہے ہیں کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر قومی خدمت کے جذبے کے تحت میدان عمل میں آئیں اور قومی سطح پر خود اعتمادی کے ساتھ ملک کی سیاسی اقتصادی معاشرتی، ثقافتی اور معاشی ترقی میں برابر کی حصہ دار بنیں قومی تعمیر و ترقی ایک وسیع میدان ہے جس کے ہر شعبے میں خواتین کا

شامل ہونا، اپنی سرگرمیوں سے اس میں حصہ ادا کرنا اور کامیابی سے ان شعبوں کے استحکام میں مدد کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

خواتین کی قومی دھارے میں شمولیت کے لئے یہ ضرورت بھی محسوس کی گئی کہ پاکستانی خواتین کی شاعری کو بھی اس تحریک کا حصہ دار سمجھتے ہوئے ان کی گراں قدر خدمات کو تسلیم کیا جائے اور ادب کے ذریعے عورتوں کے مسائل کی تصویر کشی کو کتابی شکل میں منظر عام پر لایا جائے تاکہ خواتین کی نوجوان نسل اپنے آپ کو اس تاریخی جدوجہد میں فکری گہرائی سے وابستہ کرسکیں اُمید ہے کہ وزارتِ ترقیٔ خواتین کی یہ کاوش عورتوں کے حقوقِ آزادی اور حصول کی راہ میں ایک اُمید افزا باب ثابت ہوگی۔ ہم آپ کی قیمتی آراء کے منتظر رہیں گے۔

سہیل صفدر

سیکرٹری

وزارت ترقیٔ خواتین

حکومتِ پاکستان، اِسلام آباد

نومبر 2005

فہرست

سوالنامہ

تعارف

حضرت علیؓ کا قول ہے "کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ"

گویا کسی انسان کی پہچان کے لیے اس کا کلام کرنا شرط ٹھہرا۔ لفظ کی اہمیت حرمت اور طاقت سے کون انکار کرسکتا ہے اور لکھا ہوا لفظ تو صدیاں گزرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔

فنونِ لطیفہ کا کوئی بھی شعبہ خواہ وہ مصوری ہو کہ مجسمہ سازی۔ موسیقی ہو کہ شاعری۔ انسانی ذہن اس سے براہِ راست اور بالواسطہ دونوں طرح اثر پذیر ہوتا ہے۔ یعنی جیسے ہی آپ نے کسی مصور کا شاہکار دیکھا اور آنکھوں میں روشنی سی آ گئی۔ کوئی نغمہ سنا اور جھوم اٹھے۔ اچھا شعر سنا اور بے ساختہ داد دینے کو جی چاہا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ فن پارے آپ پر اس طرح بھی اثر انداز ہوتے ہیں کہ کہیں جا کے آپ کے لاشعور میں بیٹھ گئے اور یوں آپ کی سائیکی کا حصہ بن گئے۔ انسانی معاشرہ آفاقی اخلاقی اقدار پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ خطے اور علاقے کے حوالے سے منفرد تہذیب وثقافت کا بھی مظہر ہوتا ہے۔ اس طرح تخلیقی فنون ایک قوم کی اجتماعی نفسیات۔ امنگوں اور آرزوؤں کا آئینہ بن جاتے ہیں۔ انہیں محض وقت گزاری اور مشغلے کی سطح پر نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ معاشرتی رویوں پر اثر انداز ہو کر ایک بتدریج انقلاب کا سرچشمہ بننے کی قوت رکھتے ہیں۔ شعر کی اثر انگیزی تو خیر ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ دنیا کی شاعری کا زیادہ تر حصہ عورت کے بارے میں ہے۔ مگر مرد کے بنائے اس معاشرے میں خود عورت نے اپنا تخلیقی اظہار کس طرح کیا ہے؟

قدیم مصری تہذیب' ایشائی' یورپی۔ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کی تہذیب وتمدن اور ان کے صدیوں پرانے ادب کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ عورت کا لفظ کے ساتھ رشتہ کتنا پرانا ہے۔ خاص طور پر شاعری کے حوالے سے تو عورت کی آواز بہت ہی ممتاز ومنفرد نظر آتی ہے۔ اور اگر آج پوری دنیا کے ادب کا جائزہ لینے بیٹھ جائیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا یہ

صدی ہی عورت کی صدی ہے۔

برصغیر میں بھی تقریباً دو سو برس پہلے سے عورت نے شاعری کے حوالے سے بات کرنا شروع کر دی تھی مگر اس وقت کے حالات اور ماحول نے اسے نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اور یہ آواز شاعروں کی صف میں جگہ نہیں بنا سکی۔ البتہ قیام پاکستان کے بعد گزشتہ پچاس پچپن سال سے خواتین نے اس میدان میں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ اور پچھلے سو برسوں کی کسر نکال دی ہے۔ خوبصورت بات یہ ہے کہ جہاں ہماری خواتین نے اپنے بنیادی حقوق بلکہ انسانی حقوق کے لیے عملی جدوجہد کی ہے وہاں ہماری شاعرات نے اپنے نقطۂ نظر کو معاشرے تک پہنچانے کے لیے شاعری کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ اور اسے اتنا مؤثر بنا دیا ہے کہ آج ہم ان کی شاعری کو مجموعی طور پر معاشرے کی سماجی اقتصادی، تہذیبی ثقافتی اور سیاسی جہات پر اثر انداز ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ خوش آئند بات ہے کہ ہمارے میڈیا (ٹی وی۔ اخبارات۔ ریڈیو۔ فلم) نے اس کے اثرات قبول کیے ہیں اور عورت کے امیج کو اس کے صحیح تناظر میں عوام تک پہنچانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ سو ہمیں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ ہماری شاعرات نے پاکستانی معاشرے میں ہر حوالے سے گہرا شعور اور آگہی پیدا کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی ہے اور ان کی شاعری ان مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے دراصل شاعری کے حوالے سے خواتین کے پچھلے پچاس پچپن برسوں کے کام اور اس کے اثرات کا تحقیقی جائزہ لینے اور اسے عوام تک پہنچانے کی ایک کوشش ہے۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک جو کام شاعری کے حوالے سے خواتین نے کیا اس کی تحقیق کے دوران یہی ایک نقطہ تھا جو بار بار کسی نہ کسی طرح سامنے آتا رہا۔ کبھی اس شاعری کے ارتقاء کی منازل کا جائزہ لیتے ہوئے، کبھی میڈیا کے حوالے سے اور کبھی پاکستان کے لوگوں سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے جن میں دانشور، ادیب، شاعر، سیاستدان، وکلاء، ماہرینِ تعلیم، ذرائع ابلاغ سے متعلق اصحاب۔ فنکار اور طالب علم شامل ہیں کہ یقیناً خواتین کی شاعری نے ہمارے معاشرے کو ایک غیر محسوس طریقے پر بتدریج اور لاشعوری طور پر متاثر کیا ہے۔ اس ادبی تحقیق کے دوران بہت سے

سوالات بھی ذہن میں جنم لیتے رہے۔ اور ذہن نے حتی المقدور ان کے جوابات بھی دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک پہلو جو بہت کھل کر سامنے آیا کہ ہمارے معاشرے کی علمی، ادبی، سماجی، سیاسی، تہذیبی و ثقافتی اور معاشی اقدار پر سرسید کے بعد جس تحریک نے سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ ترقی پسند تحریک تھی۔ اس تحریک نے خواتین کے مسائل کو خاص طور پر اجاگر کیا۔ اور اس مظلوم طبقے کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا تھا اسے تنقید کا نشانہ بنایا۔ تیس کی دہائی میں شائع ہونے والا افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' اس سلسلے کی ایک اہم دستاویز ہے۔ عورت پر اس وقت کے معاشرے نے جو قدغنیں لگا رکھی تھیں اور اسے جن فرسودہ رسومات اور روایات کا شکار بنایا ہوا تھا ان پر بھی کڑی تنقید کی گئی تھی۔ سو اس تحریک کا اثر پورے معاشرے کی سوچ بالعموم اور خواتین پر بالخصوص ہوا۔ اردو ادب پر اس کے اثرات جیسے جیسے گہرے ہوتے گئے۔ شاعری پر بھی اس تحریک کی ایک گہری چھاپ نظر آنے لگی۔ خواتین کی شاعری نے بھی اس سے اثرات قبول کئے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج بھی خواتین کی وہ شاعری جس میں اس تحریک کے اثرات نظر آتے ہیں عوام کے دل سے زیادہ قریب ہے۔

۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک شاعری کا کون سا ایسا اہم موضوع ہے جس پر خواتین نے طبع آزمائی نہیں کی۔ غزل میں بھی اور نظم میں بھی انہوں نے ہر اس مسئلہ کو شاعری کا موضوع بنایا جو کسی نہ کسی حوالے سے پورے معاشرے پر اور خاص طور پر عورت کی زندگی پر اثر انداز ہو رہا تھا اور یوں پہلی مرتبہ عورت کی سوچ جو اب تک شجرِ ممنوعہ سمجھی جاتی تھی کھل کر سامنے آئی۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ مرد شعرا نے دیوان کے دیوان لکھ دیئے مگر وہ اپنی شاعری میں عورت کے جسمانی خدوخال اور اس کے چہرے کی خوبصورتی سے آگے نہیں بڑھے۔ ہمارے بڑے سے بڑے شاعر نے بھی عورت کو بحیثیت ایک فرد کے اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا۔ اس نے عورت کے ذہن کی بات اول تو کی ہی نہیں اور اگر کی بھی تو بہت کم۔ سو یہ فریضہ خواتین شعرا کو خود ادا کرنا پڑا کہ وہ دنیا کو بتائیں کہ عورت ذہن بھی رکھتی ہے اور اس کا اپنا ایک تشخص بھی ہے۔ اس کی انفرادی سوچ بھی ہے۔ خواتین نے اس حوالے سے شاعری کی اور خوب کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری

ایک انتہائی مؤثر صنفِ سخن ہے اور یہ لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتی۔ سو ایسا ہی ہوا کہ خواتین شعرا نے جہاں ایک عام عورت کی سوچ کو متاثر کیا وہاں پورے معاشرے کی سوچ کو ایک مثبت انداز دیا۔ ہمارے ملک کی پچاس فیصد سے زیادہ آبادی خواتین پر مشتمل ہے اور اگر سو میں سے ایک عورت بھی اس مثبت تبدیلی کا اثر لیتی ہے تو پورے معاشرے پر اس کا اثر پڑے گا۔ میں یہاں مثال دوں گی کہ ہماری خواتین شعرا نے لڑکیوں کی تعلیم پر بالخصوص اور غریب طبقے کے بچوں کی تعلیم پر بالعموم بہت سی نظمیں لکھیں۔ غزلوں میں بھی بالواسطہ طریقے سے یہی بات کہی جاتی رہی۔ اسی طرح خواتین کی شاعری میں لڑکے اور لڑکی سے مساوی سلوک کے حوالے سے بھی بہت سا مواد موجود ہے۔
اس شاعری میں امن اور بھائی چارے کی باتیں بھی اتنے مؤثر اور خوبصورت انداز میں کی گئیں کہ سخت سے سخت دل بھی اس سے اثر قبول کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاں بہت سی فرسودہ اور ظالمانہ روایات پروان چڑھتی رہیں۔ خصوصاً ہمارے دیہی علاقوں میں۔ کبھی ''وِنی'' کی رسم کی صورت میں کبھی ''قرآن سے شادی'' اور کبھی ''کاروکاری'' جیسی سفاکانہ رسم کی شکل میں۔ اب جب ہم خواتین کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہماری بہت سی شاعرات نے کھل کر ان غلط روایات کے خلاف آواز اٹھائی۔ مرد کے بنائے ہوئے معاشرے میں عورت پر ہونے والے جسمانی اور ذہنی تشدد کی تو اتنی موثر انداز میں عکاسی کی کہ حساس قاری کو خون رلوا دیا اور ظاہر ہے کہ یہ آواز صرف انہی تک تو محدود نہیں رہی مشاعروں کے ذریعے' کتابوں کے ذریعے اور دیہاتوں میں ریڈیو کے ذریعے ان مظلوم طبقوں تک بھی پہنچتی رہی جو براہِ راست اس سے متاثر ہو رہے تھے۔ اور آہستہ آہستہ شاعری نے باقی ادب کے ساتھ مل کر ان تمام غلط روایات کے خلاف ایک ردِ عمل پیدا کیا جس کی بازگشت بڑے بڑے ایوانوں تک پہنچی۔ قانون بنانے والے اداروں تک پہنچی اور منصفی کے فرائض انجام دینے والے لوگوں تک بھی پہنچی۔ غربت' جہالت اور اس کے نتیجے میں ایک بہت بڑا کنبہ اور اس کی کفالت کرنے والا ایک واحد مرد ہمارے معاشرے میں یہ بھی ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ میں بہت فخر اور یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ان حالات کو بہتر بنانے کے لیے بھی اور اس حوالے سے خواتین میں اور مردوں میں ایک شعور بیدار کرنے

اور انہیں اپنی بھلائی سے آگاہ کرنے کے سلسلے میں بھی ہماری خواتین کی شاعری نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جہاں مرد شعرا نے قومی اور ملی نغمے لکھ کر پاکستانی قوم میں ایک جوش اور ولولہ پیدا کیا وہاں خواتین شعرا بھی اس نیک فریضے کو انجام دینے میں پیچھے نہیں اور جب بھی ملک پر کوئی کڑا وقت آیا انہوں نے اپنی شاعری میں قوم کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی۔ اور تھوڑا ہی سہی قوم کو ایک صحیح سمت کی طرف چلنے اور اس سلسلے میں اس کی رہنمائی کرنے کا فریضہ بھی ادا کیا۔ لیکن یہاں میں ایک بات کہتی چلوں کہ عورت فطرتاً صلح جو اور امن پسند ہوتی ہے وہ ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ وہ جس معاشرے میں رہ رہی ہے وہ امن اور خوشیوں کا گہوارہ بن جائے تا کہ وہ بچوں کی تربیت صحیح خطوط پر کر سکے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ جب بھی دو ملکوں کے درمیان جنگیں چھڑتی ہیں تو عورتوں اور بچوں کو سب سے پہلے اس کا ہدف بننا پڑتا ہے۔ وہ یوں کہ ایک تو خود اس کی اپنی جان اور عصمت خطرے میں ہوتی ہے اور دوسری طرف محاذوں پر کبھی اس کا شوہر کبھی بھائی اور کبھی بیٹا دشمن سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ ان حالات میں عورت کے دل ودماغ پر کیا گزرتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خواتین نے پوری کوشش کی ہے کہ اپنی شاعری میں امن اور سلامتی جیسی نعمتوں کے ثمرات بیان کریں اور نہ صرف اپنے معاشرے کو بلکہ پوری انسانیت کو یہ درس دیں کہ جنگ کبھی کسی مسئلے کا حل نہیں ہوا کرتی۔ اور بالآخر تمام مسائل آمنے سامنے بیٹھ کر افہام وتفہیم سے حل ہوتے ہیں۔

بعض اوقات خواتین کی شاعری کے حوالے سے ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ ''وہ تو ایک تصوراتی دنیا میں رہتی ہیں اور رومانوی شاعری کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں محبت کے موضوع کے علاوہ اور کوئی موضوع نہیں ہوتا'' ویسے تو اس مفروضے کو فوری طور پر رد کیا جا سکتا ہے کیونکہ خواتین نے ملک وقوم کی سیاست پر (غزلوں اور نظموں دونوں میں) اتنا کچھ کہا ہے کہ اب اس حوالے سے ان کے مزید دفاع کی کوئی ضرورت نہیں رہتی لیکن اگر اعتراض کرنے والوں کا یہ نکتہ تسلیم بھی کریں کہ عورت صرف محبت کی بات کر سکتی ہے تو ذرا بتایئے اس میں حرج کیا ہے۔ عورت اگر محبت کی بات نہ کرے تو کیا نفرت کی کرے۔ عورتوں کی رومانوی شاعری نے بھی معاشرے کی سوچ پر گہرے اثرات مرتب

کیے ہیں وہ یوں کہ اس مرد کے بنائے ہوئے معاشرے میں انہوں نے صدیوں سے چپ رہنے والی عورت کو زبان دی ہے اور اُس میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی جرأت پیدا کی ہے۔

کیا یہ تمام دلائل اس امر کو ثابت نہیں کرتے کہ خواتین کی شاعری نے عورت ہی کے ذریعے پورے معاشرے پر اپنا گہرا تاثر چھوڑا ہے۔ یہاں ایک بات کا ذکر کرنا از حد ضروری ہے کہ ادب ہمیشہ سے متوسط درجے کے درمیان پروان چڑھا ہے یہی ایک طبقہ ہے جو ادب پڑھتا ہے اور اس کے اثرات قبول کرتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ یہ طبقہ معاشرے کی ریڑھ کی ہڈی ہے اور اسی کے طفیل ابھی تک ہماری کچھ اچھی اقدار سانس لے رہی ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ کسی بھی تحریک کا آغاز تو متوسط طبقے سے ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کی رسائی تمام طبقوں تک ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اب ہم محسوس کر رہے ہیں کہ خواتین کی شاعری کا اثر متوسط طبقے سے ہوتا ہوا تمام طبقوں تک پہنچ گیا ہے۔ خاص طور پر ایسے لوگ کہ کتاب جن کی پہنچ میں ہے اور جو ذرائع ابلاغ سے بھی مستفید ہو رہے ہیں۔ ان کی سوچ میں ایک مثبت تبدیلی آ رہی ہے۔ یقیناً یہ ایک خوش آئند بات ہے گو کہ ہمارا ملک بہت سے مسائل اور limitations سے دوچار ہے۔ ان میں سے ایک تو تعلیم کے تناسب میں کمی ہے دوسرے اقتصادی اور معاشی ناآسودگی' تیسرے پسماندہ اور دور دراز کے علاقوں میں ذرائع آمدورفت کی دقتیں ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر کتاب کہ جو اس روشنی کا منبع ہے جس سے ہر ذہن منور ہو سکتا ہے اس کی رسائی بہت کم لوگوں تک ہے۔ تحقیق کے دوران جو بہت سے پہلو سامنے آئے ان میں اہم ترین یہی تھا کہ پسماندہ علاقوں میں تعلیم کا فقدان ہے۔ ذرائع ابلاغ بھی ان تک کم پہنچتے ہیں۔ اور اگر خوش قسمتی سے وہاں کچھ لوگ تعلیم یافتہ ہیں بھی تو اول تو کوئی ادبی کتاب ان تک پہنچتی ہی نہیں اور اگر پہنچ بھی جائے تو وہ اسے خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ جیسا کہ میں نے کہا باقی میڈیا بھی اسی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ چنانچہ ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم کو عام کیا جائے اور وہ تمام ادارے جو کتاب اور نشر و اشاعت سے وابستہ ہیں اس بات کو یقینی بنائیں کہ یہ نعمت عام لوگوں تک پہنچے اور خاص طور پر

پسماندہ علاقوں تک اس کی رسائی ہو۔ کتاب کی قیمت کم سے کم رکھی جائے اسی صورت میں وہ مثبت نتائج سامنے آسکتے ہیں جن کی امید ہم اس پراجیکٹ سے لگائے بیٹھے ہیں۔

ہماری یہ تحقیقی کاوش کہاں تک کامیاب رہی۔ اس کا فیصلہ آپ پر ہے۔ لیکن یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ اس کا کریڈٹ وزارتِ ترقی خواتین کو جاتا ہے کہ جن کے ایما اور تعاون پر یہ کام شروع کیا گیا۔ خواتین کی وزارت نے نہ صرف پراجیکٹ کے لیے مالی تعاون کیا بلکہ قدم قدم پر مجھے اور میری ٹیم جس میں معروف نقاد اور دانشور ڈاکٹر سلیم اختر اور عہد ساز اور منفرد افسانہ نگار خالدہ حسین شامل ہیں کو اپنے قابلِ قدر مشوروں سے نوازا۔ اس کام کے دوران مجھے تمام صوبوں کے دانشوروں' سیاستدانوں' ادیبوں' وکلاء' ماہرینِ تعلیم بیوروکریٹس' میڈیا کے لوگوں۔ طالب علموں اور عوام سے بھی جو رسپانس ملا وہ بذاتِ خود ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ میں ان سب کی بھی بے حد شکر گزار رہوں۔

میں آخر میں فقط یہ کہنا چاہتی ہوں کہ یہ پراجیکٹ تو بارش کا پہلا قطرہ ہے اور ایک بڑے مقصد کی شروعات ہیں۔ میری حقیر رائے یہ ہے کہ ہماری خواتین نے جن جن شعبوں میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے ان پر تحقیق کرنے اور انہیں سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے راستے کے کانٹے چن کر منزل تک پہنچنے کے عمل کو آسان بنانے کی کوشش کی۔

شبنم شکیل

آغاز

کائنات کی پہلی صبح طلوع ہوئی تو عورت اپنی تمام تر رعنائیوں اور تخلیقی توانائیوں کے ساتھ موجود تھی۔ محبت اور انسانیت کی خوبصورت کرنیں بکھیرتا ہوا اس کا وجود کہ جس کی کشش نے خاندان اور معاشرے کو یکجا کیا۔ اس کو اعتبار بخشا۔

عورت حسن و جمال کے پیکر اور ایک حسین مجسمے کی صورت میں مرد کے تخیل اور اس کے تخلیقی عمل کی آبیاری کرتی رہی۔ سب نے اسے بڑی دریا دلی سے فنونِ لطیفہ کا محرک تسلیم کیا۔ اسے اس حوالے سے Inspiration کا نام تو دیا مگر خود اس کے ہاتھ میں قلم ہونا مرد کے بنائے ہوئے معاشرے میں ممکن نہیں تھا۔ دنیا کی ہر تہذیب نے عورت کی ذہنی صلاحیت کو تسلیم کرنے میں پس و پیش سے کام لیا۔ شاید اس کی انفرادی سوچ اور صلاحیت سے خوف کھا کر معاشرے نے رفتہ رفتہ اسے پسِ منظر کے دھندلکوں میں دھکیل دیا۔

غالباً اسی لیے ورجینیا وولف سوال کرتی ہے کہ اگر شیکسپیئر کی بہن اُس جیسی صلاحیت کی مالک ہوتی تو معاشرہ اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا۔؟ حتیٰ کہ کھیتوں اور کھلیانوں میں مرد کے دوش بدوش کام کرتی ہوئی عورت، بچے کو لوری دیتی ہوئی ماں، ترنجنوں میں ہمجولیوں کے ساتھ لوک گیت گاتی ہوئی لڑکی کی اونچی آواز بھی معیوب خیال کی جاتی رہی اور قابلِ گرفت سمجھی جاتی رہی (یہ لوک گیت بھی اپنی اپنی ثقافت کے اعتبار سے عورت کی تخلیقی قوت کا بہترین اظہار ہیں) گو عورت کی ذہنی صلاحیت اور تخلیق کی کوشش کو دیکھا جائے تو اس کی سوچ بذاتِ خود ایک شجرِ ممنوعہ تھی۔

وہ اشعار کا موضوع تو بن سکتی تھی مگر خود شاعر نہیں۔ داستان گوئی کا لامتناہی تانا بانا اس کے گرد بُنا تو جا سکتا تھا مگر وہ خود داستان گو یا کہانی کار بن سکتی یہ ناممکن تھا۔ مرد کے

بنائے ہوئے معاشرے میں یہ ایک سانحے سے کم نہ تھا۔

برِ صغیر میں ہند اسلامی تہذیب اپنے جاہ وجلال اور دلآویزی کے حوالے سے دنیا کی دلکش ترین تہذیبوں کی صف میں شمار کی جاتی ہے۔اس دلکش تہذیب کا ثمر زبانِ اُردو، جس کی شاعری کا ابتدائی دور عورت کی آواز سے محروم نظر آتا ہے۔

عظیم الشان مغلیہ سلطنت کے آخری ایام میں متوسط اور طبقۂ اشرافیہ کی عورت کہ اپنے تہذیبی پس منظر کے باعث اور اس کی وارث ہونے کے حوالے سے شعر کے اظہار کی بخوبی اہل تھی مگر معاشرے کی بے شمار پابندیاں اسے گھر کی چار دیواری اور بچوں کی پرورش تک محدود کیے ہوئے تھیں۔ ذہنی اور فکری وسعت کے تمام دروازے اس پر بند تھے۔

ذرا سوچئے کہ مرد کے حصے میں دنیا کی تمام وسعتیں اور عورت کے لیے صرف آنگن۔ وہ نیم روشن کمروں، چلمنوں کے ہجوم، اُن کی پُر پیچ ڈوریوں اور خادماؤں کے جھرمٹ میں اپنی تنہائی کو لحہ بہ لحہ قتل کرنے پر مجبور تھی۔ مگر تخلیق کا شعلہ بھڑکے بغیر کب رہتا ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے اس سے کوئی مفر نہیں۔ چنانچہ اس حبس میں بھی دنیائے شعروسخن میں حکمران خاندانوں کی چند شہزادیوں اور بیگمات کی آواز سنائی دیتی ہے۔اور کچھ ایسی آوازیں بھی کہ جن کا تعلق طبقۂ اشرافیہ سے نہ تھا۔اور سماجی مراتب کے حوالے سے ان کا نام اور پیشہ عزت وتکریم سے محروم تھا۔

بہر حال یہاں حیرانی اس امر پر ہوتی ہے کہ جہاں بھکاری کے اشعار بھی گلی گلی گونجا کرتے تھے وہاں عورت کا خاموش رہنا کیونکر ممکن تھا۔ بہارستانِ ناز حکیم فصیح الدین رنج کا ایک دلچسپ تذکرہ ہے وہ خود 1885ء میں رحلت فرما گئے تھے۔اس تذکرے کو تمام اغلاط کی تصیح کر کے موجودہ صورت میں خلیل الرحمان داؤدی نے مرتب کیا۔ یہ معاصر تذکروں میں اس لیے منفرد ہے کہ اس میں 174 شاعرات کے حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام درج ہے۔اس تمام دور میں عورت کے اظہار پر کس قدر قدغنیں تھیں۔اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ تمام شاعرات صیغۂ مذکر میں بات کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ معاشرہ شعروسخن کو صرف مرد کی زبان سے سننے یا سنانے کا عادی ہے۔ان شاعرات کے ہاں اکثر و

بیشتر موضوعات روائتی ہیں۔ کہیں بھی نسوانی احساس یا خواتین کا اپنا رنگ یا تجربہ نظر نہیں آتا۔ نواب معتمد الدولہ کی صاحب زادی بیگم سلطان کا شعر ہے

تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا
ملتے ہی آنکھ رہ گیا کہہ کے میں ہائے دِل

جناب آصف الدولہ کی بیگم دُلھن بیگم کہتی ہیں:

بہا ہے پھول کی آنکھوں سے آبلہ دِل کا
ترّی کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا

خاندان تیموریہ کی ایک خاتون نواب اختر علی کا شعر ہے:

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا
اُن کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

ایک دلچسپ اور حیران کن واقعہ یہ ہے کہ اُردو غزل کے سحر سے صاحبانِ افرنگ اوران کی بیگمات بھی نہ بچ سکیں اور اسیرِ غزل ہوئیں۔ ان کی بھی متعدد غزلیات دستیاب ہیں۔ گویا:

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ کون ہے یہ ایک تحقیقی مسئلہ ہے عام طور پر مہ لقا چندا کو پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ تسلیم کیا جاتا ہے ان کا دیوان 1213 ہجری میں

شائع ہوا۔

ان کا ایک شعر ہے

اخلاق سے تو اپنے واقف جہان ہے گا
پر آپ کو غلط کچھ اب تک گمان ہے گا

مہ لقا چندا کے دو اور اشعار دیکھئے:

ان کی آنکھیں دکھا دے ٹک نرگس
چاہتے ہیں جو بار بار شراب

ملایا کر تو ان انکھڑیوں سے آنکھ کم نرگس
نہ کر یوں دیدہ و دانستہ اپنے پر ستم نرگس

یہاں یہ امر واضح کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ بعض تحقیق نگاروں کے نزدیک لطف النسا امتیاز پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہیں کیونکہ ان کا دیوان ایک سال پہلے مرتب ہو چکا تھا۔

وقت وہ کینوس ہے کہ جس پر تہذیب لمحہ بہ لمحہ اپنے نقوش ثبت کرتی جاتی ہے۔ اس کے بعد واجد علی شاہ کا دور بھی شعری حوالے سے بہت بھرپور نظر آتا ہے۔ ان کی بیگم صدر محل صاحبِ دیوان شاعرہ ہیں۔ قادر الکلامی ان کے ہر شعر سے ٹپکتی ہے۔ مشکل ردیفوں اور سنگلاخ زمینوں پر کس آسانی سے شعر کہتی ہیں۔

ذرا نمونہ کلام دیکھئے:

شمع جلانے آئے ہیں آج وہ میری قبر پر
چلو خدا کے واسطے بادِ صبا الگ الگ

خاک ہو زندگی بھلا تیرے مریضِ عشق کی
میں ہوں دوا سے دُور دُور مجھ سے دوا الگ الگ

ہجر میں خوب خاک اُڑی ان کو ہوا نہ کچھ اثر
نالے گئے الگ الگ، آہِ رسا الگ الگ

فصیح الدین رنج ہی کے تذکرے میں ایک شاعرہ رضیہ جمیلہ کا ذکر بھی ہے جنہوں نے بہت سے دیوان چھوڑے ہیں ان کے دو اشعار دیکھئے۔

اے جمیلہ نہ ملا بت نہ ملا مجھ کو خدا
میں تو اس ہستیِ موہوم میں بے کار آئی

فدا جس پہ ساری خدائی ہوئی ہے
وہ تصویر کس کی بنائی ہوئی ہے

ان صاحبِ دیوان شاعرات میں سے کچھ اٹھارویں صدی تک شعر کہتی رہیں ان میں سے ایک شاعرہ حضرت بی بی ولیہ ہیں۔ تصوف سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں۔ اسی زمانے میں ایک شاعرہ سید النساء تھیں جن کا تخلص حرماں تھا یہ مولانا حق خیر آبادی کی صاحبزادی تھیں ان کا ایک شعر قابلِ توجہ ہے۔

دردِ دل دردِ جگر کاوشِ دل کاوشِ جاں
اتنے آزار ہیں اور ایک کلیجہ میرا

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ یہ شاعرات بہت سی پابندیوں کی وجہ سے اپنے احساسات کی صحیح ترجمانی کرنے سے گریزاں رہیں۔ اگر کہیں کہیں شعر میں نسائی شعور کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو خاصی حیرانی ہوتی ہے۔ والیِ ریاست بھوپال کی بیگم جو شیریں

تخلص کرتی تھیں ان کے کچھ اشعار دیکھئے:

اے بادِ صبا تُو ہی تنِ زار کو لے چل
گلزار میں آیا ہے وہ گلفام ہمارا

جھوٹی قسموں سے دلاسے تو نہ دو شیریںؔ کو
دل بھی پھیرا ہے کبھی تم نے کسی کا لے کر

دردِ فراق ہی میں صدا مبتلا رہے
دنیا میں اس طرح بھی رہے ہم تو کیا رہے

''عورت اور لفظ کا رشتہ معلوم تاریخ میں تقریباً ساڑھے تین ہزار برس سے قائم ہے۔ قدیم مصری تہذیب میں محفوظ شاعری کے نمونے سے لے کر آج تک عورت نے انفس و آفاق کے درمیان پھیلی ہوئی اس دنیا میں جو سوچا ہے محسوس کیا ہے اور بیان کیا ہے وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت اہم حصہ ہے۔ مظلومی اور محرومی کی منزلوں سے شعور و آگہی کا یہ سفر اپنے ساتھ جدوجہد کی ایک روشن تاریخ لئے ہوئے ہے''

''عورت دنیا کی نصف آبادی ہے اور یہ آبادی کیا سوچتی ہے اور محسوس کرتی ہے۔ وہ کس دنیا میں زندہ ہے اور کس دنیا کے خواب دیکھتی ہے۔ مگر اس میں کوئی شک شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ زندگی کے بارے میں اس کا وژن ضرور الگ اور ممتاز ہے۔ اس وژن کو وہ کس طرح فنی تقاضے نبھاتے ہوئے اظہار کا روپ دیتی ہے اس سلسلے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر عورت کا لکھا نکال دیا جائے تو دنیائے ادب کتنی مفلس، کس قدر قلاش رہ جاتی ہے' عورت کی ایک اپنی دنیا بھی ہے۔ انسان کے عمومی مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے مسائل بھی ہیں جو صرف وہی جانتی' سہتی، خون میں رچاتی اور ان کے فنی اظہار کے لیے مضطرب رہتی ہے۔ نسائی حسیّت کوئی فارمولا نہیں کہ جسے سامنے رکھ کر وہ ادب تخلیق کرے۔ یہ تو اس کی زندگی کے منفرد تجربے اور طرزِ احساس ہی کا نام ہے''۔

ان اقتباسات کو اپنی تحقیق میں شامل کرنا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ایک ارتقا کا عمل سامنے لایا جائے جس سے عورت کی شاعری گزرتی آئی ہے۔ آج تک پہنچتے ہوئے وہ کیسے کیسے سخت مقامات سے دوچار ہوئی ہے اور پھر بھی کتنی ثابت قدم رہی ہے۔

علی گڑھ تحریک کے ساتھ ہی ایک نیا تعلیمی دور شروع ہوا اِس جدید تعلیمی دور میں تمام معاشرے میں استدلال اور عقل وشعور کی ایک نئی لہر اُٹھی۔ تمام طبقوں میں یہ شعور بیدار ہوا کہ تعلیمِ نسواں کے بغیر کوئی ملک، کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ عورت بھی ایک میٹھی نیند سے بیدار ہوئی۔ بیسویں صدی نے عورت پر ایک فعال مستقبل کے دروازے کھول دیئے۔ اُسے درس گاہوں کی بھی زیارت نصیب ہوئی۔ گھر گھر تعلیم کا چرچا ہوا۔ چنانچہ وہ شعروادب میں اپنا لوہا منوانے کے لیے نکلی۔ تیس کی دہائی میں ترقی پسند تحریک میں عورت کے تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آئے۔ شعروادب میں ایک جہت کا دروازہ کھلا۔ حبس اور گھٹن کسی حدتک دور ہوئی۔ عورت کی زندگی میں بھی مثبت تبدیلیاں آئیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے زندان میں کوئی روزن کھول دیا ہے۔ جس سے آنے والی روشنی میں وہ اپنے ذہنی خدوخال دیکھ سکتی ہے۔

پھر وہ مبارک دن بھی آیا کہ وقت کے آسمان پر صبحِ آزادی طلوع ہوئی۔ یہ چوتھی دہائی کے آخری سال تھے۔ پاکستان میں نئے عزائم کے ساتھ سفرِ حیات جاری ہوا۔

ادا جعفری کہ قیامِ پاکستان سے پہلے بھی شعر کہہ رہی تھیں ان کے بہت سے مجموعے تقسیم کے بعد شائع ہوئے اور وہ شاعری کی خاتونِ اول کہلائیں۔ بعد میں آنے والی شاعرات میں زہرا نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، شبنم شکیل، پروین فنا سید، عرفانہ عزیز، شاہدہ حسن، فاطمہ حسن، یاسمین حمید، عشرت آفرین، منصورہ احمد، ثمینہ راجہ، شاہین مفتی، نوشی گیلانی، ماہ طلعت زاہدی اور حمیرا رحمان کے نام اہم ہیں۔

نثری نظم کے حوالے سے نسرین انجم بھٹی' سارہ شگفتہ' شائستہ حبیب' عذرا عباس' عطیہ داؤد اور بہت سی دوسری شاعرات کے نام نمایاں طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد ایسی شاعرات ہیں جنھوں نے عورت کے حوالے سے بہت موثر لہجے میں بات کی مگر یہاں مقصد فہرست مرتب کرنا نہیں ہے۔

ادا جعفری، زہرا نگاہ، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض نے مرد کے اس استحصالی معاشرے میں جرأتِ اظہار کی اساس رکھی۔ ان کا لہجہ بے باک اور انداز پر شکوہ تھا۔ بلکہ پروین شاکر نے تو یہ تک کہا تھا کہ ''میرے راستے کے کانٹے انہی شاعرات نے پہلے چن لیے تھے'' ہم تو یہ کہیں گے کہ ان شاعرات سے پہلے بھی کئی اور شاعرات نے بھی معاشرے میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ گو سرسید کی تحریک نے عورت کو اس کا صحیح منصب دلانے میں خاصہ کردار ادا کیا تھا لیکن ترقی پسند تحریک کے ذریعے تو ایک بہت بڑی تعداد میں خواتین قلم کاروں کو اپنی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر کرنے اور خود کو تسلیم کروانے کے مواقع ملے۔ اس کی بدولت ہماری شاعرات میں کھل کر بات کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ چنانچہ گذشتہ نصف صدی میں متعدد ایسی شاعرات آئیں جنہوں نے اپنے تخلیقی وژن سے زندگی، معاشرہ اور خود اپنی ذات کو نسوانی زاویہ نگاہ سے پیش کیا۔ یہاں غزل کے پیرائے میں بات کرنے کے حوالے سے شبنم شکیل اور پروین شاکر نے شاعری میں احساسِ جمال کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اگرچہ ترقی پسند تحریک نے بھی عورت کی جرأتِ اظہار کو مہمیز کیا تھا مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خود ان کے اندر ایک بڑا پوٹینشل موجود تھا۔

اس سلسلے میں ادا جعفری کی ایک نظم دیکھئے جس کا عنوان ہے ''تم بھی!''

مدتوں بعد آئی ہو تم
اور تمہیں اتنی فرصت کہاں ہے
ان کہے حرف بھی سن سکو
آرزو کی وہ تحریر بھی پڑھ سکو
جو ابھی تک لکھی ہی نہیں جا سکی
اتنی مہلت کہاں
میرے باغوں میں جو کھل نہ پائے ابھی
ان شگوفوں کی باتیں کرو
درد ہی بانٹ لو
میرے کن ماہتابوں سے تم مل سکیں

کتنی آنکھوں کے خوابوں سے تم مل سکیں
ہاں تمہاری نگاہِ ستائش نے
گھر کی سب آرائشیں دیکھ لیں
میرے دل میں جو پیکاں ترازو ہوئے
تم کو بھی
لالہ وگل کے بے ساختہ استعارے لگے

اس کے ساتھ زہرا نگاہ کی نظم ''سمجھوتا'' کا بہت چرچا ہوا۔ یہ انسانی معاشرے کی کتنی بڑی سچائیاں تھیں جو زہرا نگاہ نے اپنی اس چند لائنوں کی نظم میں بیان کر دی ہیں۔ کیا کوئی مرد اس سچائی کا اتنے احسن طریقے سے اظہار کر پاتا۔ یہ نظم قدروں کے انہدام میں ایک حوصلے کی دیوار ثابت ہوئی ہے۔ دیکھئے زہرا نگاہ نے اس دیوار کو کس سلیقے سے اٹھایا ہے۔

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر
یہ چادر میں نے برسوں میں بُنی ہے
کہیں بھی سچ کے گل بوٹے نہیں ہیں
کسی بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں ہے
اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا
اسی سے تم بھی آسودہ رہو گے!
نہ خوش ہو گے نہ پژمردہ رہو گے
اسی کو تان کر بن جائے گا گھر
بچھا لیں گے تو کھل اٹھے گا آنگن
اٹھا لیں گے تو گر جائے گی چلمن

اب ہم خاص طور پر کشور ناہید کی ایک نظم ''خود کلامی'' کا ذکر کرتے ہیں جو ظاہر ہے اپنے آپ سے بھی استفسار ہے اور معاشرے سے بھی سوال ہے کہ میں کون ہوں۔ اس میں کشور نے اپنے آپ یعنی عورت کو اس انداز میں دیکھا ہے کہ اس میں درد کی ایک کسک

ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ دراصل یہ معاشرتی استبداد کا نوحہ ہے۔ وہ یہ سوال اٹھا کر ایک نئی معاشرتی تشکیل چاہتی ہے۔ جس طرح عورت ہمیشہ اپنا ایک گھر بنانا چاہتی ہے اسی طرح عورت کے اندر مادۂ تعمیر رکھ دیا گیا ہے ظاہر ہے جو تخلیق کر سکتا ہے وہ تعمیر بھی تو کر سکتا ہے۔

آیئے یہ نظم دیکھتے ہیں:

مجھے سزا دو
کہ میں نے اپنے لہو سے تعبیر خواب لکھی
جنوں بریدہ کتاب لکھی
مجھے سزا دو
کہ میں نے تقدیسِ خوابِ فردا میں جاں گزاری
یہ لطفِ شب زادگاں گزاری
مجھے سزا دو
کہ میں نے قاتل کو وصفِ تیغ و علَم سکھایا
سَروں کو اوجِ قلم سکھایا
مجھے سزا دو
کہ میں عدو کی صلیب کی محتسب رہی ہوں
ہوا کی زد پہ جلے چراغوں کی روشنی ہوں
مجھے سزا دو
کہ میں نے دوشیزگی کو سودائے شب گماں سے رہائی دی تھی
گھروں کے بجھتے دیوں کو شانِ خدائی دی تھی
مجھے سزا دو
کہ میں جیوں تو تمہاری دستار گر نہ جائے
مجھے سزا دو
کہ میرے بیٹوں کے ہاتھ اُٹھیں تو تم نہ ہو گے
کہ ایک بھی تیغ حرف قوسِ میاں سے نکلے تو تم نہ ہو گے

مجھے سزا دو
کہ میں تو ہر سانس میں نئی زندگی کی خوگر
حیات و بعدِ حیات بھی زندہ تر رہوں گی
مجھے سزا دو
کہ پھر تمہاری سزا کی میعاد ختم ہو گی
اور اب فہمیدہ ریاض کی نظم ''برف باری کی رُت'' دیکھئے جو ایک نیا بابِ معنی وا کرتی ہے۔

یہیں تو کہیں پر
تمہارے لبوں نے
مرے سرد ہونٹوں سے برفیلے ذرے چُنے تھے
اسی پیڑ کی چھال پر ہاتھ رکھ کر
ہم اک دن کھڑے تھے
یہیں برفباری میں ہم لڑکھڑاتے ہوئے جا رہے تھے
مہک تازہ بوسوں کی سر میں سجائے
ہم آغوشیِ جسم و جاں کے نشے میں
گئی برفباری کی رُت
اور پگھلتی ہوئی برف بھی بہہ گئی سب
یہاں کچھ نہیں اب
کہ ہر شے نئی ہے
ہٹا کر ردا برف کی گھاس لہرا رہی ہے
ہری پتیوں کی گھنی ٹہنیوں میں
ہوا جب چلے تو
گئے موسموں سے گزرتی

ہماری ہنسی گونجتی ہے

بعد میں پروین شاکر کی شاعری نے پوری قوت اور جذبے کے ساتھ معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اُس کے ہاں جذبے کی صداقت کا عروج نظر آتا ہے۔

لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا

پروین اس عہد کی عورتوں کی بہت بڑی ترجمان ہے۔ مردوں کے اس استحصالی معاشرے میں جس کا شکار وہ خود بھی رہی ہے عورت پر ہونے والے جبر کا اسے پوری طرح احساس ہے۔ پر کتر کر اڑان کے مشورے دینے والوں سے وہ بہت پہلے سے واقف ہے۔ اسے خبر ہے عورتیں پرندوں کی طرح سادہ ہوتیں ہیں اور قدم قدم پر دام ہم رنگِ زمیں ہے۔ وہ عورت کو آنکھ دینا چاہتی ہے۔ اسے خبردار کرنا چاہتی ہے کہ وہ دنیا کی بہت بڑی طاقت ہے وہ عورت کو اس کا عورت پن لوٹانا چاہتی ہے۔ جس سے وہ بڑی سے بڑی طاقت کو تسخیر کر سکتی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر خواتین کے عالمی سال کے حوالے سے لکھی گئی پروین کی ایک نظم ''ناٹک'' ملاحظہ کیجئے۔

رُت بدلی تو بھنوروں نے تتلی سے کہا
آج سے تم آزاد ہو
پروازوں کی ساری سمتیں تمہارے نام ہوئیں
جاؤ
جنگل کی مغرور ہوا کے ساتھ اڑو
بادل کے ہم راہ ستارے چھو آؤ
خوشبو کے بازو تھامو اور رقص کرو
رقص کرو
کہ اس موسم کے سورج کی کرنوں کا تاج تمہارے سر ہے
لہراؤ
کہ ان راتوں کا چاند تمہاری پیشانی پر اپنے ہاتھ سے دعا لکھے گا

گاؤ
ان لمحوں کی ہوائیں تم کو، تمہارے گیتوں پر سنگت دیں گی
پتے کڑے بجائیں گے
اور پھولوں کے ہاتھوں میں دف ہوگا!
تتلی، معصومانہ حیرت سے سرشار
سیہ شاخوں کے حلقے سے نکلی
صدیوں کے جکڑے ہوئے ریشم پر پھیلائے ___ اور اڑنے لگی
کھلی فضا کا ذائقہ چکھا
نرم ہوا گیت سنا
ان دیکھے کہساروں کی قامت ناپی
روشنیوں کا لمس پیا
خوشبو کے ہر رنگ کو چھو کر دیکھا
لیکن رنگ، ہوا اور خوشبو کا وجدان ادھورا تھا
کہ رقص کا موسم ٹھہر گیا
رُت بدلی
اور سورج کی کرنوں کا تاج پگھلنے لگا
چاند کے ہاتھ، دعا کے حرف ہی بھول گئے
ہوا کے لب برفیلے سموں میں نیلے پڑ کر اپنی صدائیں کھو بیٹھے
پتوں کی بانہوں کے سُر بے رنگ ہوئے
اور تنہا رہ گئے پھول کے ہاتھ
برف کی لہر کے ہاتھوں، تتلی کو لوٹ آنے کا پیغام گیا
بھنورے شبنم کی زنجیریں لے کر دوڑے
اور بے چین پروں میں ان چکھی پروازوں کی آشفتہ پیاس جلا دی
اپنے کالے ناخنوں سے

تتلی کے پر نوچ کے بولے ___
احمق لڑکی
گھر واپس آ جاؤ
ناٹک ختم ہوا!

یہاں ہم شبنم شکیل کی نظم ''عدلِ دیریاب'' کا حوالہ دے سکتے ہیں جس میں عورت اپنا کوئی تشخص نہ ہونے پر زندگی کی بے معنویت پر خون کے آنسو روتی ہوئی نظر آتی ہے۔

آیئے یہ نظم دیکھتے ہیں۔

میری تار تار محبتیں
میری دل فگار محبتیں
میری بے وقار محبتیں
میری بار بار محبتیں
سبھی مستعار محبتیں
جو اُجڑ سکیں نہ پنپ سکیں
سرِ شاخِ دل نہ سجا کبھی
کوئی لمحہ کھلتے گلاب سا
سرِ بابِ جاں نہ رقم ہوا
کوئی سانحہ کوئی المیہ
مری بے یقین محبتیں
کہ عطا ہوا انہیں دہر میں
نہ شرف ہی شہرتِ عام کا
نہ سند ہی کوئی دوام کی
نہ وصال میں کوئی سرخوشی
نہ تو شدّتِ غمِ ہجر ہی
جو گریزاں ان سے صعوبتیں

سبھی راحتیں بھی تھیں اجنبی

نہ رقابتوں میں خلوص تھا

نہ تھیں اُستوار رفاقتیں

کسی قید میں کسی جبر میں

رہیں کور چشم بصارتیں

سو کتابِ جاں کی عبارتیں

نہ سیہ ہوئیں نہ سفید ہی

وہی ایک رنگ تھا سرمئی

وہ جو پیرہن کا ہے شام کے

یونہی عمر ساری گزر گئی

کسی سرکشیدہ سوال میں

کسی خواب کے سے خیال میں

کسی خوف جیسے ملال میں

اِک عجب سی صورتِ حال میں

میری بدنصیب محبتو

میری ایک بات یہ جان لو

کبھی معتبر بھی جو ہو گئیں

اسی زندگی ہی میں تم اگر

تو یہ دیریاب خوشی مجھے

نئے دکھ سے کر دے گی آشنا

میں کہاں سے ڈھونڈ کے لاؤں گی

وہ خوشی برتنے کا ذوق وشوق

جسے وقت لے کے بھی جا چکا

تو گویا شبنم شکیل کے پیشِ نظر وہ معاشرتی تشکیل بھی تھی جو عورت کے ہاتھوں

تصویر ہو رہی تھی اور عورت کی شاعری کے اثرات مکمل طور پر پورے معاشرے پر مرتب ہو رہے تھے۔

یہاں ایک اہم نام پروین فنا سید کا بھی ہے جنہوں نے عورت کے مسائل کی عکاسی کے حوالے سے کھل کر تو بات نہیں کی مگر پردے کے اندر جو شاعری کی ہے اس میں، عورت بولتی نظر آتی ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں ایک حجاب کے اندر رہتے ہوئے بھی اظہار کا جو پیرائیہ بناتی ہیں اس میں عورت کی نفسیات واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے۔

''تمنا کا دوسرا قدم'' اور ''یقین'' کے نام سے دو شعری مجموعوں کی خالق یہ شاعرہ اگر چہ ادا جعفری اور زہرا نگاہ کے گروپ کی نمائندگی کرتی ہیں مگر پروین فنا سید جذبوں کے اظہار میں ان جیسی وسعتِ نظر تو نہیں رکھتیں لیکن وہ جذبوں کی شدت اور گہرائی کا ادراک ضرور رکھتی ہیں۔ ان کی ایک نظم ''حرفِ وفا'' دیکھئے جو جذبوں کی شدت سے لبریز نظر آتی ہے۔

جب یہ چھوٹا سا اک بول زباں پر آتا ہے
میں ڈر جاتی ہوں
اور تمہیں اصرار کہ میں یہ حرفِ وفا دہراتی جاؤں
روزِ ابد تک کہتی جاؤں گاتی جاؤں
لیکن میں ڈر جاتی ہوں خود اپنے آپ سے
اپنے دل کی سچائی سے
جب یہ بول زباں تک آ جاتا ہے
یوں لگتا ہے جیسے مرا احساسِ وفا اور میرے دل کی پہنائی
میرے مہذب جذبوں کی گہرائی
میری نظر کی وسعت میرے لفظوں کی رعنائی
درد و کرب کے رشتوں کی آگاہی
سب مل کر اس اک چھوٹے سے بول میں گھل جاتے ہیں
پھر یہ بول دکھوں کی بھٹی میں تپتا ہے
تپ تپ کر کندن ہوتا ہے

تب کہیں جا کر جب ہونٹوں تک آتا ہے میں ڈر جاتی ہوں

یہ سوچوں تو ڈر جاتی ہوں

کہیں اگر تم اس جذبے کی گہرائی تک نہ پہنچ پائے

کہیں اگر تم رول نہ لائے وہ موتی جو اس چھوٹے سے

بول کی تہہ میں پوشیدہ ہیں

تو کیا میں پھر جی بھی سکوں گی

جی چاہا تو مر بھی سکوں گی

ان کی غزلوں میں بھی جذبوں اور قدروں کی شکست و ریخت کی کم و بیش یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ان کی دو غزلوں میں سے کچھ اشعار پیش ہیں:

دشت میری ہی دہائی دے گا
پھر مجھے آبلہ پائی دے گا
روشنی روح تلک آ پہنچی
اب اندھیرے میں دکھائی دے گا
توڑ کر دیکھا تو آئینۂ دل
شہر کا شہر دکھائی دے گا
کشف و آگاہی کے آئنے میں
اپنا بہروپ دکھائی دے گا

کم نگاہی بھی روا تھی شاید
آنکھ پابندِ حیا تھی شاید
سر سے آنچل تو نہ ڈھلکا تھا کبھی
ہاں بہت تیز ہوا تھی شاید
ایک بستی کے تھے راہی دونوں
رہ میں دیوارِ انا تھی شاید

انہی شاعرات میں شاہدہ حسن کا نام بھی بہت اہم ہے۔ غزل اور نظم کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کے ہاں بھی نسائی لہجہ بھرپور توانائی کے ساتھ سامنے آتا ہے۔
شاہدہ حسن کی ایک غزل کے چند شعر

سروں پر سائباں رکھ کر چلی جاؤں گی اک دن
یہیں اک آسماں رکھ کر چلی جاؤں گی اک دن

زمانے تجھ کو میری لب کشائی سے گلہ تھا
خموشی کا سماں رکھ کر چلی جاؤں گی اک دن
خدا جانے اگر جانا پڑا عجلت میں مجھ کو
کوئی بھی شے کہاں رکھ کر چلی جاؤں گی اک دن

پلٹتی جا رہی ہوں زندگی اوراق تیرے
کہیں ہر اک نشاں رکھ کر چلی جاؤں گی اک دن

مرے بچے، مرے ہاتھوں کے ڈھالے چند کوزے
انہی کوزوں میں جاں رکھ کر چلی جاؤں گی اک دن

جو لکھنا چاہتی ہوں کاش اب وہ لکھ بھی لوں میں
قلم پھر ناگہاں رکھ کر چلی جاؤں گی اک دن

فاطمہ حسن بھی اس عہد کی شاعرات میں ایک نمایاں نام ہے۔ اب تک ان کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کی ایک نظم دیکھئے "زخمی انگلیوں سے ایک نظم"

وہ لڑکی کسی اور بستی کی
رہنے والی تھی جو پتھر پہ
پھول اُگانے کی خواہش میں

انگلیاں زخمی کر بیٹھی
سنا ہے اس کی بستی میں
پھول اور محبت جیون کا لازمی حصہ تھے
وہاں لفظوں میں پھول کھلتے تھے
اور آنکھوں سے محبت کی کرنیں
پھوٹتی تھیں
جو کوئی اس بستی میں آتا
چند اچھے لفظوں کے بدلے
ڈھیروں محبت لے جاتا
ایک دن اُس بستی میں ایک جادوگر آیا
اور اس نے ایسا منتر پھونکا کہ ساری بستی پتھر ہو گئی
لڑکی جو کہیں باہر گئی ہوئی تھی واپس لوٹی تو
اس کی دنیا بدل چکی تھی
اس دن سے وہ لڑکی
جہاں کہیں بھی پتھر دیکھتی ہے
انہیں پھول بنانے کی کوشش میں
زخمی ہو جاتی ہے!

نظم کے حوالے سے عشرت آفریں ایک ممتاز نام ہے۔ انہوں نے اپنی پہلی نظم ہی سے شناخت بنالی تھی۔ یہاں ان کی ایک طویل نظم ''جہاں زاد'' کا آخری حصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

اے حسن!
چاک پر سے ذرا اپنی نظریں اٹھا
تو مرے نو برس تک بنائے گئے پھول تو دیکھ لے
پھول تازہ شگفتہ اور آزردہ ہیں

یوں نہ ہو کہ انہیں
بھوک اور مفلسی کے ستائے ہوئے
میرے بچے بھی نیلام کر آئیں جا کر کہیں
تیرے کوزوں کی مانند بازار میں
اے حسن!
دامنِ وقت پر جتنے گل اور بوٹے کھلے ہیں
جہاں زاد کی زخم پوروں نے رنگ ان میں
اپنے جنوں کے بھرے ہیں
یہ تاوان ہیں چمپئی انگلیوں کا
ترے جام و مینا پہ
جس خال و خد کی نزاکت کی پرچھائیاں تھیں
تجھے کیا خبر یہ کن آنکھوں کی بینائیاں تھیں
اے حسن!
یہ محبت
کہ جس کو
تری سوختہ بخت گردانتی ہے
"امیروں کی بازی"
تو میرے تئیں یہ امیروں کی بازی کہاں
صرف بازی گری ہے
محبت ہمیشہ سے مفلس کا سرمایۂ جاں رہی ہے
یہی تو وہ پونجی ہے جس تک
امیروں کے ہاتھ اب بھی پہنچے نہیں ہیں
تجھے یہ گماں تھا
کہ عورت محبت کی بازی میں

بے جان پتے کی صورت
کسی دستِ چابک کی مرہونِ منت
وہ اس کھیل میں ایک مہرے کی صورت
کہ جب جس نے چاہا
اسے ایک گھر سے اٹھا کر
کسی دوسرے گھر کا مالک بنایا
کہ عورت فقط ایک پتھر کی مورت
یہ تصویرِ حیرت
یونہی چپ کھڑی ہے
یونہی چپ رہے گی
مگر یوں نہیں ہے
حسن! تو نے دیکھا
کہ میں قیدِ اوہام و بندِ روایات میں
بوڑھے عطار یوسف کی دکان پر
اپنی آنکھیں تجھے نذر کرتی رہی
بوڑھا عطار وہ کیمیا گر کہ جس نے
زمانوں کے جنگل سے چہروں کے پھول اور بوٹے چنے
وہ مجھے اور تجھے جانتا تھا مگر
میں نے بازار میں
تجھ سے آنکھوں کا اور دل کا سودا کیا
اے حسن!
میرے ایک اک دریچے پہ
کہنہ روایات و ظالم عقائد کا جنگل اُگا تھا
حسن! کاش تو

میری آنکھوں سے میرے دریچے کو تکتا
تو تُو جان سکتا جہاں تُو کھڑا تھا
وہاں ایک اک درز سے
میری آنکھوں، مرا جسم
چھن چھن کے کٹ کٹ کے
گرتا رہا تھا!
عشرت آفرین کی ایک غزل بھی دیکھیے۔

لڑکیاں ماؤں جیسے مقدر کیوں رکھتی ہیں
تن، صحرا اور آنکھ سمندر کیوں رکھتی ہیں

عورتیں اپنے دُکھ کی وارث کس کو دیں گی
صندوقوں میں بند یہ زیور کیوں رکھتی ہیں

وہ جو آپ ہی پوجی جانے کے لائق تھیں
چمپا سی پوروں میں پتھر کیوں رکھتی ہیں

وہ جو رہی ہیں خالی پیٹ اور ننگے پاؤں
بچا بچا کر سر کی چادر کیوں رکھتی ہیں

بند حویلی میں جو سانحے ہو جاتے ہیں
ان کی خبر دیواریں اکثر کیوں رکھتی ہیں
صبحِ وصال کی کرنیں ہم سے پوچھ رہی ہیں
راتیں اپنے ہاتھ میں خنجر کیوں رکھتی ہیں

منصورہ احمد کی نظموں میں درد کی جو ہلکی ہلکی کسک ہے وہ تا دیر قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ اس تاریخی تمثال نگاری میں بھی اس کا لہجہ نیا اور توانا رہا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اس نے خاروں بھرا یہ راستہ کیسے چنا ہے۔ اور اس میں وہ سرخرو بھی ہوئی ہے۔ غزل میں اس نے روایت سے رشتہ جوڑا ہے اور نظم میں عصری آگہی کے ساتھ نئے رنگوں کی آمیزش سے ایک نیا کینوس دیا ہے۔ کہیں کہیں اس کا دکھ پڑھنے والے کا دکھ بن گیا ہے اور کہیں وہ اپنی ذات کے انکشاف میں لفظوں کی اوٹ میں چلی گئی ہے۔ طلوع کی شاعری دراصل ہے ہی انکشافِ ذات کی شاعری۔ اس شعری عمل میں اس نے جو علامتیں وضع کی ہیں وہ مکمل ابلاغ رکھتی ہیں اور زندگی کے بہت ہی قریب ہیں۔ جذبوں کے اظہار میں بھی اس نے سیدھا اور سچا انداز اپنایا ہے۔ تہذیبوں اور رویوں کا اظہار کرتے وقت بھی اس نے زندہ اور غیر مبہم علامتوں کا سہارا لیا ہے۔ یہ اپنے عصر کی ایسی شاعرہ ہے جس کی شاعری میں خود اس کا اپنا لہجہ بولتا نظر آتا ہے۔ اُس کی ایک نظم ''موسم بدلنے تک'' دیکھتے ہیں۔

ابھی موسم بدلنے میں بہت دن ہیں
ابھی تو جانے والے موسموں کے درد باقی ہیں
ابھی پیڑوں کی شاخوں میں
بہت سے ڈار سے بچھڑے ہوئے زخمی پرندے
سانس لیتے ہیں
ابھی تو پیلے پتوں میں
گئی پت جھڑ کی اک سسکی چھپی ہے
پتاور کے تلے پھیلی زمیں میں
پرانے زلزلوں کی کپکپی ہے
فضا میں گرد کی میلی سی اک چادر تنی ہے
نئی بارش برسنے تک
ہمیں تو گرد میں ہی گرد ہونا ہے
مگر اک مسئلہ ہے

تمہاری دی ہوئی صد رنگ کلیوں کے تحفظ کا
انہیں تو پھول بننا ہے
مگر ساری جڑیں تخلیق کی قوت سے عاری کوکھ جیسی ہیں
فضا کی کہنگی میں موت کی آہٹ رچی ہے
مگر ہم کو تو جینا ہے
نمو کی قوتوں کے ساتھ جینا ہے
سو تم ایسا کرو، موسم بدلنے تک
یہ سب کلیاں کسی محفوظ گوشے میں چھپا دو
ذرا بارش برسنے دو
زمیں بادل سے ملنے دو
درختوں سے خزاں کی گرد دُھلنے دو
میں ساری کونپلیں تازہ زمینوں میں اُگاؤں گی
میں کل اپنی نئی گڑیا جلاؤں گی!

دھیمے لہجے کی شاعرہ یاسمین حمید سادہ سے انداز میں اپنے شعروں میں معنی کی بہت سی پرتیں رکھ دیتی ہے۔ اس کا احساس شیشے کی طرح ہے۔ صاف شفاف اور اپنے اندر ایک معصومیت لیے ہوئے۔ ''پسِ آئینہ'' پیش آئینہ بھی ہے جس میں مناظر کے ساتھ زمانے بھی منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اپنی شاعری میں یہ شاعرہ عرفانِ ذات چاہتی ہے۔ وہ باطن کی دنیا آشکار کرنا چاہتی ہے۔ باطن کی طرف سفر کرتے ہوئے بھی وہ ہر مقام سے یوں ہی بے نیازانہ نہیں گزر جاتی ہے۔ اُس کی ایک نظم ''کتبہ کون لکھے گا'' پیش ہے۔

ابھی پہلا ستارہ ڈھونڈتے ہو تم
ابھی تو روشنی آنکھوں تلک پہنچی نہیں ہے
جب شکست و ریخت کی منزل سے آگے
سینکڑوں نوری برس تسخیر ہو جائیں گے

تب تم آسماں کی آخری حد پر
زمیں زادوں کی باتیں سن رہے ہو گے
خلا اندر خلا سیارہ گاہیں اپنی کم آباد دنیا کو پکاریں گی
زمیں بھی آشنا دستک پہ چونکے گی
مگر پھر کون بولے گا
گلستاں، رنگ، خوشبو
چہچہاتے پیڑ اور چنگھاڑتے جنگل
اکیلے کیا کریں گے
شہروں شہروں گھومتے دن رات
کس کو تھپکیاں دے کر سلائیں گے جگائیں گے
کسی ویران قریے میں
الاؤ سینکتے ہاتھوں کی بے مصرف لکیریں
اپنے ہونے کا گلہ کس سے کریں گی
پتھروں کی، برف کی جانب پلٹتی زندگی کو
کون پرسا دینے آئے گا
خلا اندر خلا گنجان سیاروں کے سارے خواب
ہجر و وصل کی لذت کے افسانوں پر ہنستے خواب
اپنی آخری گردش مکمل کر کے
بے تعبیر رہ جائیں گے تو اس سانحے پر
کون روئے گا
زمیں زادوں کا کتبہ کون لکھے گا!

''امانت'' سے ''مسافت'' اور پھر ''پانی پہ قدم'' تک آتے آتے شاہین مفتی نے ایک ریگ زار عبور کیا ہے۔ زندگی کے ان ناہموار راستوں کو دیکھا ہے جو خوابوں اور سرابوں سے باہر حقیقت کی منظر نگاری کرتے ہیں۔ اس راستے میں اس کے ''پانی پہ قدم'' بھی

پڑے ہیں۔اس تجربے کا اظہار انہوں نے غزل کی صورت میں کیا ہے۔اس طرح نظم سے شاعری کا آغاز کرنے والی یہ شاعرہ اب غزل میں بھی اپنا آپ منوانا چاہتی ہے۔اپنی ایک نظم ''آدھی لڑکی'' میں کہتی ہے۔

میرے دھیان میں
رہنے والے
چھوڑ یہ پاگل پن کی باتیں
میں تو آدھی لڑکی ہوں
آدھی آگے' آدھی پیچھے
آدھی اوپر' آدھی نیچے
آدھی اندر' آدھی باہر
آدھی موم اور آدھا پتھر
آدھی جنگل' آدھا صحرا
آدھی پیاس اور آدھا دریا
آدھی چھت اور آدھا آنگن
آدھی موت اور آدھا جیون
آدھی آنکھ اور آدھا سپنا
سوچ ذرا
کوئی آدھی چادر اوڑھ کے بھی
سو سکتا ہے؟

ثمینہ راجہ کے اب تک آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں' یہاں ان کی ایک نظم ''کافی کی پیالی میں گھلتی شام'' دیکھئے:

مجھے سورج کی شعاعوں میں گندھی ایک دُعا چاہیے
اور بادل کا ملبوس پہنے ایک وعدہ اور صبا جیسی کوئی بات
زندگی گزارنے کے لیے ویسے تو ڈبل بیڈ بھی ضروری ہے صوفہ سیٹ بھی

ریفریجریٹر اور رنگین ٹیلی وژن بھی
لیکن مجھے ایک سرگوشی بھی چاہیے
بھید بھری
جو اندھیری راتوں میں میرا دیا بن جائے
تپتی دوپہر میں سائبان
جب غمزدہ ہوں تو میری دوست بنے
اور ہونٹوں پر ہنسی کی کرن بن کر جگمگائے
باتوں کا کیا ہے
دنیا میں ہر طرف ان گنت لوگ ہر وقت باتوں میں مصروف ہیں
اخبارات، ریڈیو، ٹیلی وژن
باتیں باتیں باتیں
اونچی آوازیں اور شور
بلند بانگ دعوے، تقریریں، بیانات
میں ان سے کس قدر تنگ آ چکی ہوں
کافی کی پیالی میں شام دھیرے دھیرے اترتی ہے
اور گھلنے لگتی ہے
تم میری طرف دیکھتے ہو
دیکھتے رہتے ہو
خاموش
میں اس خاموشی میں لپٹی جاتی ہوں
ہاں اب مجھے ایک سرگوشی چاہیے!

اس دور کی شاعرات میں ایک اہم نام ناہید قاسمی کا ہے ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''مرزا صاحباں'' کا آخری بند ملاحظہ کیجیے:

اے میری مسافر صاحباں

اس طرح نہ اشک بہا
میرے کانٹا کانٹا جسم سے
دامن کو بچالے جا
یوں مڑ مڑ کے کیا دیکھنا
جب جانا ٹھہر گیا
اسے پار کنارے کام کیا
جو دریا تیر گیا
تو آگے بڑھی تو اوڑھنی
کیوں پیچھے کو لپکے
کیا آنکھ میں تنکا پڑ گیا
تو پلکیں کیوں جھپکے
یہ آنکھیں گہری جھیل سی
کیوں خالی خالی لگیں
ترے لب جو اتنے امیر تھے
کیوں آج سوالی لگیں
اے میری مسافر صاحباں
جا' والی ترا خدا
سورج میں بلا کی آگ ہے
ذرا دھوپ سے بچتی جا
جو سایہ ہے مجھ پر پیڑ کا
تجھ تک کیسے پہنچاؤں
یہ سوچتے سوچتے تھک گیا
اب کیوں نہ ذرا سو جاؤں

اب نثری نظم کے حوالے سے کچھ شاعرات کی شاعری کا جائزہ پیش کرتے ہیں

جن میں نسرین انجم بھٹی ایک ممتاز نام ہے۔ اُس نے اپنی شاعری میں مرد کے بنائے ہوئے استحصالی معاشرے پر متنوع اسالیب میں بیزاری کا ظہار کیا ہے اوراس ضمن میں نرمی سے لے کر تلخی تک ہر لہجہ آزمایا ہے۔ نسرین انجم بھٹی اپنی نظم ''ہم وہ نہیں ہیں'' (مطبوعہ ''ماہِ نو'' لاہور اکتوبر ۲۰۰۳ء) میں کہتی ہے۔

مت میرے ہاتھ چاٹ اور مت میری آنکھیں طلب کر!
اے مرد کی بے بنیاد ذات! جو دمدار ستارے کی طرح
صدیوں کا سفر کر کے میری آنکھ میں اترا نہیں ہے
تو تو آنگن اُگے سایوں کو دوچند بنانے میں شریک
میرے اطراف بھگانے میں مگن
میں ایک بے نتیجہ محبت میں نہیں، نہ تیری ہوں

نثری نظم کے حوالے سے سارہ شگفتہ بھی خواتین شعرا میں ایک اہم نام ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں خواتین کی خواہشات اور امنگوں کی ترجمانی ایک منفرد پیرائے میں کی ہے جس میں لہجہ بے باک اور اندازِ بیان قدرے براہِ راست ہے۔ ان کی ایک نظم دیکھئے ''شیلی بیٹی کے نام''

تجھے جب بھی کوئی دکھ دے
اس دکھ کا نام بیٹی رکھنا
جب میرے سفید بال
تیرے گالوں پر آن ہنسیں، رو لینا
میرے خواب کے دکھ پہ سو لینا
جن کھیتوں کو ابھی اُگنا ہے
ان کھیتوں میں
میں دیکھتی ہوں تیری انگیا بھی
بس پہلی بار ڈری بیٹی
میں کتنی بار ڈری بیٹی

ابھی پیڑوں میں چھپے تیر کمان ہیں بیٹی

میرا جنم تو ہے بیٹی

اور تیرا جنم تیری بیٹی

تجھے نہلانے کی خواہش میں

میری پوریں خون کھولتی ہیں

خاندان، رسم ورواج، روایت، ناک، عزت کے نام پر کتنی جوانیاں خاک میں ملا دی گئیں۔ اس کا اندازہ شاید ان اعداد وشمار سے بھی نہ ہو سکے جو وقتاً فوقتاً اخبارات میں آئے دن طبع ہوتے رہتے ہیں۔ اسی رویے پر سارا شگفتہ احتجاج کرتی ہے نظم ''عورت اور نمک'' میں اُس کا لہجہ کچھ اس طرح ہے۔

عزت کی بہت سی قسمیں ہیں

گھونگھٹ، مقبرہ، گندم

عزت کے تابوت میں قید کی میخیں ٹھونکی گئی ہیں

گھر سے لے کر فٹ پاتھ تک ہمارا نہیں

عزت ہمارے گزارے کی بات ہے

عزت کے نیزے سے ہمیں داغا جاتا ہے

عزت کی کنی ہماری زبان سے شروع ہوتی ہے

کوئی رات ہمارا نمک چکھ لے

تو ایک زندگی ہمیں بے ذائقہ روٹی کہا جاتا ہے (آنکھیں)

بے جا رسومات اور مذہب کی غلط تاویلوں اور محض اپنے ذاتی فائدے کے لیے مرد نے جسمانی اور ذہنی تشدد کے کیسے کیسے راستے تلاش کیے ہیں۔ ہماری شاعرات نے کئی دفعہ تو اس جبر کے خلاف جو آواز اٹھائی ہے وہ ایک چیخ معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں عطیہ داؤد کہ جو ایک سندھی شاعرہ ہیں قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ یہ تمام تر تحقیق اردو شاعرات کے حوالے سے ہے لیکن عطیہ داؤد کی کچھ نظمیں یہاں پیش کی جا رہی ہیں جنہیں فہمیدہ ریاض نے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ وہ اردو ہی میں لکھی گئی نظمیں

معلوم ہوتی ہیں۔ عطیہ داؤد کی ان نظموں میں سندھ کے جاگیردارانہ نظام اور وہاں کے دیہات میں جہالت کی بنا پر عورت پر جو ظلم و ستم روا رکھا جاتا ہے ان کو بڑی جرأت سے بیان کیا گیا ہے۔ بعض نظموں کو پڑھتے ہوئے قاری کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ چنانچہ ضروری سمجھا گیا کہ ان کی کچھ نمائندہ نظموں کو اس تحقیق میں شامل کیا جائے۔

اپنی بیٹی کے نام

اگر تمہیں "کاری" کہہ کر قتل کردیں
مرجانا، پیار ضرور کرنا
شرافت کے شوکیس میں
نقاب ڈال کر مت بیٹھنا، پیار ضرور کرنا
پیاسی خواہشوں کے ریگزار میں
ببول بن کر مت رہنا، پیار ضرور کرنا
اگر کسی کی یاد ہولے ہولے
تمہارے دل میں آتی ہے،
تو مسکرا دینا، پیار ضرور کرنا،
وہ کیا کریں گے؟ بس سنگسار ہی تو کریں گے تم کو
تم اپنے جیون پل کا لطف اٹھانا، پیار ضرور کرنا
تمہارے پیار کو گناہ بھی کہا جائے گا
تو کیا ہوا!!!............ سہہ جانا
پیار ضرور کرنا
پیار کی سرحدیں

پیار تو مجھ سے بے شک کرتے ہو،

روٹی کپڑا اور مکان دینے کا وعدہ کیا ہے
اس کے بدلے میرا جیون گروی رکھ لیا ہے
گھر کی بہشت میں مجھے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے
بس اُسی طرف جانے کی ممانعت ہے
جہاں شعور کے درخت میں
سوچ کا پھل لگتا ہے
روز ابھرتا سورج مجھے
قدم بڑھانے پر اکساتا ہے
آج یہ پھل کھایا ہے تو آپے سے باہر ہو گئی ہوں،
سوچ نے کھول ڈالیں ساری کھڑکیاں ذہن کی
تمہاری بہشت میں میرا دم گھٹنے لگا ہے
میں فیصلے کرنے کی آزادی چاہتی ہوں
سوچ کے میوے نے اتنی طاقت دے دی،

اُڑان سے پہلے

ماں، رسموں رواجوں کے دھاگوں سے بُنی
تار تار اوڑھنی مجھ سے واپس لے لے
تم ہی ان میں پیوند لگاتے لگاتے ہار چکی ہو
تو مجھ کو کیونکر پیش کرو گی؟
ماں، دروازے کی یہ کنڈی
اندر سے بند کرنے کا
تمہیں حکم دیا گیا ہے، کھول دے
ورنہ میرا قد اتنا اونچا ہو گیا ہے

میں اب اس تک خود پہنچ سکتی ہوں
ماں، مجھے معاف کر دینا
میں تجھے چھوڑ کر جا رہی ہوں،
کیونکہ میں اپنی بیٹی کو تاریکی میں
ٹھوکریں کھاتے نہیں دیکھ سکوں گی
ماں، میں کتیا تو نہیں جو ایک نوالے کی خاطر
باپ بھائی، سسر، شوہر اور بیٹے کا منہ تکتی رہوں
لوٹتی رہوں ان کے قدموں میں
ماں، یہ نوالہ مجھے پیش نہ کر
جو تجھ کو بھی خیرات میں ملا ہے
ابا کی وراثت کی چوتھائی
اور شوہر کے حق مہر کے احسان کا

بھروسے کا قتل

مذہب کی تلوار بنا کر
خواہشوں کے اندھے گھوڑے پر سوار
میرے من آنگن کو روند ڈالا
میرے بھروسے کو سولی پر ٹانگ کر
تم نے دوسرا بیاہ رچالیا
تمہارے سنگ گزارے پل پل کو
میں نے اپنے ماس پر کھال کی طرح منڈھ لیا تھا
تمہارے ساتھ آنچل باندھ کر
بابا کا آنگن پار کر کے

تمہارے لائے سانچے میں
میں نے پایا تھا اپنا وجود
پیار کیا ہے، یہ نہیں جانتی
پر تمہارے گھر نے بڑ کے پیڑ سی چھاؤں کی تھی مجھ پر
بچایا تھا، زمانے کے گناہوں کے
تیروں کی بوچھاڑ سے
اس سانچے میں رہنے کی خاطر
میں اپنے وجود کو کاٹتی چھانٹتی تراشتی رہی
تمہارے لہو کی بوند کو اپنے ماس میں جنم دیا
اولاد بھی ہم دونوں کا بندھن نہ بن سکی
بندھن کیا ہے، یہ نہیں جانتی
مجھے فقط ایک سبق پڑھایا گیا تھا
تمہارا گھر میری آخری پناہ گاہ ہے
میں نے کئی بار دیکھا ہے
زمانے کی نگاہوں سے سنگسار ہوتے
طلاق یافتہ عورت کو
اس لیے
بارش سے ڈری بلی کی طرح،
گھر کے ایک کونے اور تمہارے نام کے استعمال پر
قناعت کیے بیٹھی رہی
جنت کیا ہے، جہنم کیا ہے، یہ نہیں جانتی
مگر اتنا یقین ہے،
جنت بھروسے سے بالاتر نہیں
اور جہنم سوت کے قہقہوں سے بڑھ کر گراں نہیں

طعنوں اور رحم بھری نظروں سے بڑھ کر مشکل
کوئی پل صراط نہیں
کبھی کبھی سوت کا چہرہ مجھے اپنا جیسا لگتا ہے
اس کی پیشانی پر بھی
میں نے بے اعتباری کی شکنیں دیکھی ہیں
جب وہ مجھے دیکھتی ہے
خوشی اس کے سینے میں
ہاتھوں میں دبائے کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا اٹھتی ہے
میں ان سے لڑ نہیں سکتی
ان میں تم شامل ہو
میں تم سے لڑ نہیں سکتی
مذہب قانون اور سماج تمہارے ساتھ ہیں
رِیتیں رسمیں تمہارے ہتھیار ہیں
دل چاہتا ہے کہ زندگی کی کتاب سے
وہ باب ہی پھاڑ کر پھینک دوں
جو اپنے مفاد میں تم نے
میرے مقدر میں لکھا ہے

کاش سمجھدار نہ بنوں!

(کاش سمجھدار نہ بنوں، سمجھدار عورتیں دکھ اٹھاتی ہیں۔ بھٹائی)

تجربہ کار ذہن تو سب سمجھ جاتا ہے،
ذہن میں سوچوں کو بند کر کے
تالا ڈال دوں

چالاک آنکھیں تو سب کچھ تاڑ لیتی ہیں
ان پر لاعلمی کے شیشے چڑھا دوں'
اپنے حساس دل کو
ذرا خاطر میں نہ لاؤں
ماضی کا تمام مشاہدہ اور تجربہ
جو درج ہے ذہن پر
اسے مٹا ڈالوں
میری عقل میرے لیے عذاب بن گئی ہے
کاش! سمجھدار نہ بنوں

سسکی اور قہقہہ

میں اپنے پاؤں تلے سے جنت نکال کر
بڑی خوشی سے تمہیں سونپنے کے لیے تیار ہوں
میں اپنے پاؤں میں بندھی گرہستی کی بیڑیوں کو
بس تھوڑا سا ڈھیلا کر رہی ہوں
زیادہ دور نہیں جاؤں گی
ایک قہقہہ لگا کر' ایک سسکی بھر کر
یا ایک نظم لکھ کر لوٹ آؤں گی
میں آزاد عورت ہوں لیکن
اگر میرے بچوں کے بالوں میں لیکھیں پڑ جائیں
ان کی گردن پر پسینہ ملی مٹی نظر آئے
میرے کھانوں میں مصالحوں کی ترتیب گڑبڑ ہو جائے
بچوں کے ہوم ورک کی کاپی پر
"Not Done" لکھا ہوا آ جائے

گھر آئے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے
ایک کپ چائے بھی نہ پلا سکوں
آفس سے لوٹتے ہوئے تھکے ہوئے شوہر سے
حال احوال بھی نہ پوچھوں
تو میری سانسیں گھٹی ہوئی
اور قہقہہ پھٹی پھٹی آنکھیں
اور نظم ادھورا خواب لگتی ہے
خدا نے نبوت عطا کرتے ہوئے امام بناتے ہوئے
پوری قلندری عطا کرتے ہوئے
مجھ پر اعتبار نہیں کیا تھا
پوری قوم کو اعلیٰ نسل دینے کی ذمہ داری
فقط میری ہے؟
اس اعلیٰ منصب پر کام کرتے کرتے
میں تھک بھی تو سکتی ہوں
میری اتفاقی رخصت منظور ہو چکی ہے
میں جا رہی ہوں ایک سسکی بھرنے، ایک قہقہہ لگانے
اور ایک نظم لکھنے کے لیے
چھٹی اخلاقی طور پر منظور ہونے کے باوجود
گھر کی ہر چیز کو مجھ سے شکایت
کیوں ہے؟
بچوں کے چہرے پر غصہ دیکھ کر سوچتی ہوں
قہقہہ عیاشی اور سسکی یاآس ہے
اور نظم پاؤں میں چبھا ہوا کانچ کا ٹکڑا ہے
میری ماں کہتی ہے

''تم مجھ سے اچھی ماں نہیں ہو''
تم عجب ہو' گھر' شوہر اور بچوں کے علاوہ
اور بھی کچھ چاہتی ہو؟''
میری بیٹی میرے ہاتھ سے قلم چھین کر
کہتی ہے فرنچ فرائی بنا کر دو
میں سوچتی ہوں
میری بیٹی کو بھی جب
ایک قہقہے نظم یا تصویر کے لیے
اپنی زندگی کی تجوری سے
کچھ پل درکار ہوں گے
تو میں اسے کیا مشورہ دوں گی؟
قہقہہ' بچپن کی بچھڑی ہوئی سکھی
سسکی' ہاتھوں سے اڑتا ہوا پنچھی
اور نظم' گناہ ہے!

عذرا عباس نثری نظم کی ایک منفرد شاعرہ ہیں اور مختلف اسلوب رکھتی ہیں۔ ان کے پانچ شعری مجموعے اور ایک مختصر خودنوشت ''میرا بچپن'' شائع ہو چکی ہے۔ ان کے ہاں جذبوں کا بے ساختہ اظہار ہوتا ہے۔ لہجے میں قدرے تلخی نظر آتی ہے اس لیے کہ وہ بات حجابات میں نہیں کرتیں۔ حقیقت کے اظہار میں وہ ایک طرح کی سخت دلی دکھاتی ہیں۔ عورت کے احساسات کے اظہار میں وہ حقیقت پسند ہیں۔ ان کی اس نظم ''سدابہار'' میں بھی کچھ یہی کیفیت نظر آتی ہے۔

سدابہار کچھ بھی نہیں ہے
بس ہیں تو
ہماری مجبوریاں
ان پر بہار رہتی ہے

یہ ہر موسم میں
ہماری زندگی کی کیاریوں میں کھلتی رہتی ہیں
اکثر چاندنی راتوں میں تاکتی ہیں
سفیدے کے پھولوں پر جم کر
بارشوں میں یہ آسمانی بجلی بن کر
ہمارے سروں پر منڈلاتی ہیں
کبھی کبھی یہ جھینگر کی آواز بن کر
ہماری نیندوں میں گھس آتی ہیں
اور ہمیں جاگنے دیتی ہیں
ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے
ہم انہیں اپنے پاؤں سے کچل بھی نہیں سکتے
اور نہ انہیں کیڑے مار دواؤں سے بھگا سکتے ہیں
ہم جانتے ہیں جب ہم نہیں رہیں گے
تو بھی یہ رہیں گی
ہماری مجبوریاں
تب یہ ہمارے ناموں کے ساتھ یاد کی جائیں گی

اب آیئے کچھ شاعرات کے شعر دیکھتے ہیں جن میں مذکورہ بالا تمام کیفیات نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

یہ کس آسیب کا سایہ ہے گھر پر
جسے دیکھو وہی سہما ہوا ہے

مرے ہی شہر کی ہر روشنی سے
مجھے محروم کیوں رکھا گیا ہے
(پروین فنا سید ''یقین'')

یہ لوگ بھی اچھے ہیں مکاں بھی بہت اچھے
بس میں ہی ہوں بیزار ان اچھوں کے نگر سے
(فاطمہ حسن: ''دستک سے درکا فاصلہ'')

تمام شہر نے جو ہاتھ میں اٹھا لی ہے
کدھر چلے گی یہ تلوار دیکھتے ہیں ابھی

آ! ذرا دیکھ کہاں گھر ہے مرا
دھوپ کی قید میں لشکر ہے مرا
(شاہدہ حسن: ''ایک تارا ہے سرہانے میرے'')

دیارِ غیر میں ہم دھوپ کے مسافر تھے
وطن میں لطف پہ مائل کوئی شجر نہ ہوا
یہ عہد عبارت نہیں شمشیر و سناں سے
اربابِ جنوں جرأت گفتار بہت ہے
(عرفانہ عزیز: ''حرفِ شیریں'')

جب سے بارود جلنے لگا شہر میں
جانے کس اوٹ میں جا چھپی چاندنی
(فرحت زاہد: ''لڑکیاں ادھوری ہیں'')

چاندنی زاد ہے وحشت ہے فضا میں شہناز
خوف ابھرے گا جہاں شہر ہے ویراں جاناں
بازاروں چوراہوں میں اک بھیڑ لگی ہے لوگوں کی
ہوش و خرد سے بیگانے ان انسانوں میں کھو جاؤ
(شہناز مزمل: ''موم کے سائبان'')

تن من اپنا خاک ہوا تب نگری ایک بسائی تھی
جاتے سمے جو لوٹ کے دیکھا ہر اک اینٹ پرائی تھی

کس در کی زنجیر ہلاتی کس سے جا کرتی فریاد
میرے ساتھ تو ایک خدا تھا تیرے ساتھ خدائی تھی

مجھ سے میرا پتا نہ پوچھو میرا ٹھور ٹھکانا کیا
میں نادان پرائے گھر پر جانے کیوں اترائی تھی

من پنچھی تو کالے کوسوں بولے کہیں منڈیروں پر
کسی نے خالی پنجرے ہی میں گھر دیوار سجائی تھی

کھائیاں کھڈے ٹیلے پتھر سب کچھ دیکھا بھالا تھا
جانے پہچانے رستے تھے جن پر ٹھوکر کھائی تھی

ظاہر آنسو پونچھ چکے تھے من اپنا بہلا بھی چکے
سچ پوچھو تو چھپ چھپ روئے برسوں نیند نہ آئی تھی
(شمیم اکرام الحق)

گلنار حادثاتِ وفا نقش ہو گئے
اک رنگِ شاعرانہ مجھے دے گیا کوئی

ہر حال میں ہر دور میں گلنار جئیں گے
یہ شہر وفا ہم سے بھی آباد ہوا ہے
(گلنار آفرین: ''شام کا تنہا ستارہ'')

اب کہ ممتاز محل، تاج محل، شاہ جہاں
ہو گئے قصۂ پارینہ کے عنواں جاناں

کیوں نہ تعمیر کریں درد کا وہ قصرِ سخن
جس میں ہم تم رہیں اک ساتھ غزل خواں جاناں
(صبیحہ صبا: ''چشم ستارہ شمار'')

اپنے گھر کی ہر کثافت کو چھپانے کے لیے
اجلی اجلی چیزیں اپنے بام و در پر ٹانگنا

کچھ گھروں میں دن میں بھی رہتا ہے تاریکی کا راج
گر ملے فرصت کبھی اک ایسے گھر میں جھانکنا
(نجمہ یاسمین یوسف: ''سیپ، سمندر اور موتی'')

کوئی دالان میں کوئی دہلیز پر
خواب بنتی ہوئی لڑکیاں رہ گئیں

حسنِ اخلاق دفتر میں کام آ گیا
گھر میں بیٹھی ہوئی بیویاں رہ گئیں
(سعیدہ روشن صدیقی: ''اُفق'')

کوئی مجھ کو مرا بھرپور سراپا دے
مرے بازو، مری آنکھیں، مرا چہرہ لا دے
ایسا دریا جو کسی اور سمندر میں گرے
اس سے بہتر ہے کہ مجھ کو مرا صحرا لا دے

نیا موسم مری بینائی کو تسلیم نہیں
مری آنکھوں کو وہی خواب پرانا لا دے

کوئی خواہش نہیں تجھ سے اے مری عمرِ رواں
مرا بچپن، مرے جگنو، مری گڑیا لا دے

کشتیِ جاں تو بھنور میں ہے کئی برسوں سے
اے خدا اب تو ڈبو دے یا کنارا لا دے

جس نے بچپن میں مجھے دھوپ سے محفوظ رکھا
وہی خوشبو اسی مٹی کا گھروندا لا دے
جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو مجھے شہر میں ایسا لا دے
(نوشی گیلانی)

اے ہونٹ سِلی لڑکی عادت ہے کہ مجبوری؟
چہرہ پہ سکوں لیکن آنکھوں میں دھواں رکھنا
طبع رنگین سہی اس کی مگر ہر لڑکی
پیرہن کی طرح تبدیل نہیں ہو سکتی
(یاسمین گل: ''اعتراف'')

اب آخر میں پروین طاہر کی ایک نظم دیکھیے:
میں تیری ہم زاد کہاں ہوں!

اوری، میری چندر مکھی

اوٗ میری سُندر بالا!
شام کے روشن خواب کو تُو نے
کس سورج میں ڈھالا
جس کی اُجلی تیکھی کرنیں
آج بھی میرے من آنگن میں
جیون بن کر اُتریں!

تیرے لا حاصل کے حاصل
وُہ نغمے، وہ گیت، وہ دوہے
میری پلکوں کے پیچھے سے
تارا بن کر چمکیں
او میری معصوم، سگندھی
ان دیکھے کو پانے جب تُو
گھر سے دشت کو نکلی ہوگی
زہر اُگلتے ہونٹوں پر
اک مُسکان تو پھیلی ہوگی!

کیا تھا اس کی بنسی میں،
کیوں چھوڑا وہ میلہ
جانے کیا کیا جھیلا
دودھاری ہے آگاہی بھی
ظالم وقت کا ریلا!
تیرے ناآسودہ جذبے
روگ بجوگ اوّتے

تیرا سپنا کیسے سینچوں
میرے نین کٹورے!
تیرے خواب کا بوجھ ہے بھاری
میں کمزور سی ناری
دُکھ سہنے کا وچن نہ لینا!
مجھ میں پھر سے جنم نہ لینا!

1: میرابائی کی بھینٹ

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر سلیم اختر۔ شبنم شکیل

ادا جعفری

''یہ واقعہ کہ جدید ادب کے تقاضوں نے ہمارے ملک کی خواتین کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے' ہندوستان کے موجودہ دور کی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ قدامت اور جمود کے خلاف عوامی افکار نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس کے صحیح ہونے کا ثبوت اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ خواتین عموماً ہر قوم میں سب سے زیادہ قدامت پسند ہوا کرتی ہیں۔ اب زمانہ کے تقاضوں سے متاثر ہورہی ہیں اور ان کا ادب اور ان کی شاعری عمومی افکار کی آئینہ دار بننے پر آمادہ ہوگئی ہے۔ ادا بدایونی جیسی خواتین کا یہ رجحان جدید ادب کا ایک نشانِ راہ ہے جس سے ہم اس منزل کا پتہ پاتے ہیں جہاں ملک کے ذہنی انقلاب کی تمام قوتیں مجتمع ہورہی ہیں۔''

ادا جعفری (شاعری سے پہلے ادا بدایونی) کے 1950 میں مطبوعہ اولیں مجموعہ کلام ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' کے دیباچہ نگار (قاضی) محمد عبدالغفار نے جو کچھ لکھا آج اتنا ہی درست ہے جتنا کہ یکم فروری 1947ء کو تھا۔ اس اولین شعری مجموعہ کے منظوم ''پیش لفظ'' میں ادا یوں لکھتی ہیں۔

زندگی تیرے لیے خواب سہی' گیت سہی
نقرئی گیتوں کی زرکار سجیلی کرنیں
نور برساتی رہیں تیرے شبستانوں میں
زندگی ٹھوکریں کھاتی رہی طوفانوں میں
تو کہاں سوچتی خوابوں کی سجل باہوں میں

کیوں ڈھلکنے سے بھی معذور رہا کرتے ہیں
وہی آنسو جنہیں مبہم سا سہارا نہ ملا
کسی دامن کسی آنچل کا کنارا نہ ملا
کیسے محبوب تمناؤں کی کومل کلیاں
آگ اور خون کے عفریت نگل جاتے ہیں
کیسے تہذیب کے معیار بدل جاتے ہیں
تو کہاں سنتی وہ بے باک نوائی جس کو
لوریاں دے کے سلایا ہے نہاں خانوں میں
انہیں روندی ہوئی ٹھکرائی ہوئی راہوں میں
کتنی نوخیز امیدوں کے سجیلے سپنے
کتنی معصوم امیدوں کے سجیلے سپنے
چند داموں کے عوض بکتے رہے بکتے رہے
بربریت کے ستم سہتے رہے سہتے رہے
زندگی میرے لیے خواب نہ تھی، گیت نہ تھی

اس کتاب میں کسی اور موقعہ پر اس امر پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ خواتین نے تخلیقی اظہار کے لیے شاعری اپنائی تو کس طرح اس میں اپنی تخلیقی شخصیت کا اظہار کیا۔ لہٰذا اس کا اعادہ نہ کرتے ہوئے صرف یہ یاددہانی کراؤں گا کہ انقلابی فکر کے جدید لہجہ اور ترقی پسندانہ اسلوب اور ادبی سوچ کے باعث چوتھی دہائی میں ادا کی شاعری قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی تھی۔ اگرچہ ان کی معاصرین میں بعض ان سے سینئر شاعرات بھی تھیں۔ جیسے صبا لکھنوی، نوشابہ قدوائی، ذکیہ سلطانہ، صفیہ شمیم ملیح آبادی وغیرہ۔ مگر عصری شعور پر مبنی شاعری کے باعث جلد ہی اور نسبتاً کم لکھنے کے باوجود بھی ادا کی شاعری کی تنقیدی تحسین کا آغاز ہوا تو پھر اس کا اختتام نہ ہوا۔ حتیٰ کہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو "شہرِ درد" (۱۹۸۸ء) کے بارے میں فیض احمد فیض نے یہ لکھا۔

"۔۔۔۔ادا کے لہجے میں اب ایسا یقین اور ان کی آواز میں ایسی تمکنت ہے جو

شاعر کو جہد اظہار میں اپنا مقام ہاتھ آ جانے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ چنانچہ ادا جعفری نے درد کا جو شہر تخلیق کیا ہے اس شہر کی دیواریں ان کی ذات تک محدود نہیں۔ قریب قریب عالمگیر ہیں اور اس دور میں حزن و یاس کا عنصر بہت کم ہے اور اس عزم و استقلال کا دخل کہیں زیادہ ـــــ شہرِ درد نہایت موثر با سلیقہ اور باوقار کلام کا مجموعہ ہے''

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کے ادبی منظر نامہ پر صرف گنتی کی چند ایسی خواتین نظر آتی تھیں جن کی تخلیقی کاوشوں کا سنجیدگی سے جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ افسانہ (اور تنقید میں بھی) ممتاز شیریں۔ ادا جعفری نے ''بلاوا'' نظم ممتاز شیریں کی یاد میں قلم بند کی (ملاحظہ کیجئے ''غزالاں تم تو واقف ہو'') ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر بھی ان ایام میں یہاں تھیں۔ اگرچہ کچھ شاعرات بھی تھیں۔ مگر ادا ان سب میں نمایاں تر تھیں پہلا شعری مجموعہ ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' اگرچہ ۱۹۵۰ میں شائع ہوا لیکن درحقیقت قیامِ پاکستان سے قبل ہی یہ مجموعہ مرتب ہو چکا تھا۔ معیاری ادبی جریدوں اور ترقی پسند رسالوں میں ادا کی شاعری چھپتی رہتی تھی یوں انہوں نے جدید سوچ کے حامل قارئین کا ایک حلقہ بنا لیا اور ترقی پسند شعراء میں ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ پاکستان میں جب بھی شاعرات کا تذکرہ ہوا تو سرِ فہرست ادا ہی نظر آئیں اس لیے اگر ضمیر جعفری اور حمایت علی شاعر نے ''ادا جعفری کو جدید اُردو شاعری کی خاتونِ اول کہا'' تو غلط نہ تھا (تعارف سازِ سخن'' ۱۹۸۸)

اس کتاب میں ''چند باتیں'' کے عنوان سے ادا لکھتی ہیں:

''میں نے شاعری کا سفر ایک ہی لفظ کی آرزو کے سایے سایے طے کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ حرفِ صداقت جو لکھنے والے پر فرض بھی ہوتا ہے اور اس پر قرض بھی ہوتا ہے۔ جو دین ہے، جو وطن کی محبت ہے۔ یہ جو تصویریں ہیں یہ نہ کسی چوپال کی ہیں، نہ کسی محل سرا کی یہ دلوں کے اندر کی، ذات کے تہہ در تہہ حجابوں کی تصویریں ہیں، یہ زندگی کے خاکے ہیں۔ کچھ میری ذاتی کچھ ہماری اجتماعی زندگی کے، کچھ دکھ سکھ میرے اپنے ہیں۔ کچھ اذیتیں اور راحتیں آپ کی ہیں۔ شاید کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکا اور میں بھی نہیں کہتی کہ میں نے جو دیکھا، جو سوچا اور جو چاہا، وہ سب کہہ سکی ہوں۔ اتنا ہے کہ زندگی کی سچائیوں نے مجھے جو پھولوں اور زخموں کے گجرے دیئے ہیں وہی میری متاع ہیں۔ میں جس عہد میں زندہ ہوں

یہ اس عہد کے خواب ہیں''۔

یہ اقتباس قدرے طویل تو ہے لیکن ادا جعفری کے فنی آدرش کو سمجھنے کے لیے لازمی حوالہ قرار پاتا ہے اور جب اس کے ساتھ اولین مجموعہ کا منظوم پیش لفظ بھی شامل کر لیں تو ادا کے فکر وفن کی تمام جہات واضح ہو جاتی ہیں۔

ادا نے گذشتہ صدی کی چوتھی دہائی میں جس تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا چھ دہائیوں بعد ۲۰۰۲ء میں شعری کلیات ''مدھم مدھم'' کی صورت میں گویا تکمیل پا گیا پھر بھی تخلیقی سطح پر انہیں یہی احساس رہا۔

زندگی شعر ہے نہ افسانہ
کیا لکھوں اور کیا اٹھا رکھوں

تیز ہو حرف کی لو گیت کی لے اور بڑھے
ابھی بستی میں اداسی ہے جو ہر سو بولے

یہ شہر ہے اور ہی طرح کا
اب لفظ ملے تو حال لکھوں

تصویر سی دیکھتی رہی ہوں
کیا قصۂ ماہ و سال لکھوں

سازِ سخن بہانہ ہے'' کا ایک شعر ہے

زہر نس نس میں اتر جائے تو فن کہلائے
ہم نے برتا ہے ادا جس کو وہ غم عام نہیں

قیام پاکستان اور بعد ازاں کباب سیخ جیسی کروٹیں بدلتی معاصر تاریخ میں طے ہوئے اس تناظر میں ادا کے کلیات کا مطالعہ کرنے پر یہ احساس ہوتا ہے کہ حساس اور

صاحب آگاہ شاعرہ ہونے کے ناتے انہوں نے ہر ممکن طریقہ سے اپنی تخلیقات کو عصر کا استعارہ بنانے کی جو سعی کی بحیثیت مجموعی اس میں کامیاب بھی رہی ہیں۔ ادا نے بعض نظموں اور غزلوں کی بلحاظ سنین ترتیب کی اور پھر ہر نظم اور غزل کے ساتھ تاریخ تحریر بھی درج کر دی۔ یوں ان کی روشنی میں ان کا تخلیقی سفر ذات و وجود سے ماورا ہو کر گردوپیش' حالات وواقعات حوادث وسانحات اور اجتماعی المیوں کا شاعری کے پیرایہ میں ترجمان نظر آتا ہے۔ اس کامیابی پر ادا کو پاکستان کی شاعرہ مورخ قرار دیا جا سکتا ہے۔ نظموں میں واضح اور غزلوں میں ایمائی اسلوب میں وہ عصری صورتِ حال کی مرقع کشی کرتی جاتی ہیں۔ خود ادا کو بھی اس کا احساس ہے۔

اک لمحۂ ناچیز و گریزاں کے فسانے
تاریخ کے اوراق پہ تابندہ رہے ہیں

لکھے گئے حالاتِ جنوں روزِ ازل سے
حالاتِ جنوں آج بھی ناگفتہ رہے ہیں
(شہرِ درد)

مرے حرف حرف کے ہاتھ میں سبھی آئینوں کی ہیں کرچیاں
جو زباں سے ہو نہ سکا ادا بہ حدودِ بے سخنی کیا
فیض احمد فیض نے تو
خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں _ کہا تھا مگر ادا اس خیال کو بانداز دیگر ادا کرتی ہیں۔
خونِ دل میں تو ڈبویا تھا قلم۔ اور پھر کچھ نہ لکھا تھا شاید (سازِ سخن بہانہ ہے)
آج کے تناظر میں ادا جس بے چارگی کا اعتراف کرتی ہے۔ وہ زیادہ موزوں محسوس ہوتی ہے۔

کسی شاعر کے کلیات کا مطالعہ ایک نوع کی غوطہ زنی کے عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ تہہ آب بے شمار سیپ ملتی ہیں مگر بیشتر سیپ موتیوں سے خالی ہیں لیکن ادا

جعفری کے کلیات ''مدھم مدھم'' کا مطالعہ گوہرِ مقصود حاصل کرنے والے نقاد کے لیے لازم ہے۔ سو میں نے جب چھ شعری مجموعوں پر مشتمل کلیات کا مطالعہ کیا تو جہاں ان کے بیانِ فن کی چار کھونٹ (ذات' معاشرہ' عصر' تاریخ) کا سفر کیا وہیں ادا جعفری کی کمٹمنٹ کی گواہی دینے والے متعدد اشعار بھی ملے۔ اس میں سے چند اشعار کے ذائقے میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ یہ صرف غزلوں کے اشعار ہیں کہ ایمائیت اور اشاراتی اسلوب کی بنا پر بعض اوقات نظم کی وضاحت کے مقابلہ میں ان اشعار کی چبھن کاٹ اور تاثیر بہتر طور پر محسوس کی جاسکتی ہے خاص طور پر ایک عورت کے جذبات کے حوالے سے:

اسیر رکھ نہ سکے انجم و قمر کے حصار
تمھیں ملال' مجھے نازِ جراَتِ انکار

تو میرے عزم کی پہنائیاں نہ بھانپ سکا
میں دیکھ بھال چکی تیرے ثابت و سیار

جل رہا ہے گلستاں
چھوڑ ذکرِ آشیاں
لٹ رہا ہے کارواں
سر جھکا سنگِ نشاں
(میں ساز ڈھونڈتی رہی)

آنکھ کو اشک پھول کو شبنم
ایک چھالا کہاں کہاں پھوٹا
بات کہنے کے لاکھ پہلو ہیں
ناؤ ٹوٹی کہ ناخدا ٹوٹا
حائل رہی ہے راہ میں دیوارِ برگِ گل

چلتے ہیں شہرِ درد ہے دست ِ تہی لیے
اشعار میں ڈھلے ہیں کئی پارہ ہائے دل
آنسو نہ تھے کہ ہم نے مروت میں پی لیے
شور وہی، خلش وہی، درد وہی، تپش وہی
منزلِ آرزو وہی ' راہ وہی، روش وہی
صاف گوئی بڑا قہر تھی، جرم تھی
استعاروں میں ان کو جتاتے رہے
خامشی گونج بھی جنگار بھی، آواز بھی ہے
بے خودی میں لب ِ گفتار ہے آگے نہ بڑھو
اب جنوں کو بھی ہے پابندیِ آدابِ جنوں
غم کو آسائشِ جاں آہ کو تاثیر کہو
راہ زن سے کیا پوچھیں، راہبر سے کیا پوچھیں
اپنے دل کے ویرانے' ہاتھ میں چراغ اپنا
یہ جو الفاظ ہیں پارۂ دل ہیں یہ
آپ ہیروں میں ان کو نہ تلوایئے
ہاں بزم سخن کے ہم صفیرو
کچھ سوچ کے ہونٹ سی لیے ہیں
(شہرِدرد)

صبح زنداں میں بھی ہوتی ہو گی
پھول مقتل میں بھی کھلتے ہوں گے

ہوتا ہے ادا آج بھی زخموں سے چراغاں
ارزاں ہے جو شے اس کے خریدار بہت ہیں

تم اس دیار میں انساں کو ڈھونڈتی ہو جہاں
وفا ملے تو بہ احساسِ مجرمانہ ملے

یا رب مجھے بتا کہ مرے عہد کا مسیح
اپنی صلیب آپ کہاں تک اٹھائے گا

یہ بے بسی تو مرے عہد کا مقدر تھی
دلوں کو داغ تمنا بھی مستعار ملے

جو شاخِ گل صلیب سے دستِ دعا بھی تھی
بے چارگیِ حسنِ پریشاں کوئی تو ہے
بس ایک بار منایا تھا جشنِ محرومی
پھر اس کے بعد کوئی ابتلا نہیں آئی

(غزالاں تم تو واقف ہو)

ادا جعفری کے کلام میں اسی انداز و اسلوب کے اشعار کی کمی نہیں۔ سوویت یونین کے زوال اور انتشار کے بعد علمی حلقوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ کیا اس سقوط کے ساتھ ہی ترقی پسند مقصودِ حیات اور نظریۂ ادب بھی ساقط ہو گیا۔ اس بحث سے وابستہ جزئیات کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں تاہم اتنا عرض کروں گا کہ نظریات اور تصورات زندگی، زمانہ، معاشرہ اخلاقیات و جمالیات سے مشروط ہوتے ہیں۔ حکومتوں اور حکمرانوں سے نہیں۔

ترقی پسند مقصودِ حیات اور ادب برائے زندگی کا نظریہ معاشرہ میں طبقاتی تفہیم اور سماج کے تانے بانے سے مشروط ہے اس لیے انسانی معاشرہ میں جب تک ظلم، جبر، استحصال، عدم مساوات، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم تنگ نظری جہالت اور سیاسی قہر رہے گا ترقی پسندانہ سوچ کی بھی ضرورت رہے گی، ضرورت کیا؟ ترقی پسندانہ سوچ بھی ان مسائل

کا احساس کرا سکتی ہے۔

اس تناظر میں ادا جعفری کے تخلیقی سفر کا تجزیاتی مطالعہ کرنے پر احساس ہو جاتا ہے کہ تقریباً ساٹھ برس اس نے ترقی پسندانہ فکر پر مبنی جس نصب العین اور ادب برائے زندگی کے تصور پر مبنی شاعرانہ مسلک اپنایا۔ اس پر کاربند رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بڑھتی عمر، مشاہدات اور تجربات نے کم عمری کی جذباتیت کی جگہ پختہ عمر میں پیدا کردہ پختہ فنی شعور نے لے لی۔ پورے شعر کو نعرہ میں تبدیل کرتے ہوئے اسلوب کے جمالیاتی تقاضوں کو ملحوظ رکھا اور اس میں اسی کی انفرادیت مضمر ہے۔ اشعار میں جمالیات کا اظہار شروع میں تو یوں ہوا:

ہاتھ کانٹوں سے کر لیے زخمی
پھول بالوں میں اِک سجانے کو

اور پھر یہی احساسِ جمال اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا یہاں تک پہنچ جاتا ہے۔

تاریخ یوں لکھی تھی نزولِ بہار کی
ہاتھوں میں آسماں تھا پلک پر ستارہ تھا

میں وہ لفظ سن رہی ہوں جو ادا نہیں ہوا ہے
مری اور منزلیں ہیں مجھے وقت کیوں ہے گھیرے

ادا جعفری کی شخصیت اور شاعری سے مزید دلچسپی رکھنے والے قارئین ان کی آپ بیتی ''جو رہی سو بے خبری رہی (کراچی ۱۹۹۵ء) ان کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

زہرا نگاہ

زہرا نگاہ حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ نواب بہادر یار جنگ کے سلسلۂ نسب سے ہیں۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی۔

زہرا نگاہ نے پچاس کی دہائی میں شاعری کا آغاز کیا۔ اس وقت اردو شاعری میں دو رجحانات ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ترقی پسند اشتراکی نظریات کی حامل شاعری اور روایتی رنگ و آہنگ لیے غزل۔ فیضؔ۔ راشدؔ۔ مجازؔ۔ جذبیؔ۔ اختر الایمانؔ اور ان کے ساتھ ساتھ جگرؔ اور فراقؔ سب مل کر یہ سناریو بناتے ہیں۔ مشاعرے کا ادارہ بے حد مقبول تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ابھی ہجرت کا سلسلہ جاری تھا کہ نئے وطن میں ہزار جوکھم سے گزر کے آنے والے بہت سے مسائل سے دوچار تھے۔ برسوں بلکہ صدیوں کے جمے جمائے گھر۔ خاندانی سلسلوں کو یکدم منقطع کر کے ایک نئی جگہ اور ماحول میں زندگی شروع کرنا کوئی معمولی واردات نہیں۔ اپنی سرزمین اور پوری روایت کو چھوڑنے کا غم اور نئے وطن کی محبت اور اشتیاق دونوں نے مل کر ایک مدھم۔ سلگنے والے دور کی صورت اختیار کر لی تھی۔ نئے سرے سے زندگی کا آغاز' نئے مقامی کلچر میں قدم جمانا ایک طرف معاشی تو دوسری طرف تہذیبی سطح پر بہت سے مسائل پیدا کر رہا تھا۔ سب سے بڑا مسئلہ ایک نئی مملکت کے سیاسی اور اقتصادی استحکام کا تھا جس نے اپنی تاریخ کا آغاز ہی ان گنت بے خانماں اور ستم رسیدہ انسانوں اور نہایت محدود مالی وسائل سے کیا۔ اس وقت ہر شخص کو دوہری سطح پر محنت اور تگ و دو کی ضرورت تھی۔ انفرادی اور اجتماعی۔ اس کے ساتھ ہی تشکیل پاکستان کے وقت ہونے والے فقید المثال فسادات۔ خونریزی اور غارت گری۔ انسانی اقدار کی پامالی۔ حیوانیت اور بربریت نے ہوش و حواس بری طرح مجروح کیے تھے۔ دل شکستگی' شدتِ

احساس اور تخلیقِ فن کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ اس ساری صورتِ حال نے جو ایک عام حُزن کی کیفیت پیدا کی تھی اس کے اظہار کے لیے شاعری سے بڑھ کر اور کوئی وسیلہ نہ تھا۔ سو اس انتشار و اضطراب کے عالم میں بھی کہ جب مہاجرین کے لیے اپنے قافلوں کی آمد کا سلسلہ ابھی جاری تھا اور لوگ نئے سرے سے تعمیر آشیاں کی فکر میں سرگرداں تھے غزل نے عصری حسیت کی ترجمانی کا فریضہ ادا کیا۔ گو اس زمانے میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم، غزل کے مقابلے میں زیادہ وقیع ذریعۂ اظہار سمجھی جانے لگی تھی۔ غزل پر یوں بھی مغربی شاعری اور علم و فن کے زیرِ اثر بہت زیادہ اعتراضات ہو چکے تھے اور وہ فرسودہ اور رجعت پسند رجحانات کی مفسر تصور کر لی گئی تھی۔ اور صرف نظم ہی کو جدید دور کے مسائل کا حقیقی ترجمان قرار دے دیا گیا تھا۔ اس خیال کی تائید فیضؔ۔ ندیم۔ راشد اور دوسرے ترقی پسند شعراء کی مقبولیت نے کر دی تھی۔ مگر قیام پاکستان کے بعد غزل کی تماثیل و تصورات کے پورے نظام نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے استعارات نئے معنی کے ساتھ عصری مسائل اور احساس و جذبات کی سچی تفسیر بن گئے تھے۔ ادھر مشاعروں کی مقبولیت نے بھی غزل کو ایک نئی توانائی بخشی۔ کچھ روایتی اثرات کے تحت بھی غزل ہی مشاعروں کی اصل رونق اور جان محسوس کی جاتی تھی۔

پس اس وقت کچھ موضوعات غزل میں مستقل صورت اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ انسانی اقدار کی پامالی۔ صبح آزادی کے داغ داغ ہونے کا احساس۔ زمانے کی ناقدر شناسی۔ دراصل یہ اینٹی کلائمکس کا دور تھا۔ جب کسی آئیڈیل کو اپنی پوری جان کے ساتھ چاہا جائے اور جسم و روح کی پوری توانائیوں اور بے مثال قربانیوں کے ساتھ حاصل کیا جائے۔ اور پھر یہ احساس ہو کہ خواب اور حقیقت کا تفاوت بڑا واضح ہے تو احساس میں تلخی کا در آنا بڑی فطری سی بات ہے۔ آزادی اپنے ساتھ ظلم و ستم کی جو داستانیں لے کر آئی اس نے یہ احساس شدید کر دیا کہ ہم نے یہ سب کچھ اس طرح تو نہیں چاہا تھا۔ دراصل آئیڈیل ایک تجریری تصور ہے۔ جس کا معرض وجود میں آنا بہت سی حقیقی اور مادی تفصیلات کے بغیر ممکن نہیں اور یہ حقیقی اور مادی مشکلات اور تلخیاں پہلے سے انسان کے ذہن میں نہیں ہوتیں یہ تو میدانِ عمل میں اتر کے سامنے آتی ہیں۔ فیضؔ کا مصرع۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

ایک پورے رجحان بلکہ دور کی ترجمانی کرتا ہے۔

صورتِ حال سے مایوس۔ نصب العین کے دھندلا جانے کا احساس۔ اربابِ بست وکشاد کے خود غرض اور غیر منصف ہونے اور عوام کی محرومی اور شکستگی اور ناستیلجیا کے موضوعات اس وقت کی نظم اور غزل میں عام ہیں۔ مشاعرہ یوں تو ہمیشہ ہی سے ہماری تہذیب کا ایک نہایت مقبول اور توانا حوالہ رہا ہے مگر اس وقت یہ اور بھی زیادہ مقبول ہو گیا تھا۔ ایک تو ہند اسلامی تہذیب کے مرکز کا سرزمینِ پاکستان خصوصاً لاہور میں منتقل ہونا اس ادارے کو مزید مستحکم کر رہا تھا۔ اس اضطراب وابتلا کے دور میں بھی شعر وادب کی محفلیں جس قدر مقبول ومعروف تھیں آج ان کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ تب یہ خالصتاً علمی اور ذوقی مجالس تھیں جن میں گلیمر اور دولت کا حوالہ نہ تھا۔ صرف ذوقِ شعر کی تسکین کا سامان تھا اور شعر کا ادارک رکھنے والے جتنے اس زمانے میں تھے آج ناپید ہیں حالانکہ شرح خواندگی میں اضافے کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس وقت کے تعلیمی ادارے ذوق ادب کی تربیت گاہ تھے۔ جہاں سید عابد علی عابد۔ پطرس بخاری۔ صوفی غلام۔ مصطفےٰ تبسم۔ ڈاکٹر تاثیر۔ فیض احمد فیض جیسے اساتذہ شعر وادب کی تدریس کرتے ہیں۔ وہاں طلباً وطالبات کا بے ذوق رہ جانا انہونی سی بات لگتا ہے۔ سوتب پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کے مشاعرے ملکی سطح پر برپا ہوتے اور عصر حاضر کے سب نامی گرامی شاعر اس میں شرکت کرتے۔ حاضرین وسامعین میں طلباً وطالبات کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی۔ گھریلو خواتین اور زندگی کے ہر شعبے میں تعلق رکھنے والے کھنچے چلے آتے۔ بڑے بڑے ہال سامعین سے کھچا کھچ بھر جاتے۔ کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی۔ لوگ ہال کے عقب میں کھڑے کھڑے مشاعرہ سنتے۔ اور دل کھول کے داد دیتے۔ مہذب قسم کی ہوٹنگ بھی عام تھی۔

انہی مشاعروں میں زہرا کی غزل نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ اب زہرا کا نام ہی کسی مشاعرے کی کامیابی کی دلیل سمجھا جانے لگا۔ اس میں اس کی اپنی دلکش شخصیت اور خوش لحنی کا بھی بڑا دخل تھا۔ جن لوگوں نے وہ مشاعرے دیکھے سنے جانتے ہیں کہ اس کم

عمر حسین و دلکش شاعرہ کے سامنے بڑے بڑے شاعروں کا چراغ نہ جلتا تھا۔ فیض احمد فیضؔ زہرا کے پہلے شعری مجموعہ ''شام کا پہلا تارا'' کے پیش لفظ میں اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مشاعرہ لوٹنے کے بہت سے مجرب اور آزمودہ نسخے پہلے سے موجود ہیں جو زہرا نے چھوٹی سی عمر میں سیکھ لیے تھے اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو اسے لحسن کا ایسا گداز عطا ہوا ہے جو زہرا کو مشاعرہ سٹار بنانے کے لیے کافی تھا۔ زہرا اس شاعرانہ دور سے بہت جلد گزر گئیں۔

یہ مشاعرانہ دور کا کام و کمال غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس دور میں رومانوی افسردگی۔ محبت کی روایتی واردات کے ساتھ ساتھ سماجی تنقید کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مجموعی طور پر زہرا کا یہ دور شاعری ترقی پسند تحریک اور روحانیت کا امتزاج ہے۔ ایک نوشگفتہ داستان محبت کے نشانات بے حد سادہ الفاظ میں بڑی سہولت اور تاثر کے ساتھ بیان کرنا اس دور کی غزلیات کا ایک خصوصی پہلو ہے۔

یہ اداسی یہ پھیلتے سائے
ہم تجھے یاد کر کے پچھتائے

نہیں نہیں ہمیں اب تیری جستجو بھی نہیں
تجھے بھی بھول گئے ہم تری خوشی کے لیے

تری نگاہ کی جنبش میں اب بھی شامل ہیں
مری حیات کے کچھ مختصر سے افسانے

جو سن سکو تو یہ سب داستاں تمہاری ہے
ہزار بار جتایا مگر نہیں مانے

اس دور کی غزلوں میں سماجی تنقید پر مبنی اشعار بھی نظر آتے ہیں۔

کہاں کے عشق و محبت کدھر کے ہجر و وصال
ابھی تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا کے مصداق غزل کے روایتی اسلوب میں غم دوراں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے مگر زہرا نگاہ کا اصل جوہر غزل میں نہیں نظم میں کھلتا ہے۔ یہ نظم ہی ہے جس میں اس کی فنی انفرادیت ایک بھرپور انداز میں اظہار پاتی ہے۔ اس رومانوی واقعیت کے دور میں محبت کے مختلف مراحل اور احوال کے لیے نظم کا سانچہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ افسوس کہ پہلے مجموعہ کے دوسرے ایڈیشن میں جو اساطیر نے شائع کیا۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ بہت سی نظمیں بھی شامل کردی گئی ہیں اور اس میں زمانی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ورنہ زہرا کے فنی سفر اور ذہنی ارتقاء کو سمجھنا زیادہ آسان ہو جاتا۔ روایتی غزل کے ساتھ اپنے فن کا آغاز اور بے پناہ مقبولیت حاصل کرتے ہوئے شاعرہ نے کس طرح نظم میں اپنی تخلیق ذات کو دریافت کیا اور اپنی نسائی شخصیت کی تشکیل کی۔ نسائی حیثیت صرف یہی نہیں کہ مونث واحد متکلم کا صیغہ اپنا لیا جائے۔ گھر آنگن اور سنگھار اور برہا کی بات کی جائے۔ اوڑھنی کے رنگوں اور چوڑیوں کی چھنک کو شاعری میں ایک معتبر مقام دلوایا جائے۔ نسائی حسیت سے مراد ہے کہ عورت جس طرح زندگی کو دیکھتی اور بسر کرتی ہے وہ مرد سے مختلف ہے۔ تحقیق بتاتی ہے کہ ہر انسان وقت کو اپنے حوالے سے پہچانتا ہے۔ یعنی اس کا وقت کا تصور ذاتی اور داخلی نوعیت رکھتا ہے۔ اس طرح عورت کا وقت کے ساتھ تعلق اور زمانی احساس مرد سے مختلف ہے۔ کیونکہ اس کے شب و روز اور معاملات وسائل کی نوعیت منفرد ہے۔ وہ اپنی سائیکی جو مرہون منت ہے اس کی جسمانیات کے حوالے سے فطرت کے تمام مظاہر کو، جن میں اس کے پانچوں حواس سے اخذ کردہ تجربہ یعنی رنگ خوشبو آواز لمس اور ذائقہ شامل ہیں۔ اپنے انداز سے محسوس کرتی ہے۔ اس میں صدیوں کے روایتی تلازمات کا بھی دخل ہے۔ اور حال کی تبدیلیوں اور مستقبل کی امیدوں کا تعلق بھی۔ وہ جب موسموں رتوں۔ رنگوں خوشبوؤں کا تجربہ کرتی ہے تو اس کے تلازمات میں ممتا اور بیٹی، بہن اور بیوی کی ذات بھی شامل ہوتی ہے۔ مرد اس سے مختلف انداز میں سوچتا اور محسوس کرتا ہے اس کی سوچ دور رسی اور ارتکاز کی خصوصیات رکھتی ہیں۔

جبکہ عورت بے شمار کام بیک وقت نمٹانے اور ان گنت رشتوں کو قائم رکھتی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ہر عورت ایک فن کار ہے۔ یوں شعر میں عورت کی شخصیت ایک منفرد نقطۂ نظر کی صورت اختیار کرتی ہے تو اسے ہم نسائی حسیت کا نام دیں گے ورنہ محض مونث کا صیغہ استعمال کر لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

زہرا کے ہاں ہم دیکھتے ہیں کہ نسائی شخصیت ایک ارتقائی صورت میں منکشف ہوتی ہے۔ اور پھر ایک شناخت بن جاتی ہے۔ ''شام کا پہلا تارا'' ایک معرکتہ الارا نظم ہے جس میں ہم زندگی کو ایک محبت کرنے والی' موسموں اور مناظر کی ہمدم۔ نازک رشتوں کو پروان چڑھانے والی عورت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ماحول کی کیفیت اور منظر کی زیریں حسیاتی نوعیت کو جذب کرنے میں یہ نظم ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

''شام کا پہلا تارا''

جب جھونکا تیز ہواؤں کا
کچھ سوچ کے دھیما گذرا تھا
جب تپتے سورج کا چہرہ
اودی چادر میں لپٹا تھا
جب سوکھی مٹی کا سینہ
سانسوں کی نمی سے جاگا تھا
ہم لوگ اس شام اکٹھے تھے
جس نے ہمیں ہنس کے دیکھا تھا
وہ پہلا دوست ہمارا تھا
جو شاید ہم دونوں کے لیے
کچھ وقت سے پہلے نکلا تھا
موضوعِ سخن جس پر ہم نے
رائے دی تھی اور سوچا تھا

دنیا کی بدلتی حالت تھی
کچھ آب و ہوا کا قصہ تھا
جب سب لوگوں کی آنکھوں میں
کمرے کا دھواں بھر آیا تھا
تم نے پردہ سرکایا تھا
جس نے ہمیں دکھ سے دیکھا تھا
وہ پہلا دوست ہمارا تھا
وہ شام کا پہلا تارا تھا
وہ شاید ہم دونوں کے لیے
اس رات سحر تک جاگا تھا
وہ شام کا پہلا تارا تھا

اس نظم میں ایک ڈرامائی کیفیت اور شاعری کا جدید رنگ و آہنگ زبان کی سادگی مگر پرکاری مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ اور ایک ایسی نظم تخلیق ہوئی ہے جو بیک وقت ایک مدھم اداس اور سرخوشی و کیف عطا کرتی ہے۔ پورا منظر سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ ایک رواں تصویر ہے اور پوری نظم سے محبت کی دھیمی آنچ اٹھ رہی ہے۔ اس طرح اگر تم کہو تو' میں فطرت کے مناظر شاعرہ کے ہم راز بنتے ہیں یہ ایک خوبصورت' بے کنار دنیا ہے جس میں یگانگت اور محبت ہے' کہیں دشمنی اور منافقت نہیں۔

اگر تم کہو تو

میں وہ ساری باتیں ہواؤں سے کہہ دوں
جو آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم نے کہی ہیں
اشاروں اشاروں میں ہم نے سنی ہیں
کہ یہ آتے جاتے ہوئے نرم جھونکے
ہر اک راستے پر مری راہ روکے

کبھی میرے بالوں سے گجرا گرا کے
کبھی میرے شانے کا پلو گرا کے
مجھے اس طرح چھیڑتے ہیں کہ جیسے
وہ سب جانتے ہیں!

اس نظم میں پوری کائنات شاعرہ کی ہم راز بنتی ہے۔ نرم جھونکے، گھنگور بادل۔ بپھرے سمندر اور اس میں ایستادہ سنگین چٹانیں سبھی اس رازِ حسیت کے امین ہیں جو شاعرہ بوئے نافہ کی طرح وجود میں چھپائے پھر رہی ہے۔

فطرت کے ساتھ ہم آہنگی اور رفاقت زہرا کا ایک مستقل موضوع ہے۔ مظاہرِ فطرت کے ساتھ ہم کلامی اور اس سے دلوں کی کشادگی یگانگت اور وسعتِ نظر اخذ کرنا ہماری کلاسیکی غزل کی روایت نہیں۔ غزل میں یوں بھی ہر تجربہ تجرید میں منقلب ہو جاتا ہے۔ مظاہر فطرت کے ساتھ تعلق زیادہ تر چمن۔ گل و بلبل۔ باد و باراں۔ صرصر و صبا۔ دشت و صحرا۔ برق و خرمن، قفس و نشیمن۔ سراب اور بگولوں کی صورت میں موجود ہے۔ یہ سب استعاراتی صورتیں ہیں۔ اصل مناظر غائب۔ سوائے نظیر اکبر آبادی ہمیں کلاسیکی دور میں فطرت اور انسان کے رشتہ کا تجربہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔ مرثیے میں بھی مناظر استعارہ اور تخیل کے پیچ و خم میں اسیر ہیں۔

مولانا حالی کی جدید شاعری کی تحریک اور مغربی شاعری (خصوصاً رومانی شعراء) کے براہ راست اثرات کے تحت یہ عنصر اردو شاعری میں وارد ہوتا ہے۔

اقبال نے فطرت اور انسان کے رشتے میں ایک دردمندی رفاقت اور ایک ازلی رشتے کی صورت میں فلسفیانہ جہت عطا کی اور مظاہر کائنات کے ساتھ انسانی روح کو منسلک دیکھا۔ اس کے بعد ہماری شاعری کا موضوع بنتا چلا گیا۔ اور فطرت اور منظر نگاری نے ایک مستقل صورت اختیار کر لی۔ شاعرات کے ہاں منظر نگاری مقصود بالذات نہیں یہ ہمدمی اور رفاقت کی صورت میں نظر آتی ہے۔ فہمیدہ ریاض اور زہرا کے ہاں موسموں کے رنگ اور رتوں کے انداز میں سرخوشی کے ساتھ ساتھ ماورائی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ ملاحظہ

ہو یہ نظم

کیسی ستھری شام ہے دیکھو
کیسی ستھری شام ہے دیکھو
دھلی دھلائی
مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو میں
بسی بسائی
پتا پتا تھمی ہوئی بارش کے موتی اپنے تن پر ڈھلکاتا ہے
اپنی رنگت اپنے کومل پن پر کیا کیا اتراتا ہے
دور دور تک پیدل جانا
گہری گہری سانسیں لینا
اپنے آپ سے باتیں کرنا
سب اچھا لگتا ہے

فطرت کے ساتھ یگانگت کی ایک بہت خوبصورت نظم میں زہرا کا فن اپنے عروج پر ہے۔

چمکتی ہوئی دھوپ تیزی سے نکلی
گزرتی ہوئی بارشوں کو بلانے
ہواؤں نے ضد کی کہ ہم بھی چلیں گے
لگیں ٹھنڈکیں اپنے پیکر سجانے
ملی تھی خبر موسموں کو کہیں سے
کسی کنجِ گلشن میں ہیں دو دوانے
وہ برسوں کے بعد آج یکجا ہوئے ہیں
جو بیتی ہے اک دوسرے کو سنانے

درختوں نے جھک جھک کے تعظیم بخشی
بڑھے سبزہ وگل بھی آنکھیں بچھانے
کبھی ان کے چہروں کو بارش نے چوما
کبھی ان کا دامن بسایا صبا نے
کبھی ان کی آنکھوں میں سورج نے جھانکا
کبھی ڈال دی ان پہ چادر گھٹا نے

جو شاعری دکھتے اعصاب اور چٹختے احساس اور بجھتی ہوئی روح کو سکون واطمینان، تازگی اور فرحت بخشے اس کی افادیت اور قدر و قیمت کے بارے میں دو آرا نہیں ہو سکتیں۔

مگر تلخ حقائق کا سامنا کئے بغیر زندگی کب گزرتی ہے نہ گزر سکتی ہے۔ زہرا کے ہاں عورت اور مرد کی رفاقت میں ایسے بہت سے مقامات آتے ہیں جہاں یہ رشتہ محض سراب نظر آنے لگتا ہے۔ مگر خاندانی زندگی میں رشتے نبھانا ایک فریضہ بن جاتا ہے۔ معاشرے اور فرد کی سلامتی اسی میں سمجھی جاتی ہے سو یہ تعلق ایک معاہدہ کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ ایسا تعلق جس کی سطح پرسکون مگر زیرِ سطح ایک رستاخیز برپا ہوتی ہے۔ بلاوا ایک ایسی نظم ہے۔

جو سچ پوچھو تو ہم تم زندگی بھر ہارتے آئے
ہمیشہ بے یقینی کے خطر سے کانپتے آئے
ہمیشہ خوف کے پیراہنوں سے اپنے پیکر ڈھانپتے آئے
ہمیشہ دوسروں کے سائے میں اک دوسرے کو چاہتے آئے
بُرا کیا ہے اگر اس کوہ کے دامن میں چھپ جائیں
جہاں پر جا کے کوئی پھر کبھی واپس نہیں آتا

جب ایک منافقانہ زندگی بسر کرنا مجبوری ہو جائے تو آدمی میں احساسِ جرم پنپنے

لگتا ہے جو بہت سے منفی تاریک رجحانات کی آماجگاہ ہے۔ یہ تاریکی رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر انسان کی روح کو چاٹ جاتی ہے اور ایک مسلسل حزن وملال۔ بے اطمینانی اور باطنی کرب مقدر بن جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال عورت کے لیے زیادہ جانکاہ ثابت ہوتی ہے کیونکہ رشتوں کو نبھانے کی پابندی اور ذمہ داری بھی سب سے زیادہ اس پر عائد کی جاتی ہے۔ پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ باقی ماندہ عمر ایک سمجھوتے کے سائے تلے گزار دی جائے سمجھوتے کی ملائم گرم چادر جو سچ اور جھوٹ سے ماورا بے حسی کے تانے بانے سے بن گئی ہے۔ جو آدمی کو ایک newtral حالت میں رہ کے سانس لینے کا عادی بنا دیتی ہے۔ جب وہ نہ تو خوش ہوتا ہے نہ رنجیدہ۔ کچھ بھی اہم نہیں رہتا۔ بس وقت کاٹنا زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر

یہ چادر میں نے برسوں میں بنی ہے
کہیں بھی سچ کے گل بوٹے نہیں ہیں
کسی بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں ہے
اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا
اسی سے تم بھی آسودہ رہو گے
نہ خوش ہو گے نہ پژمردہ رہو گے
اسی کو تان کر بن جائے گا گھر
بچھا لیں گے تو کھل اٹھے گا آنگن
اُٹھا لیں گے تو گر جائے گی چلمن

جو سچ کہیں تو ہمارے معاشرے کے نوے فی صد لوگ اس عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور مائیں اپنی بچیوں کو آئندہ زندگی کے لیے اپنی رول ماڈل پیش کرتی ہیں۔ ایک ایک زندگی جس میں عورت کی اپنی شخصیت کے پنپنے اور استوار ہونے کے کوئی مواقع

نہیں ہوئے جس میں وہ روز اول اپنی انا کا سودا کرتی ہے اور باقی ساری زندگی سر جھکا کے زندہ رہتی ہے۔ اور جو ایسا نہیں کرتیں ان کے لیے کم از کم اس معاشرے میں کوئی باعزت جگہ نہیں۔

عائلی زندگی میں دونوں رفیقوں کے درمیان اجنبیت کی جو نامعلوم سی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ مگر بنیادی وجہ ایک ہی ہے۔ برتری اور فوقیت کا آسیب ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے راستے دکھاتا رہتا ہے۔ اور فاصلے بڑھتے چلے جاتے ہیں کبھی تو اس قدر کہ واپسی کے تمام راستے معدوم ہو جاتے ہیں۔ اس تصادم میں اکثر عورت ہی کو پسپا ہونا پڑتا ہے کیونکہ اسیر معاشرے کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں اس کی جسمانی کمزوری اور دوسروں پر انحصار کرنے کی معذوری کا بھی دخل ہے۔ اقتصادی دست نگری، روایت اور رسم و رواج کی پاسداری بہت بڑے عوامل ہیں۔ شاید وہ بالغ نظری محض خواب ہے جس میں مرد اور عورت میں احترام باہمی اور شخصی آزادی جزوِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہمارے اور تمہارے راستوں میں
ہمارے اور تمہارے راستوں میں
کہیں بھی آشنا سورج نہیں ہے
بہ ظاہر ساتھ چلتے جا رہے ہیں
کوئی بھی مشترک سایہ نہیں ہے

ہماری شخصیت کے آئینے میں
ہمارے عکس سب چٹخے ہوئے ہیں
ہمارے جسم کے بوجھل تقاضے
ہماری روح تک گہنا چکے ہیں

قصور اس میں تمہارا ہے نہ میرا
سنا ہے دوستاروں کا قرینہ
بہت منحوس ہو جاتا ہے اکثر
وہ آپس ہی میں ٹکرا کر الجھ کر
بکھر جاتے ہیں یونہی آسماں پر

اگر وہ دور ہوں اک دوسرے سے
تو بڑھ جاتی ہے ان کی جگمگاہٹ
کبھی فصلِ جبینِ آسماں وہ
کبھی حسنِ نگاہِ رہرواں وہ
ہمیشہ کاروانوں کے نشاں وہ

ہم اپنے قرب کے کمزور دھاگے
جھٹک کر توڑ دیں ہمت نہیں ہے
یہ زہراب پی ہی لیں جرأت نہیں ہے
کبھی سچ بول دیں عادت نہیں ہے

گھر، آنگن، بچے! یہ عورت کا خواب بھی ہے اور زندگی کا حاصل بھی۔ اس کو فطرت جسمانی اور روحانی طور پر انہی آرزوں کے ساتھ پیدا کرتی ہے۔ شاید اس لیے کہ اس سے زندگی کا سلسلہ چلانے کا کام لینا ہوتا ہے۔ تسلسل حیات میں عورت اور مرد دونوں شریک ہیں مگر نئی زندگی کی حفاظت کرنے والی۔ ہر قیمت اور ہر حال میں آئندہ نسل کی پرورش کرنے والی۔ خود اپنی ذات کی قیمت پر مستقبل کو پروان چڑھانے والی۔ عورت ہی ہے۔

عورت نے ہمیشہ محفوظ، خوبصورت گھر کا خواب دیکھا ہے اور اسی کے پیچھے

سرگرداں رہی ہے۔اس نے بچوں کے ہمہماتے آنگن کی آرزو کی ہے۔ممتا اس کے وجود کی بنیاد ہے۔ ہماری سب شاعرات نے اس عظیم جذبے کوخراجِ تحسین پیش کیا ہے۔سبھی نے بچوں کو اپنی ہستی کی معراج اور وجود کا جواز قرار دیا ہے۔

ممتا کی آنچ کوصرف عورت ہی شعر میں سمجھ سکتی ہے۔ملاحظہ ہو

اس گھر میں بہہ رہے ہیں

دو روشنی کے چشمے

دو پھول مسکرا کر	خوشبو لٹا رہے ہیں
دو گیت ساتھ مل کے	رس رنگ گھولتے ہیں
دو تارے جگمگا کے	رستہ دکھا رہے ہیں
دنیا کی دلکشی کا	اعلان کر رہے ہیں
دنیا کی دھوپ میں یہ	پروان چڑھ رہے ہیں

یہ گھر آنگن عورت کے رگ وریشے میں بسا ہے وہ اس کو ہر صورت میں قائم و دائم رکھنا چاہتی ہے۔اوراس راستے میں ایک انہونی قوت برداشت کا ثبوت دیتی ہے۔ اس سفر میں زہر گداز آزمائشیں اور امتحان کھڑے کیے جاتے ہیں۔ وہ ہر دم کٹہرے میں کھڑی رہتی ہے۔اس پر نا کردہ گناہوں کی فردِ جرم عاید کی جاتی ہے۔لیکن اسے گھر بچانا ہے۔بھرم قائم رکھنا ہے۔بھرم نہیں تو معاشرے میں وہ دوکوڑی کی ہو کے رہ جاتی ہے۔اس امتحان وفا سے بڑی بڑی دیویوں اور اللہ والیوں کو گزرنا پڑا۔زہرا کی ایک بہت اہم نظم بن باس، ملاحظہ کریں۔جس میں سیتا دیوی اپنی پاکیزگی کا ثبوت دینے کے لیے آگ پر سے گزرتی ہے۔اسے آگ میں پاؤں دھرنا ہے۔ بچ جائے تو دیوی۔نہیں تو پاپن۔ سارا گاؤں کھڑا دیکھتا ہے۔رام بھی پاس ہی کھڑے ہیں۔اورایسی اس کہانی کی پنچ لائن ہے۔

سیتا کو دیکھے سارا گاؤں
آگ پہ کیسے دھرے گی پاؤں

بچ جائے تو دیوی ماں ہے
جل جائے تو پاپن
جس کا روپ کلجت کی ٹھنڈک
اگنی جس کا درپن
سب جو چاہیں سوچیں سمجھیں
لیکن وہ بھگوان
وہ تو کھوٹ پٹ کے بیری
وہ کیسے نادان
اگنی پار اتر گئی سیتا
جیت گئی داشواش
دیکھا دونوں ہاتھ بڑھائے رام کھڑے تھے پاس
اس دن سے سنگت میں آیا
سچ مچ کا بن باس!

عورت کی عزتِ نفس اور اعتماد ذات کو پامال کرنے کا اس سے بڑھ کر اور کوئی نسخہ نہیں کہ اس پر اعتماد نہ کیا جائے۔ تب اس کی روح کے شیشے میں بال آ جاتا ہے جو کبھی نہیں جاتا۔ زہرا اس انتہائی نازک فرق تک کس طرح پہنچتی ہے۔ سیتا اس امتحان میں تو سرخرو ہو گئی مگر اس کا اصل بن باس تو اب شروع ہوا جب اس نے دیکھا کہ اس کا امتحان لینے والوں اور اس پر شک کے تیر چلانے والوں میں اس کا اپنا محبوب رفیق حیات بھی شامل ہے۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہ سوچ سکتی تھی کہ جس کی خاطر اس نے اتنی قربانیاں دیں اور کٹھنائیوں میں گزری اس کے اعتماد کو یوں خاکستر کر دے گا۔
عورت کو ملامتوں کے درمیان زندگی بسر کرنا ہے۔ وہ ملزم ہے جب کہ معصوم ثابت نہ ہو اور اس کا معصوم ثابت ہونا ممکن نہیں۔ یوں وہ زندگی بھر خود اپنوں اور پرایوں کے ہاتھوں چلنے والے خنجروں کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ گھر کی چار دیواری

میں چلنے والے ان خنجروں کی خبر سوائے اس کے کسی اور کو نہیں ہوتی ملاحظہ ہو اس کی نظم ''میلہ گھومنی''

وہ لکڑی کے تختے پہ ایسے کھڑی ہے
کہ ہر پور کیلوں سے جیسے جڑی ہے
ابھی اس کا بیٹا، ابھی اس کا شوہر
چلائیں گے خنجر کی بوچھاڑ اس پر
کبھی ہاتھ کے رخ، کبھی پیٹھ پیچھے
کبھی سر کے اوپر تو کندھے کے نیچے
تماشائی سانسوں کو روکے ہوئے ہیں
تماشہ ہر اک بار یوں دیکھتے ہیں
کہ جیسے وہ پہلے پہل دیکھتے ہیں
کسی نے نہ دیکھا
کہ دنیا کے میلے میں
سج دھج کے اپنی
گرہستی کے تختے پہ
جکڑی یہ عورت
خود اپنوں کے ہاتھوں
چلائے ہوئے کتنے خنجر
بدن میں چھپائے ہوئے
گھومتی ہے
کہیں فرق ہے تو بس اتنا
کہ خنجر کی دھاریں
اس کے کمزور تن کو

بچاتی نہیں ہیں
مگر سب کی نظروں میں آتی نہیں ہیں

شبنم شکیل اور زہرا کے ہاں بہت سے تجربات مشترک ہیں۔ دونوں نے ایک مضبوط گھر بسانے کے لیے اپنے ماضی کو فراموش کرنے کی اُتم کوشش کی۔ اپنی دانست میں اسے دفن کر دیا کیونکہ عقب سے آتی آوازیں آدمی کا رستہ کھوٹا کرتی ہیں اور کبھی کبھی تو طلسمات کے اس سفر میں کسی صدا پر آدمی مُڑ کے دیکھے تو پتھر کا ہو جاتا ہے۔ مگر مضبوط اور فصیل نما چاردیواریوں سے گھر سے گھر اور محل آسا مسکنوں میں ایک ہلکا سا تلازمہ پورے ماضی کو اسی طرح تروتازہ۔ زندہ۔ جیتا جاگتا۔ حافظے میں یوں لے آتا ہے گویا کبھی جدا ہی نہ ہوا تھا۔ عورت اپنے ماضی سے بہت زیادہ وابستگی رکھتی ہے۔ شاید اس لیے کہ اس میں اس کے میکے کی مہک بسی ہوتی ہے۔ اور میکہ کیسا بھی ہو۔ مفلس یا شاہانہ۔ عورت کی روح کا خزانہ تو وہ وہیں ہوتا ہے۔ اک جنت گم گشتہ کہ جس کی یاد اس کے نخل دل کو تروتازہ رکھتی ہے۔ وہ اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہتی۔ اور مرد ماضی کے ساتھ اس کی وابستگی کو ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ زہرا کی نظم۔ یہ ہوا کا جھونکا۔ ماضی حال اور مستقبل کو اک اکائی کی صورت دیکھنے کی سعی ہے۔

یہ ہوا کا اک جھونکا
یہ ہوا کا اک جھونکا
دوریوں کے صحرا سے
فاصلوں کے جنگل سے

روز شام آتا ہے
کتنے بیتے لمحوں کے
آئینے دکھاتا ہے
تم کو چھو کے آتا ہے

میرے گھر کے آنگن کی
نرم گرم مٹی کو
جس میں ذرّے چاندی کے
کس طرح چمکتے تھے
یہ ہوا کا اک جھونکا
تھم کے چھو کے آتا ہے
ان گھروں کے در دیوار
جن کے سائے میں، میں نے
زندگی کا ہر دکھ سکھ
کس طرح سے کھویا ہے
کس طرح سے پایا ہے

اسی طرح اس کی نظم ''گل چاندی'' ہے جس میں ماضی کی یادیں رگ ریشے میں جڑیں پکڑ چکی ہیں۔

شبنم اور زہرا کا ایک اور مشترک موضوع شادی شدہ زندگی میں حاصل ہونے والی آسائشیں اور فارغ البالی ہے۔ عورت اس کی شدید خواہش رکھتے ہوئے بھی یہ محسوس کرتی ہے کہ دراصل اس سے اس کی انا اور شخصی آزادی کا سودا کیا گیا ہے۔ شبنم نے اس کو سونے کا قفس کہا ہے۔ جبکہ زہرا کے لیے بھی یہ آسائشیں اس کے ضمیر کی پاکیزگی اور روحانی آزادی کے راستے کا پتھر ہیں۔ اپنی نظم ''سوچتی ہوں اپنے رستے لوٹ جاؤں'' کے اختتام میں وہ تذبذب میں گرفتار ہے۔

روح سے رسموں کی زنجیریں تڑالوں گی مگر
جسم کی آسائشوں سے کس طرح دامن چھڑاؤں
کس طرح میں اپنے رستے لوٹ جاؤں!

جگ مگ جگ مگ سونے جیسا
گھر سب کی نظروں میں آیا
بھیگا آنچل، پھیلا کاجل
کس نے دیکھا کس نے چھپایا

ان احساسات کی بہترین مثال نظم 'میری سہیلی' ہے۔ ایک ہمزاد جو زہرا کی اپنی ہی پرانی ذات ہے۔ اس کو اس کی سُپر اا یگو کہہ لیں۔ ضمیر کہہ لیں۔ جو ماضی کی زہرا کی تجسیم ہے۔ اور رات کی تنہائی میں حال کی زہرا کے شاندار گھر میں اس کا کروفر دیکھنے چپکے سے آتی ہے اور اسے احساس دلاتی ہے کہ اس تمام دولت اور شہرت کے بدلے اپنے اصول، صداقتوں اور رفاقتوں کا سودا بڑے خسارے کا سودا ہے۔

مری سہیلی وہ ساتھ کھیلی، وہ میری باتوں کو جانتی ہے
وہ زیرِ لب مسکرا کے آہستگی سے ہر بات مانتی ہے
وہ مجھ سے کہتی ہے آؤ ہم پھر 'بتاؤ بوجھو' کا کھیل کھیلیں
تمہارا کیا ہے کہ اس جہاں میں سہولتیں ہیں حقیقتیں ہیں
حقیقتوں کا وجود کیوں ہے؟ سہولتوں کی نہاد کیا ہے
صداقتوں کے اصول کیا ہیں؟ رفاقتوں کا جواز کیا ہے

سہولتوں کی جبیں پہ روشن ہیں مرے آنسو یہ' مانتی ہو؟
حقیقتوں کے لہو میں شامل ہیں خواب میرے یہ جانتی ہو؟
رفاقتوں کا جواز' میرا فراق ' میری جدائیاں ہیں
صداقتوں کے اصول میری ہی بھولی بسری کہانیاں ہیں
تمہارے خوابوں کی پاسباں میں ہوں میری یادوں کو تم سنبھالو
جو ہو سکے تو یہ ساری چیزیں جو تم نے دکھلائی ہیں اٹھا لو

ہماری شاعرات نے اعلیٰ انسانی اقدار کے ساتھ محبت کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں قائم ودائم رکھنے اور فروغ دینے کے تصورات بڑے تسلسل اور مستقل مزاجی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ جمہوریت، آزادی فکر و خیال مساوات، عالمگیر امن و اخوت۔ احترام آدمیت ان کے آدرش رہے ہیں۔ انہیں یہ بھی کہ احساس ہے کہ وہ ان مقاصد کے لیے کوئی بڑی جنگ نہیں لڑ سکیں ہاں ان کا علم بلند رکھنا بھی عورت کے لیے بہت بڑا معرکہ ہے۔ اب وہ انہی اقدار کی محبت اور حریت فکر وعمل کے یہ خواب اپنے بچوں کو منتقل کرنے کی تمنا کرتی ہیں۔ جو کچھ ہم حاصل نہ کر سکے ہمارے بچوں کا مقدر ہو گا۔ ہم ان کو ایک بہتر دنیا میں چھوڑ کر جائیں گے۔ زہرا کی نظم جرم وعدہ دیکھئے اور یہ الفاظ۔

مجھے اقرار تھا
میں خاک ہوں
تم حسن وزیبائش
میں خوف ہوں
تم امن وآسائش
میں ماضی ہوں
تم صورت فردا فروزاں ہو
میں شکل ہوں
تم صورت امید آساں ہو!

اسی طرح ایک اور نظم ''ذرا سا فرق ہے۔ اس نوجوان نسل پر اپنی ساری امیدیں لگاتی ہیں۔

مرے چھوڑے ہوئے اس راستے پر
کوئی مری طرح سے چل رہی ہے
مگر مجھ میں اور اس میں اک ذرا سا فرق ہے

اور کیسا اچھا فرق ہے
مرے قدموں تلے اک ارتعاشِ بے یقینی ہے
وہ اپنا راستہ پہچانتی ہے

زندگی کا منظر نامہ بڑی تیزی سے بدلتا ہے۔ تغیر ہی ایک حقیقت ہے زہرا اپنے دوسرے مجموعے ورق میں اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ بالآخر سارے تصورات سراب ثابت ہوتے ہیں۔ اک عمر آتی ہے کہ ہر شے سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ عورت جس گھر بار کے ساتھ اتنی محبت کرتی ہے اور جس کے لیے اپنی جان کھپاتی ہے وہ بھی دراصل شوہر کی ملکیت ہے۔ وہ جن آرزوؤں پر زندگی بتا دیتی ہے وہ نقش بر آب سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ اس کی اپنی ہستی بھی کچھ بھی نہیں۔ مذہب نے بھی اسے کوئی تحفظ نہیں بخشا۔ صرف لفظ اس کی پوری زندگی تہہ و بالا کر سکتے ہیں۔ بچے بھی ماں سے دور ہو کر دنیا کی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں ۔ ماں باپ بہن بھائی سب اپنے اپنے راستوں پر گم ہو جاتے ہیں۔ اور بڑھاپے کا بھاری پتھر ہمارے راستے مسدود کر دیتا ہے۔

بڑھاپے کا تجربہ شاعرات کا ایک اہم موضوع ہے۔ ہماری کلاسیکی شاعری تمام کمال شباب کی شاعری ہے۔ بڑھتی عمر اور بڑھاپے کا تجربہ اس میں تقریباً مفقود ہے۔ کہیں ادھر ادھر ایک آدھ شعر نظر آ جاتا ہے۔ غالب نے عناصر میں اعتدال کے فقدان کی شکایت ضرور کی ہے۔ آتش نے بھی عمر رفتہ کو آواز دی ہے۔

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ باتیں ہیں تب کی کہ آتش جواں تھا

عصرِ حاضر کی شاعری میں عمر کے اس حصے کا تذکرہ موجود ہے۔ منیر نیازی نے اس میں ایک نئی جہت نکالی ہے اور شباب کو ایک عذاب بتایا ہے۔ اور اس کے رخصت ہونے پر کمال اطمینان کا اظہار کیا ہے۔

عورت کے لیے بڑھاپا یا محض عمر کٹنے اور موت سے قریب تر ہونے کا نام نہیں۔ یہ ایک ایسی تبدیلی ہے جو اس کی پوری ذات کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس کے نظام

جسم میں کچھ ایسی واضح تبدیلیاں آنی شروع ہوتی ہیں جو اس کی پوری نفسیات اور شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ سن یاس عورت کی عمر کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس عمر تک عام طور پر عورت بچوں کی پیدائش پرورش اور دیگر ذمہ داریوں سے فارغ ہو چکی ہوتی ہے۔ اب اسے ذہنی طور پر فرصت ہوتی ہے۔ اور وہ کچھ وقت اپنے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے یہ سن یاس نہیں سن آس ہوتا ہے کہ وہ زیادہ بے فکری کے ساتھ اپنے ذاتی مشاغل میں مہمک ہونا چاہتی ہے۔ اس طرح اس حصہ عمر کو زیادہ سے زیادہ بار آور بنانا چاہتی ہے۔ مگر پھر بھی بہت سے خلفشار اس کے منتظر ہوتے ہیں۔ اس کے خون میں نسائی عرق ایسٹروجن کی کمی طرح طرح کی اعصابی اور جسمانی بے آرائیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ رات کی رات میں اس کی جلد خشک اور بے رس ہو کر جیسے خزاں زدہ پتوں کی طرح جھڑنے لگتی ہے۔ جھریاں بڑی تیزی کے ساتھ چہرے پر جال بچھانے لگتی ہیں۔ بال نایاب ہونے لگتے ہیں اور جسم ایک ملبے کی صورت میں ڈھلنے لگتا ہے۔ ہڈیاں گھلنے پر تیار رہتی ہیں۔ اور یوں جسم و جاں کا نقشہ مہندم ہونے کے کنارے آن لگتا ہے۔ آواز کی مٹھاس اور سریلا پن مائل بہ کرختگی ہو جاتا ہے۔ یہ صورت حال اس کی سیلف امیج کو بری طرح مجروح کرتی ہے۔
مسئلہ یہ ہے کہ معاشرے میں عورت کی قدر و قیمت اس کے سراپا اور مرد کی اس کی اقتصادیات سے مشروط ہے۔ عورت اپنی بادشاہت کے خاتمے پر بہت بڑے ذہنی دھچکے سے دوچار ہوتی ہے۔ آئینہ ہر روز اسے ایک نئی شکستگی کی خبر دیتا ہے۔ اس صورت حال کو وقار اور حوصلے کے ساتھ قبول کرنا اور بتدریج ظہور پذیر ہونے والے زوال کے ساتھ فراخ دلی سے نباہ کرنا بڑی قوت ارادی اور اعتماد کا متقاضی ہے۔ ہماری شاعرات نے عورت کے اس تجربے میں بڑی جہات پیدا کی ہیں۔ انہوں نے جسم کے اس زوال کو نہ صرف بڑی فراخدلی سے قبول ہی کیا بلکہ اس میں نیا حسن اور مثبت پہلو بھی دریافت کیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جسم کے ساتھ عورت کا ذہن اور اس کی روح زوال پذیر نہیں ہوتی بلکہ اپنی جودت اور تازگی برقرار رکھتی ہے۔ وہ عہد رفتہ کو یاد ضروری کرتی ہے مگر اپنے حال سے مطمئن اور مسرور ہے۔ زہرا کی نظم دیکھیے جس میں عورت کی روح وقت کے سامنے ہار ماننے کو تیار نہیں۔

اب تو کچھ ایسا لگتا ہے

اب تو کچھ ایسا لگتا ہے — سارا جگ مجھ سے چھوٹا ہے
آنکھیں بھی مری بوجھل بوجھل — شانوں پر بھی کچھ رکھا ہے
کاتب وقت نے جاتے جاتے — چہرے پر کچھ لکھ سا دیا ہے
آئینے میں چہرہ کھولے — دیکھ رہی ہوں کیا لکھا ہے
لکھا ہے ترے روپ کا ہالہ — اور کسی کے گرد سجا ہے
لکھا ہے زلفوں کا دوشالہ — اور کسی نے اوڑھ لیا ہے
لکھا ہے آنکھوں کا پیالہ — کہیں کہیں سے ٹوٹ رہا ہے
پڑھ کر مصحف رخ کی عبارت — دل کو اطمینان ہوا ہے
اس کو شاید علم نہیں ہے — میرا دامن اب بھی بھرا ہے
جو رکھنا تھا' رکھے ہوئے ہوں — جو دینا تھا بانٹ دیا ہے

بڑھاپا اس وقت تک ہمیں خوفزدہ کرتا ہے جب تک ہم اسے قبول نہیں کرتے مگر ایک بار اس سے دوستی کرلو تو اس سے اچھا دوست کوئی نہیں۔ وہ آدمی میں اپنے اوپر سہنے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے اور جوانمردی کا محرک بنتا ہے۔ اس طرح زہرا معمر عورت کے عز و وقار میں اضافہ کرتی ہے۔ قدرت وہ سب کچھ ایک ایک کر کے واپس وصول کرنا شروع کرتی ہے جو اس نے یکمشت بے مانگے اور بے دام دیا تھا۔ انسان کا جھکتا جسم زمین کی کشش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور ایک بے نام تھکن ہمیں ابدی آرام کے لیے تیار کرتی ہے۔ اب وقت ہے کہ حاضرین محفل سے اجازت لیں۔ آمین۔

ہم نے دیکھا کہ شاعرات کے کلام میں ایک معتد بہ حصہ عصری مسائل اور سماجی تنقید کا بھی ہے۔ آج کی شاعرہ صرف قافیہ پیمائی اور تخیل کی کارفرمائی میں پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ پوری دنیا کے حالات اسیر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ قومی اور بین الاقوام صورت حال' ذاتی مسائل سے کم اہم نہیں ہیں۔ ان سے چشم پوشی ممکن نہیں۔ خصوصاً برقی میڈیا کے اس دور میں جب دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ یوں تو تحریک پاکستان کے ساتھ ساتھ ہی عورت نے قومی مسائل و معاملات میں فعال کردار ادا کرنا شروع کر دیا

تھا۔ قیام پاکستان کے بعد تعلیم اور تجربے نے عورت کے شعور آگہی کو جلا دی۔ اور اب پاکستانی عورت اپنے آپ عورتوں کی عالمی برادری کا ایک ذمہ دار رکن سمجھتی ہے۔

وطن میں آنے والے تمام سیاسی و معاشرتی بحرانوں نے شاعرات کو براہ راست متاثر کیا ہے۔ قیام سے لے کر اب تک ہمارا ملک بڑی بڑی آزمائشوں اور آفتوں کی زد پر رہا ہے۔ جو مملکت اخوت جمہوریت مساوات اور سلامتی کے نام پر حاصل کی گئی اس میں یہی سب کچھ نایاب رہا۔ خود غرضی۔ صوبائی اور نسلی تعصب۔ صنفی تعصب۔ مذہبی تنگ نظری۔ فرقہ پرستی۔ قبیلہ نوازی۔ سب نے مل کر عام آدمی کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ خاص طور پر کراچی مسلسل کئی برس اس دشت گردی کا شکار رہا ہے۔ عروس البلاد۔ روشنیوں کا شہر کراچی کو معلوم نہیں کس حاسد کی نظر لگی کہ وہاں امن و امان خواب و خیال ہو کے رہ گیا۔ سب سے بڑا ظلم یہ کہ قاتل بھی خود مقتول بھی خود۔ زہرا کی شاعری کا ایک معقول حصہ ان حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی نظمیں۔ مسلم مسلم فسادات۔ ڈاکو۔ بھیجو نبی جی رحمتیں۔ اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

بھیجو نبی جی رحمتیں

اک گھر تھا' اک میدان تھا
کچھ کھیت تھے' کھلیان تھا
وہ گھر میں تنہا تو نہ تھی
ہانڈی تھی چولہے پر چڑھی
آٹا گندھا تیار تھا

جھولے میں اک بچہ بھی تھا
پنجرے میں اک طوطا بھی تھا
اور طاق میں قرآن تھا
جس پر اسے ایمان تھا

بچے کو بہلاتی تھی وہ
چولہے کو سلگاتی تھی وہ
طوطے کو سکھلاتی تھی وہ
''اچھے میاں مٹھو کہو''

بھیجو نبی جی رحمتیں
بھیجو نبی جی رحمتیں
آلِ نبی کا واسطہ
آلِ نبی کا واسطہ
اک دن اچانک کیا ہوا
ٹھوکر سے دروازہ کھلا
اک جانور انساں نما
پنجوں کو لہراتا ہوا
کمرے میں آتا ہی گیا
ہر شے پہ چھاتا ہی گیا
چادر جو سر سے کھنچ گئی
قرآں کا چہرہ ڈھک گئی
روٹی توے پر جل گئی
ہانڈی ابل کر رہ گئی
بچے کا جھولا گر پڑا
طوطا پھڑک کر چیخ اٹھا
بھیجو نبی جی رحمتیں
بھیجو نبی جی رحمتیں
آلِ نبی کا واسطہ

آل نبی کا واسطہ
پر کوئی آیا ہی نہیں !

زہرا کے ہاں مغربی سامراج کے خلاف صدائے احتجاج ہے جس نے مشرقی کمزور اقوام کو اپنی تجارتی منڈی بنا ڈالا۔ اور انہیں غربت اور قرض کے ایسے شکنجے میں کس ڈالا کہ جس نے ان کی سانسوں کو بھی ہچکیوں میں بدل ڈالا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زہرا عصر حاضر کی ایک خود آگاہ اور جہاں آگاہ شاعرہ ہے جس کے ہاں روایت اور تجربے کے اشتراک سے ایسے اشعار کی تخلیق ہوتی ہے جو فرد اور معاشرے کے ترجمان ہیں۔ اس کا امتیاز وہ نسائی حسیت ہے جس نے اس کے شعر کو ایک منفرد دلکشی بخشی ہے۔ جذبے اور شعور و آگہی کا تال میل اس کی شاعری کا سنگِ بنیاد ہے۔

کشور ناہید

سرکاری عہدہ دار، منتظم، مدیرہ، مقررہ، آزادیٔ نسواں کی داعی، کالم نگار اور ان سب پر مستزاد شاعرہ۔ ان صفات کے جداگانہ تذکرہ کا مطلب یہ امر اجاگر کرنا ہے کہ یہ سب رنگ مل کر اس کی شخصیت کی وحدت کی تشکیل کرتے ہیں۔ ''موزیک کی مانندان میں سے کسی ایک صفت اور اس سے وابستہ مخصوص احساساتی رنگ ختم کرنے سے اس کی شخصیت کی وحدت مجروح ہو جائے گی۔ اس لیے کہ یہ تمام رنگ ہی کشور ناہید کی شاعری کے لہجے اور اسلوب کا تعین کرتے ہیں۔

آصف فرخی کو دیئے گئے انٹرویو میں کشور ناہید کہتی ہیں:

''میرا ایک نفسیاتی احساس کہ ہمارے محروم معاشرے میں مجھے کیا کیا نہیں مل رہا اور کیوں نہیں مل رہا اور مجھ سے مراد ہے میرا طبقہ، میری کلاس، جس میں عورت مرد دونوں شامل ہیں۔ اب جیسا کہ ماؤ نے کہا تھا کہ اگر مرد پر تین قدغنیں ہیں تو عورت پر چار ہیں اور چوتھی قدغن مرد کی قدغن ہے جو انتہائی شدید ہے''

اس انٹرویو میں کشور ناہید نے اپنی شاعری کے بارے میں بتایا:

''۔۔۔۔ جس جذبے کا اظہار میں اپنے انداز میں کرسکتی ہوں، اس کو کرتے ہوئے جب میں کہوں گی تو اس میں عورت کا اظہار ہوگا، عورت سے مراد خانوں میں بانٹنا نہیں ہے بلکہ یہ وہ فرد ہے جس کی زبان سے آپ نے گیت لکھے۔ جس کی زبان سے آپ نے پورا ادب تخلیق کیا وہ جب اپنی زبان سے کچھ کہے کہ ادب تخلیق کرتی ہے تو آپ سنیں تو سہی کہ وہ جب راشد الخیری کی ہیروئن نہیں بنتی۔ وہ جب ایسی صورتِ حال میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ کیا بات کرتی ہے، کیسے اپنے تجربوں کو بیان کرتی ہے۔ provoking

اندازنہیں تھا یہ sensational نہیں تھا۔ یہ سنسنی خیز رویہ نہیں تھا اس میں attitude
کا رویہ تھا کہ مجھے زنجیروں میں بٹھا کر آپ اسے میری Pathos اور experience
تقدیر کہیں، میرے ساتھ جو منافقت ہو رہی تھی کہ غلامی کو تقدیس کہنا، عورت کے سر نہ
اٹھانے کو پاکیزگی کہنا وہ ساری باتیں فیوڈل ضابطۂ اخلاق کی ہیں جوان لوگوں کو Suit
کریں۔ ان کو میری عصمت پروری کا نام دے کر جو میرے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے اس کے
بارے میں بیان کرنے کے لیے میرے پاس شاعری تھی اور میں نے شاعری کی''

(نئے زمانہ کی برہن۔ ص ۲۶۰۔۲۶۲)

اس اقتباس کے ساتھ نظم ''مکافات'' شامل کرلیں تو کشور کی شاعری کی اساس واضح ہوجاتی ہے۔

میں شاعری کرتی ہوں
کیونکہ میں نے خودکشی نہیں کی
میں زندگی کرتی ہوں
کیونکہ میں نے دلبری نہیں کی
میں نوکری کرتی ہوں
کیونکہ میں نے سرداری نہیں کی
میں آگے ہی آگے چلتے رہنا چاہتی ہوں
کیونکہ پیچھے مڑکر ویرانی نقش پا دیکھنے کی ہمت نہیں ہے
میں!!
میں ناگفتنی کرتی ہوں
کیونکہ میں نے گفتنی نہیں کی (''گلیاں دھوپ اور دروازے)

''گلیاں دھوپ دروازے'' کی پہلی نظم ''کشور ناہید'' بھی اسی انداز کی ایک اور نظم ہے۔ ذات وصفات کی مظہر ہے۔

''عمر کے اڑتیں برس

تمہارے بالوں اور گالوں میں
اترتی خزاؤں
اور ڈھلتے جذبوں کی آندھیوں میں
کچے ٹوٹتے پھلوں کی طرح
سارے رشتے
زندگی کے چندن رُوپوں کی طرح
گدرا گئے ہیں
کشور ناہید!
تم منہ بند سیپی کی طرح
زندگی کے سمندر میں
ہواؤں سے باتیں کرتے
پہاڑوں کی بنیاد ہلاتے
اور لہروں کو اپنے بالوں کی طرح کاٹ کر
ساحل پہ
گزشتہ کی روایتی
اور آج کی مضطرب
عورت بن کر سوچ رہی ہو

کشور ناہید زُود نویس۔۔۔ ''لبِ گویا'' ''بے نام مسافت''، ''نظمیں''، ''گلیاں دھوپ دروازے''، ملامتوں کے درمیان، سیاہ حاشیہ میں گلابی رنگ''، خیالی شخص سے مقابلہ'' اور میں پہلے جنم میں رات تھی'' ان مجموعوں پر مشتمل ۱۱۳۱ صفحات کا کلیات ''دشتِ قیس میں لیلیٰ'' (۲۰۰۱ء) اس کی پر گوئی کا بین ثبوت ہے۔

کشور ناہید جن امور میں معاصر شاعرات (بلکہ بیشتر شاعروں سے بھی) سے جداگانہ نظر آتی ہے وہ ہے اس کا کثیر المطالعہ ہونا۔۔۔ بین الاقوامی ادب بالخصوص شاعری کا مطالعہ چنانچہ یورپین شعراء کی نظموں کے تراجم کے ذریعہ سے وہ قارئین کو بھی بین

الاقوامی شاعری کے ذائقہ سے روشناس کر رہی ہے۔ جو بذاتِ خود بڑی بات ہے اس لیے بھی کہ غالباً کسی ناقد نے کشور ناہید کی شاعری کے اس پہلو کی طرف توجہ نہ دی۔ جبکہ یہ تراجم اس لیے بھی قابل توجہ ہیں کہ کشور کی سوچ کے (بالواسطہ طور پر) مظہر قرار پاتے ہیں۔ ''دیس بدیس کی نظموں کے نثری تراجم'' پر مشتمل مجموعہ ''نظمیں'' میں اس نے پابلونرودا (چلی) الیگزینڈر بلاک اور آندرئی وزنی سنسکی (روس/ جارج سیفیرس (یونان) کینتھ پیچن (امریکہ) لیوپوند سیداد سینگھور (سینیگال) فروغ فرخ زاد (ایران) براگووئ یوپ (سنیگال) کے علاوہ رومانیہ (۱۸) بلغاریہ (۸) اور چین (۴) کے شاعروں کی نظموں کے تراجم بھی کیے۔ غیر ملکی شعراء/ شاعرات کی یہ فہرست خاصی مرعوب کن ہے البتہ تعجب خیز ہے کہ اس نے خودکشی کرنے والی امریکی شاعرہ سلویا پلاتھ کی نظموں کا ترجمہ کیوں نہ کیا کہ بعض اوقات اپنے انداز و اسلوب میں کشور ناہید سلویا پلاتھ سے مشابہہ نظر آتی ہے۔

۷۹ غزلوں پر مشتمل پہلے مجموعے ''لبِ گویا'' (۱۹۶۹ء) کی طرف اس مجموعے کے اس شعر نے خاصی شہرت حاصل کی تھی اور ناقدین بالعموم اس شعر کا حوالہ دیتے پائے گئے۔

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت

''لبِ گویا'' کی اشاعت کے وقت کشور ناہید ۲۹ برس کی تھی (تاریخ پیدائش' بلند شہر ۱۸ جون ۱۹۴۰ء)۔۔۔اس نے زمانہ طالب علمی کی شاعری سے صرفِ نظر کیا ہوگا ویسے بھی ٹین ایجر کی جذباتی سنسنی پر مبنی شاعری اس نے کی بھی نہ ہوگی ٹین ایجر ہونے کے باوجود بھی کہ emotionalism اس کے مزاج سے موافقت نہیں رکھتا۔

''لبِ گویا'' کی غزلوں میں وہ عورت نظر نہیں آتی ہے جو انٹلیکچویل یا activist ہے' مگر عورت پن کے اظہار میں بھی ندرت اور اپج ملتی ہے۔ ''بے نام مسافت'' اور ملامتوں کے درمیان' کی نظموں میں جس فرسٹریشن اور اس کی پیدا کردہ تلخی کا واشگاف اظہار ملتا ہے۔ ابھی اس نے شعری مزاج میں رنگ آمیزی نہیں کی تھی۔ لیکن ''نہ ہونے'' کا احساس اور '' کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے'' کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ''لب

گویا' پر لکھنے والوں نے بالعموم زرد اوڑھنی قسم کے اشعار کے حوالے دیے حالانکہ کشور نے یہ بھی کہا۔

سنبھل بھی لیں گے، مسلسل تباہ ہوں تو سہی
عذابِ زیست میں رشکِ گناہ ہوں تو سہی

آنکھوں کے آئینوں کا تو پانی اتر گیا
اب جسم چوبِ خشک ہے یہ سانحہ بھی دیکھ

وہ بھیڑ ہے کہ شہر میں چلنا محال ہے
انگلی پکڑنا باپ کی بچہ نہ بھول جائے

میں کہ ہوں شوخ طبیعت ناہیدؔ
کتنے طوفاں مرے اندر ٹھہرے

ناہید خونِ دل میں قلم کو ڈبو کے آج
لکھی ہے داستانِ الم مدتوں کے بعد

سجا کے روز نئی محفلیں، نئے چہرے
زرِ فسردہ دلی کو اجالتے رہیے

یہ صرف چند اشعار ہیں اور یہ بھی کسی شعوری انتخاب کا نتیجہ نہیں ہے۔ جبکہ اس انداز کے اشعار کی 'لبِ گویا' میں کمی نہیں 'لبِ گویا' کے تناظر میں میری غزلوں، نظموں اور نثری نظموں اور خود ۶۴ سالہ کشور ناہید کو دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ اس نے زندگی اور زمانہ سے موضوعات کے انتخاب میں سلیقے سے کام لیا اور کامیاب اظہار کے لیے ہیئت میں تنوع کی سعی اور اسالیب میں تجربات بھی کرتی رہی ہے لیکن ان کی شاعری کا مرکز

محور عورت ہی رہی ہے۔ جس طرح وہ اپنے کالموں میں عورت پر ڈھائے گئے مظالم پر احتجاج کرتی ہے اسی طرح تخلیقی سطح پر بھی وہ شعر کو احتجاج میں تبدیل کر دیتی ہے۔ جیسے ''بے نام مسافت'' کی یہ نظمیں ''شکستِ رنگ''، ''آ گہی''، ''عکس نما''، ''نفی''، ''عروسی''، ''خود اذیتی''۔۔۔۔گلیاں دھوپ دروازے'' کی یہ نظمیں ''لگا تو مجھ جیسی ہے''، ''جاروب کش''، ''قیبر''، ''میری مانو''، ''نظم''، ''سن ری سہیلی''، ''کلیرنس سیل''، ''چوبِ خشک'' اور ''آگ''، ''زخمی پرندے کی چیخ''، ''ہڈ بیتی''، ''اے کاتبِ تقدیر لکھو!'' ''میں کون ہوں؟'' یہ تو صرف دو شعری مجموعوں سے کچھ ایسی نظموں کے عنوانات ہیں جو شاعرہ کی کتابِ شعر کے بھی عنوانات قرار پاتے ہیں۔

ان یا ان جیسی نظموں پر لکھنے کا موقع نہیں کہ یہ مختصر مضمون ان نظموں کے موضوعات و مسائل اور ان سے وابستہ کشور کی مخصوص سوچ کے تجزیاتی مطالعہ کا متحمل نہیں ہوسکتا تاہم اس امر کی طرف ہم ضرور توجہ دلانی چاہیں گے کہ کشور ناہید کی بعض نظموں میں ''ماں'' خاص مفہوم کی حامل علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ اس نے جب بھی ماں کا ذکر کیا تو ماں اور ماما سے وابستہ روایتی انداز اور ماں کے پیروں کے نیچے جنت ہوتی ہے جیسے کلیشے میں بات نہیں کی بلکہ یہ نظم اس نے ماں کے حوالے سے جبر، ستم برداشت او راستحصال کی بات کی (بصورت بیوی) ماں سب دکھ سہتی ہے۔

ملاحظہ کیجئے ''آ گہی'' سے یہ چند سطریں:

''پلے تھے ہم کوٹھڑی کے اندر
کہ جس کی دیوار ٹیڑھی ہو کر
ہزار کونوں میں بٹ چکی تھی
کہ جس کی کڑیاں ہماری ماں کی کمر کی صورت جھکی ہوئی تھیں
ہماری ماں نے ہمیشہ روٹی پکائی ایسے
کہ ایک تھا پیٹ میں تو اک
گود میں ہمکتا

مگر نہ حرفِ گراں کبھی اس کے لب پہ آیا
اگر یونہی میری ماں کی صورت
مری کمر بھی جھکی تو کوئی نہ ساتھ دے گا
نہ ماںتا کہ مزار پر فاتحہ پڑھے گا
(''بے نام مسافت'')

اسی ضمن میں اسی مجموعہ کی ''زخمی پرندے کی چیخ''، ہڈ بیتی'' ''اے کاتبِ تقدیر لکھ'' کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

''خیالی شخص سے مقابلہ کی نظم'' ''میں تمہاری ماں ہوں'' بھی قابل توجہ ہے جبکہ ''اپاہج ماں ممتا کی گولڈن جوبلی'' میں وہ خود ماں بن کر وطن کی مٹی سے اپنی تطبیق کرتے ہوئے کہتی ہے۔

''میری سنو
میں تم سے مخاطب ہوں
میں پاکستان ہوں
تمہاری ماں مٹی!
میری بیٹی سنو
مجھے میرے سفید بالوں کا وقار واپس لوٹا دو
مجھے میری کوکھ میں پلنے والا امن واپس لوٹا دو
اٹھو! میرے بچو! میں تم سے مخاطب ہوں
ماں! بھلا اور کس سے بات کر سکتی ہے!''

ان نظموں کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے وہ پہلے ذاتی حوالے سے بات کرتی ہے لیکن وقت گزرنے اور حالات وحوادث (ذاتی کم' اجتماعی زیادہ) اور

بالخصوص کباب سیخ جیسی کروٹیں لیتی پاکستان کی تاریخ یہ سب ماں سے وابستہ مفاہیم میں تبدیلیاں پیدا کرتے جاتے ہیں۔ یوں کہ ماں پاکستان کی علامت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

کشور ناہید جس آسانی سے نظمیں کہہ لیتی ہے اسی سہولت سے غزلیں بھی اور اس کی غزلوں میں بھی وہی عصری شعور نظر آتا ہے جو اس کی نظموں کی اساسی خصوصیت ہے چند اشعار پیش ہیں:

کی تھی حرام خود کشی میرے خدا نے کیوں
بے وجہ زندگی کا سفر کاٹنا پڑا
(''لبِ گویا'')

بندھے ہیں پیٹ سے بچے بھی اور پہرے بھی
زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھ کر جانا

دیوانوں کی پہچانیں ہیں
سنگ سلاخیں اور کٹہرے

سمندروں کا عروج پھر ریت بن گیا ہے
شہابِ ثاقب میں رات تفسیر دیکھتی ہے

میں اپنے بھی خورشید بجھا کر کہاں نکلوں
بے ماجرا ہونٹوں کو تو نوحہ نہیں ملتا

نمائشوں میں رکھی آنکھ ڈھونڈتی ہے انہیں
جو لوگ اپنے لہو کے نشاں پہ زندہ ہیں

اس وقت میرے دیس کی عورت کے ہاتھ پر
خاکستری ردائے برید ہ بھی تیز ہے

میں اپنے ہاتھ کاٹوں اس کو دے دوں
یہ دعوت، قیمتِ کمخواب میں ہے

سودا تھا جلدی چلنے کا، آنکھ بھی رکھنی تھی
ان نیزوں پر جن کی کماں گردن محراب ہوئی
("خیالی شخص سے مقابلہ")

اور آخری شعر کشور ناہید کے ادبی آدرش کے مظہر:
بہت دنوں کی گھٹن شعر میں ڈھلی ناہید
بہت دنوں میں کھلا شہر میں دوانہ نہیں

معنی کے سارے رنگ ہیں تیغِ برہنہ سر
لفظوں کی کیفیت مگر کمخواب کی سی ہے

فہمیدہ ریاض

فہمیدہ ریاض ۱۹۴۶ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ سندھ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ شادی ۱۹۶۵ء میں ہوئی۔ شاعری کا پہلا مجموعہ ''پتھر کی زبان'' ۱۹۶۷ء میں آیا۔ اس کے بعد بدن دریدہ۔ دھوپ۔ کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے۔ ہمرکاب اور آدمی کی زندگی' بالترتیب شائع ہوئے۔ کلیات ''میں مٹی کی مورت ہوں'' کے نام سے طبع ہوا۔

فہمیدہ نے جب شاعری کا آغاز کیا تو ترقی پسند تحریک کی ایک لہر ابھی رواں دواں تھی۔ اس کی ہم عصر شاعرات۔ ادا جعفری۔ زہرا نگاہ۔ شبنم شکیل اور پروین شاکر نے غزل کو بطور خاص منتخب کیا۔ لیکن فہمیدہ ریاض نے نظم معریٰ اور آزاد نظم کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس سے اس کے مزاج میں قید و بند سے آزادی کی ایک تحت الشعوری خواہش کا پتہ چلتا ہے۔ خواتین میں وہ پہلی نظریاتی شاعرہ ہے جس میں ایک انقلابی روح نے کروٹ لی ہے۔ وہ نہایت خلوصِ دل سے کارل مارکس اور اس کے نظریات کو انسانیت کا نجات دہندہ تسلیم کرتی ہے اور پاکستانی معاشرے میں بھی ایک ایسے انقلاب کا خواب دیکھتی ہے جو انسان کو انسان کے جبر سے رہائی دے یہ جبر خواہ کسی بھی صورت میں ہو۔ اقتصادی۔ ذہنی۔ اخلاقی! وہ زندگی کی مادی بنیاد کی قائل ہے اور زمینی اور جسمانی تجربات مسائل کو اولین اہمیت دیتی ہے۔

فہمیدہ کے تصورات رفتہ رفتہ ایک ارتقائی صورت میں اپنا اظہار کرتے ہیں۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ پتھر کی زبان رومانوی کرب کی کیفیت سامنے لاتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کا خوب صورت تخیل اپنی پوری رنگینی اور حسیاتی نزاکتوں کے ساتھ یہاں جلوہ گر ہے۔ عورت کے نرم و نازک احساسات اور محبت کے خواب اس کا موضوع بنتے ہیں۔ ان

اشعار میں میری ملاقات اس نوعمر لڑکی سے ہوتی ہے۔ جس کی شخصیت میں اظہار بیان کے راستے میں کوئی جھجک کوئی رکاوٹ نہیں۔ وہ جو کچھ سوچتی، محسوس کرتی ہے بلا خوف وخطر اس کا اظہار کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ زندگی اس کے لیے ایک پر شوق سفر ہے۔ اور پوری دنیا ایک جہان تازہ جہاں قدم قدم پر لذت و مسرت کے چشمے ابلتے ہیں اور حیرتوں کے دروازے کھلتے بند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے پورے حواس بلکہ جسم کے روئیں روئیں کے ساتھ زندہ ہے۔ اور اپنے اطراف کے رنگ، خوشبو، آوازیں۔ لمس اور ذائقے اپنے اندر سمو لینا چاہتی ہے۔ وہ پورا پورا یقین رکھتی ہے کہ کائنات اس کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ فہمیدہ فطری طور پر ایک باغی عورت ہے وہ اپنے موضوعات اور احساسات پر کوئی قدغن شروع ہی سے برداشت نہیں کرتی چلی آئی۔ وہ رسم و رہِ عام سے صرف کلیشے کے طور پر ہٹ کر نہیں چلتی۔ بلکہ یہ اس کا ایقان ہے کہ زندگی تصورات پر نہیں۔ تجربات پر بسر ہونا چاہیے۔

اس کے پہلے مجموعے میں ہمیں ایک ایسی ہی عورت نظر آتی ہے جو روایت کے مطابق نہ تو اپنے عورت ہونے پر شرمندہ اور ملول ہے نہ ہی قہراً اور جبراً اپنے آپ کو قبول کرنے کی قائل۔ وہ اپنی جنس کی قدر دان ہے اور پوری زندگی کے نظام اور اس کے ارتقاء میں اس کے کردار کا گہرا شعور رکھتی ہے۔ ایک مخصوص تہذیب کے ساتھ وابستگی کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں ایک ایسی عورت بھی نظر آتی ہے جو ایک فطری اور غیر مصنوعی صورت میں اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کی رہی ہے۔

پھر بھی ہاتھ بارش کے
مجھ کو ڈھونڈ لیتے ہیں
میرے روئیں روئیں کو
چھو کے چھوڑ جاتے ہیں
ایک لرزشِ پیہم
اب کہاں چھپوں جا کر
جانتی ہوں یہ بوندیں
میرے دل پہ برسیں گی

میری کچی مٹی کو
چوم کر جگا اللہ دیں گی
اس کی سوندھی خوشبو پھر
میں کہاں چھپاؤں گی
لوگ ٹھیک کہتے ہیں
دو بس ایسی چیزیں ہیں
جو کبھی نہیں چھپتیں
ان میں ایک خوشبو ہے

(خوشبو)

ایک نوجوان لڑکی کے رومانی خواب اور دن سپنے اور محبت کی نرم و نازک واردات تہذیبی حوالوں کے ساتھ جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

یہ میری سوچ کی ان جان کنواری لڑکی
غیر کے سامنے کچھ کہنے سے شرماتی ہے
مبہم سی عبارت کے دوپٹے میں
سر جھکائے ہوئے کترا کے نکل جاتی ہے

یہ لڑکی اپنی نظروں میں ہزارا چھوتے خواب چمکائے خود اپنی چوڑیوں کی کھنک سے شرما جاتی ہے۔ اس رومانی سرشاری میں محبت کا خوشگوار تجربہ بھی گھلا ہوا ہے۔ خواب آلود فضاؤں میں سوئے ہوئے گیت۔ اور کسی کے قرب کی نرم سی آنچ۔ سوچ کا اُلجھا ہوا ریشم ڈورا۔ نشے میں جھومتی شب کی طلب انگیز مہک مگر اس کے ساتھ ایک افسردگی کہ محبت کا کوئی لمحہ بھی جاوداں نہیں ہے۔

جھلملاتے ہیں جو احساس میں ننھے جگنو
وقت کی آنکھ میں رہ جائیں گے بن کر آنسو
رات کی رات ہیں یہ سارے جادو

رات اس کے ہاں رومانی طلسم کا استعارہ ہے۔ رات ایک رنگ ہے۔ اک

سنبھالا لیتی ہوں پتھروں کو گلے لگا کر
جو وقت کے ساتھ میرے سینے میں اتنے گہرے اتر گئے ہیں
کہ میرے جیتے لہو سے سب آس پاس رنگین ہو گیا ہے
مگر میں صدیوں سے اس سے لپٹی کھڑی ہوں
ایک اونچی اُڑان والے پرندے کے ہاتھ
تجھ کو پیغام بھیجتی ہوں
تو آ کے دیکھے
تو کتنا خوش ہو
یہ سنگریزے تمام یاقوت بن گئے ہیں
گلاب پتھر سے اُگ رہا ہے

پتھر سے گلاب اُگاتے میں اسے کتنا لہو اُگلنا پڑا ہوگا؟ مگر اس کے قدم ڈگمگائے نہیں۔ حالانکہ وہ جان چکی ہے کہ اعلیٰ انسانی اقدار آج کے معاشرے میں محض کمزور تصورات ہیں جو حقیقت کی ہلکی سی ضرب سے چکنا چور ہو جاتے ہیں۔اس کے باوجود دنیا بڑی خوبصورت اور زندگی بڑی قیمتی ہے۔

سچائی' الفت خودداری
مٹی کے کمزور کھلونے
پل بھر میں ٹوٹ جاتے ہیں
ایسی مقدس جیسے مریم
ایسی اجلی جیسے جھوٹ

اس طرح فہمیدہ ریاض وہ پہلی شاعرہ ہے جس کے ہاں اس عورت کا آرکی ٹیپکل (arche-typical) تشخص نظر آتا ہے۔ فہمیدہ عورت کے منصب اور مسائل کو مقامی اور آفاقی دونوں حوالوں سے دیکھتی ہے وہ فطرت کے مقاصد کی تکمیل اور افزائش اپنا منصب ایک جسمانی اور روحانی سرشاری کے ساتھ ادا کرتی ہے۔ زندگی کے تسلسل کے لیے انسانی مادہ کا کردار محض جبلتی نہیں بلکہ ایک ماورائی جہت بھی رکھتا ہے۔ اس طرح ہمیں

جبلیت کے ترفع یعنی sublimation کی صورت نظر آتی ہے جو تخلیقی فن کی اصل بنیاد ہے۔ سماجی حقیقت نگاری فن کا بہت بڑا منصب سہی مگر صرف یہی فن نہیں۔ یہ صحافت ہے۔ خبر رسانی ہے۔ فن کا طلسم جگانے کے لیے ضروری ہے کہ خبر اپنے سے بلندتر ہو کر اپنے آپ کو transcend کرے۔ اسی طرح وہ خالی نعرے بازی کی سطح سے اٹھ کر انسانی روح کی مفسر ہو سکتی ہے۔۔ فہمیدہ نے جنس اور جنسی تجربے کے تمام متعلقات کو ایک مابعد الطبیعاتی جہت کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ اس کی لفظیات میں حسیاتی شدت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ لمس۔ ذائقہ اس کے اشعار میں دھڑکتی تپش پیدا کرتے ہیں۔ یہ تپش کبھی حیات و موت کی درمیانی سطح پر لے جاتی ہے۔ اور حقیقت اولیٰ جو کبھی عدم اور کبھی ہست میں اپنی جھلک دکھاتی ہے ظاہر ہونے لگتی ہے۔

فہمیدہ عورت کے جسم کو اس کی سائیکی میں بنیادی اہمیت دیتی ہے۔ کیونکہ اسی کے راستے عورت کی روح اور اس کے ذہن کے دروازے کھلتے ہیں۔ وہ جسے ہم تاریکی اور موت سمجھتے ہیں۔ روشنی اور وجود کی سرحد ہے۔ دیکھئے اس کی نظم۔ مرقع۔

ہم نے دیکھی عجب اک ناری
سانولا رنگ جامنی ساری
اور باتوں میں ایسی چنچلتا
چھوٹے رنگوں کی پچکاری
اودی بندیا بھودوں کے بیچ جڑی
اور بھویں رات کی طرح کاری
جیسے کالا ہرن ہو مدھ بن میں
ایسی ہے اس کی آنکھ کجراری
لال ہونٹوں پر ایسی مدرا ہے
ہو گئی جس سے سانجھ متواری
اس کی چمپا کلی گلے میں پڑی
گوری کلیوں کی جھومتی ڈاری

جیسے بدلی میں چاند لیئے ہوں
ایسے کولھوں پہ گھومتی ساری
لال پتھر کی مونگ ناک میں ہے
یا بھبھوکا سی کوئی چنگاری
دیکھو لوگو یہ نار ہے کہ گھٹا
رنگ اور روپ سے بھری ساری
جھکے آکاش جس سے ملنے کو
اسی نرمل دھنک کی اک دھاری

سچ تو یہ ہے کہ فہمیدہ عورت کو مرد کی آنکھ سے دیکھتی ہے۔اس کی شخصیت میں یہ مذکر حسیت بڑی نمایاں ہے اور اس نے animus کو ہنسی خوشی قبول کیا ہے۔ جذبے اور حسیات کی توانائی اس کے رنگوں کے انتخاب میں بھی نظر آتی ہے۔ اس کا پسندیدہ رنگ جامنی ہے۔اُودا ہے کالا اور سرخ ہے۔اس پر ہندی اساطیر کا بھی نمایاں اثر ہے۔عورت کے سراپا میں وہی ہار سنگار نظر آتا ہے جو اجنتا اور مدھوبن کی روایت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بھارت ناٹیم
اُٹھتے ہیں سبک ایڑیوں کے نرم کنول
نازک ٹخنے سے جھانجر ٹکراتی ہے
گج گامنی۔کامنی کمر۔لجاتی چھاتی
مسکاتی ہے۔شرما کے ٹھٹک جاتی ہے
وہ نین اشارہ کر کے جھک جاتے ہیں
مسکان سے بھیگے ہونٹ تھرتھراتے ہیں

اس نظم میں عمل کی عکس بندی جس طرح الفاظ میں کی گئی ہے وہ بڑی نادر شے ہے رنگ۔آواز۔حرکت اور سب سے بڑھ کر ثقافتی مرقع ثقافت جس سے فہمیدہ محبت کرتی اور اس کا برملا اظہار کرتی ہے۔

اس کے ہاں طاقتور۔فطری مظاہر۔مثلاً بھرے ہوئے بادل گھٹا' چڑھتے

سورج۔ کھڑکھڑاتے رتھوں میں بھی ہندی اساطیر کا اثر نظر آتا ہے۔ میگھ دوت اس کی شاعری کی بنیادی خصوصیات سے مزین ہے۔ جس میں پوری کائنات ایک جنسی جذبے سے تھرتھراتی ماورائے جسم لے جاتی نظر آتی ہے۔

اس طرح فہمیدہ نے اردو شاعری میں اس وژن کا اضافہ کیا جو ہمیں ڈی ایچ لارنس کے ہاں نظر آتا ہے اور اس سے مخصوص ہے۔ یعنی لہو کی دانش۔ لارنس کے نزدیک حیات و کائنات میں جنسی جبلت قوت نمو بن کر اظہار کرتی ہے۔ قوت نمو میں اصل حیات ہے۔ یہ ہر شے کو اپنے اظہار اور تسلسل اور ارتقاء پر اُکساتی ہے۔ یہی زندگی کا دوسرا نام ہے اور حقیقت ادنیٰ اس کا قوام ہے۔ صوفیانہ عقائد میں بھی جب کہا جاتا ہے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے تو جنس اور حقیقت کے ربط کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ گو فہمیدہ صرف جبلت کے ترفع پر ہی اکتفا کرتی ہے۔ اس کے بعد کی منازل اور مراحل سے وہ سروکار نہیں رکھتی ملاحظہ ہو۔

ایک عورت کی ہنسی
پتھریلے کوہسار کے گاتے چشموں میں
گونج رہی ہے اک عورت کی نرم ہنسی
دولت طاقت اور شہرت' سب کچھ بھی نہیں
اس کے بدن میں چھپی ہے اس کی آزادی
اس بازار میں گو ہر مال بکاؤ ہے
کوئی خرید کے لائے ذرا تسکین اس کی
اِک سرشاری جس سے وہ ہی واقف ہے
چاہے بھی تو اس کو بیچ نہیں سکتی
وادی کی آوارہ ہواؤ آ جاؤ
آؤ اس کے چہرے پر بوسے دو
اپنے لمبے لمبے بال اُڑاتی جائے
ہوا کی بیٹی۔ ساتھ ہوا کے گاتی جائے

کائنات، فطرت اور عورت کو آپس میں مدغم کر کے فہمیدہ نے اپنی شاعری کو ایک ایسی وسعت بخشی ہے۔ جو روایات کی پابند، معاشرتی بندھنوں میں اسیر عورت کی دنیا سے باہر ہے۔ اس طرح اس کی شاعری میں ایک ایسی باغی عورت نظر آتی ہے جو روایت کے مطابق نہ تو اپنے جسم پر شرمندہ ہے اور نہ ہی اسے گناہ کا مسکن سمجھتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو چھپانے اور دبیز چادروں میں لپیٹنے کی بھی مکلف نہیں۔ وہ اپنے وجد سے مطمئن بلکہ اس میں سرشار ہے اور جانتی ہے کہ دوسرے بھی اس کے وجود کو اسی طرح تسلیم کر کے اس کی توقیر کریں۔ وہ فحاشی کے زمرے میں اس لیے آتی ہے کہ اس نے اپنے جسم کو تسلیم کیا ہے اور صحت مند جبلت کو صحت مند اور ترقی یافتہ دماغ کی دلیل مانا ہے۔ وہ بخوبی سمجھتی ہے کہ عورت کی جو شخصیت وہ اپنے اشعار میں اجاگر کر رہی ہے اس معاشرے کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں۔ جس میں وہ سانس لے رہی ہے۔ بلکہ مجموعی طور پر کسی بھی معاشرے میں قابل قبول نہیں۔ کیونکہ مشرق میں اگر عورت کا جسم احساس جرم کے ساتھ پیوند ہے تو مغرب میں وہ ایک اشتہاری جنس ہے۔ اور عورت کے دماغ اور شعور و آگہی کا تو ذکر ہی کیا وہ مشرق مغرب دونوں میں ناقابلِ قبول بلکہ ناقابل تصور ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک اضافی شے جس کے بغیر گزارہ کیا جائے تو بہتر۔ اس کی نظم اقلیما، دیکھیے جس میں عورت کو ایک ذہن باشعور ہستی تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ نظم مقابلہ حسن میں بھی عورت کو ایک اشتہاری جنس اور محض جسم سمجھنے کے خلاف احتجاج ہے۔

فہمیدہ کی شاعری کو جس طرح محض جنس تک محدود سمجھا گیا ہے وہ فکری تعصب کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اگر روایتی لفظ استعمال کئے جائیں تو ایک حساس تخلیق کار جب تک انفس و آفاق دونوں کی بات نہیں کرتا نامکمل رہتا ہے۔ فہمیدہ فکری لحاظ سے مارکسٹ ہے۔ کارل مارکس اس کا آئیڈیل بھی ہے اور ہیرو بھی۔ وہ سمجھتی ہے کہ دنیا کی تمام خرابیوں کا مداوا مارکسزم ہے۔ مارکس انسانیت کا نجات دہندہ ہے۔ اس نے اپنا مثالی معاشرہ قائم کرنے یا موجودہ استحصالی معاشرہ بدلنے کے لیے عملی میدان میں بھی قدم رکھا ہے۔ وہ اصلاحی معاشرتی اور سیاسی تحریکوں سے بھی وابستہ رہی ہے اور اپنے وطن میں ایک ایسے نظام کی خواہش مند جو مساوات اور عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ جمہوریت جس کا منشور ہو اور جو ہر

طرح سے ظلم و جور سے پاک ہو۔ وہ تمام اقتصادی اور مادی وسائل کا مالک عوام کو سمجھتی ہے۔ وہ غریب۔ پسماندہ طبقے۔ کسانوں اور مزدوروں کے حقوق کی علمبردار ہے۔ استحصال کی ہر صورت کی دشمن۔

اس طرح فہمیدہ سیاست کو زندگی سے الگ نہیں اس کا بنیادی جزو سمجھتی ہے۔ اور تخلیقی فن کا سیاست کے ساتھ گہرا ربط پیش نظر رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک لکھنے والے کا سیاسی حالات سے متاثر ہونا اور ان کے بارے میں اپنی واضح رائے رکھنا بہت فطری ہونے کے ساتھ ساتھ ضروری بھی ہے۔ یہ اس کے لیے ایک فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ حالات بدلنے اور انقلاب لانے پر یقین رکھتی ہے۔ ستم ہائے روزگار کے سامنے ہتھیار ڈال دینے یا شکست خوردہ ہو کر آہ و فغاں۔ نالہ و فریاد کرنا اس کا شیوہ نہیں۔ وہ اہل وطن میں ایسی ہمت پیدا کرنا چاہتی ہے جس سے وہ معاشرے میں بہتری کے لیے تبدیلیاں لا سکیں۔ اپنے حقوق کی حفاظت اور سچ کے لیے ڈٹ جائیں۔ اس کی شاعری کا آہنگ انقلابی ہے مگر وہ نعرہ باز نہیں۔ شاید اردو میں وہ پہلی شاعرہ ہے جس نے نظریاتی طور پر انقلاب اور وہ بھی سرخ انقلاب کے خواب دیکھے ہیں۔ اپنی نظم ساحل کی ایک شام میں وہ اپنے عصر کے نمائندہ ایک بے خانماں مفلس بے یار و مددگار بچے کو ساحل سمندر پر دیکھتی ہے۔

اتنا گمنام اتنا تنہا

بے خانماں سا یہ ایک بچہ
جس کا کوئی گھر کہیں نہیں ہے
جس کی وارث زمیں نہیں ہے
جیسے جھوٹی غذا کا دونا
ساحل پہ کہیں پڑا ہوا ہے
جیسے گیلی ہوا کی زد میں
میلے کاغذ کا ایک ٹکڑا

وہ اس بچے کے اندر نفرت کا زہر اور بغاوت کی آگ بھڑکتے دیکھتی ہے۔ یہ بچہ جو آج اتنا بے ضرر۔ خاموش اور مجبور نظر آ رہا ہے۔ کچھ عرصہ میں اس کے دل میں بغاوت

کی آگ پھوٹے گی جو استحصال اور ناانصافیوں کو جلا کے راکھ کر دے گی۔ جس روز یہ بچہ اپنا حق مانگے گا۔

اس راکھ میں کوئی شرر ہے
شاید شعلہ بھڑک ہی اٹھے
شاید کسی شام ساحلوں پر
لگ جائے شعلوں کا میلہ
شاید یہ سمندروں کے جائے
مٹی سے خراجِ زیست مانگیں

معاشی وسائل پر ناجائز قبضہ کرنے والے سود خوروں اور ظالم دھن والوں کے حلاف ڈٹ جانے کا ایک خواب ہے کہ اس کی شاعری میں لہو کی طرح رواں دواں ہے۔
ملاحظہ ہو۔ تیس جنم ساگر میں

جیون ترا ادھار نہیں تھا
جیون سارا میرا تھا
اس دھرتی پر ہنسی کا ساگر سکھ کا کنارا میرا تھا
دور ہی دور بہا ہونٹوں سے جو جل سارا میرا تھا
جس کی بوند کو ترسایا وہ رس دھارا میرا تھا
ترے سامنے میرا جنم ادھیکار ہنس رہا ہے لے پہچان
بنیئے تیرا جال اب ٹوٹا بنیئے تو بھی گیا جان
تری تول بھی جھوٹی تھی اور ترے مول بھی جھوٹے ہیں
جوالا بن کر کھولیں گے جو آنسو آنکھ سے ٹوٹے ہیں

وہ مفلس اور فاقہ کش کسان کو یاد دلاتی ہے کہ یہ غربت اور پسماندگی اس کا مقدر نہیں۔ اسے اس کی محنت کا حق ملنا چاہیے کوئی دوسرا اس کی محنت کا پھل کھانے کا حق نہیں رکھتا۔

وہ دھرتی جو سدا تمہاری سیوا کرتی جائے
سر پر ہاتھ دھرو گے تم۔ بیٹھی ہے آس لگائے
دن ڈوبا ہل پاس کھڑا ہے دیکھو یہ اپنائے
اس کی کوکھ میں بیج تمہارا دوجا کیوں پھل پائے
یہی ہے ماتا۔ یہی ہے پتنی۔ یہی تمہاری بیٹی
پاس وڈیروں کے مت چھوڑو بڑی اداس رہے گی

زمین کے ساتھ محبت فہمیدہ کی شاعری میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ مگر اس سلسلے میں وہ تشخص اور وابستگی کے بحران کا شکار ہے وہ اس سرزمین سے بہت زیادہ وابستگی محسوس کرتی ہے۔ جہاں اس کے پرکھوں کی زندگیاں گزریں اور وہ وہیں پیوند خاک ہوئے۔ اس لیے وہ اس سرزمین کے کلچر اور اس کی روایات سے بھی اتنی محبت کرتی ہے کہ اس کی زبان، تصورات اور تخیل پیکروں پر ہندی الفاظ اور اساطیر کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ اس میں ان سات سالوں کی جلاوطنی کا بھی دخل ہے جو اس نے سیاسی حالات اور خطرات کے پیش نظر اختیار کی اور اپنی پسندیدہ سرزمین پر بسر کئے۔ یہ زمین اور کلچر اس کے لیے ایک طلسماتی خواب کی طرح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری اس شاعرہ میں ایک مہاجر کا تشخص بڑا پائیدار اور مضبوط ہے حالانکہ وہ لغوی معنوں میں کبھی بھی مہاجر نہیں رہی۔ وہ اپنے آپ کو ماضی میں بڑا مطمئن محسوس کرتا ہے۔ حال کی سرزمین اس کے لیے بڑی الجھنوں کا مسکن ہے۔ ملاحظہ کریں نظم مہاجر

یہ نیلے پیلے غبارے
خود اپنے زور سے پھوٹ گئے
نااندیش کی بلندی سے
دھجیاں، ربڑ کی مردہ کھال کی طرح گریں
کس تیزی سے
بے جان ربڑ کے یہ ٹکڑے
کس سمت ٹھکانہ پائیں گے

مٹی سے ان کو پیار نہیں
مٹی میں نہیں مل پائیں گے
اور نتھرے نتھرے پانی کا
ہر قطرہ ان سے کہتا ہے
جو پتھر کاٹ کے نکلا ہے
وہ تازہ پانی کا دھورا
من مانے رخ پہ بہتا ہے
مٹی اور پانی سے غبارے بہت خفا ہیں

مگر بالآخر وہ سندھ کی سرزمین کے ساتھ اپنا تشخص وابستہ کرتی ہے۔ وہ سندھ کے دیہاتوں اور طرز معاشرت۔ اس کی زبان اور اس کے صوفیاء اور شعراء اور فکشن نگاروں کے ساتھ ایک وابستگی اور یگانگت استوار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ مگر اس آمادگی میں اسے بڑے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنے پرکھوں کی بولی سے محبت اس کے لہو میں رچی بسی ہے۔ وہ اپنے مجموعے 'دھوپ' میں اس بولی کو اپنانے کا جواز بھی فراہم کرنا چاہتی ہے۔ گو یہ عذر خواہی بے محل ہے۔ دھوپ کے پیش لفظ میں کہتی ہے۔

''بولی کا رشتہ تو دھرتی سے بنتا ہے۔ دھرتی ہی بولی کی پہچان ہے۔ بنگال کی بولی بنگالی۔ سندھ کی بولی سندھی۔ پنجاب کی بولی پنجابی ہے۔ میری زبان کا تعلق بھی ایک دھرتی سے ہے وہ دھرتی جہاں مرے پُرکھوں کی ہڈیاں مٹی میں ملی ہیں۔ وہاں کے گاؤں گاؤں میں یہی زبان آج بھی بولی جاتی ہے۔ تلسی اور کبیر اس زبان کے لوک شاعر ہیں۔ یہ بولی یوپی سی پی اور بہار کے کسانوں کی بولی ہے۔۔۔ مہاجر شاعر کو اپنی بولی میں دوبارہ جان ڈالنے کے لیے سوجتن کرنے ہوں گے۔ شاعری اگر اپنے خالق سے گرم خون طلب کرتی ہے تو شاعر بھی بولی سے گرم خون مانگتا ہے۔ اب ہمارے سامنے جان جوکھوں کا کام ہے۔ ایک طرف مصنوعی قدغنوں کو ٹھکرا کے ہمیں اپنے لوک شاعروں کی بازیافت کرنی ہے اور دوسری طرف ہمیں نئی سرزمین کے عوام کی زبان سندھی سے زندگی کا جیتا جاگتا رس حاصل کرنا ہے۔ گویا ہمیں اپنے ماضی سے اپنے مستقبل کا سچا۔ مثبت اور دیانتدارانہ رشتہ خود جو

ڑنا ہے۔ صرف تب ہی ہم زبان کے ساتھ انصاف کر سکیں گے۔''

اپنی اس محبوب بولی میں اس نے ایک مطمئن، مکمل گرہستن کی کتنی دلآویز تصویر کھینچی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ فہمیدہ کو جیسا کمال لفظی تصویر کشی میں ہے اردو شاعری میں شاید و باید۔ ملاحظہ ہو۔

گرہستن

سنگت کے دائرے بناتی ہوئی چال
آنگن سے رسوئی کی طرف جاتی ہوئی
اک ہاتھ دھرے کمر کی گولائی میں
چٹکی میں سارا کام نمٹاتی ہوئی

ہنستا بالک ہری بھری گود میں
سکھ چین سہاگ کا سبھاؤ میں رچا
ہونٹوں پہ چٹکتے ہیں رسیلے بوسے
سب تن سے چھلکتی ہوئی جیون مدرا
گھر کے بیوہار میں سویرے سے لگی
چہرے پہ تھکاوٹ کا کہیں نام نہیں
گدرائے بدن میں ہے جوانی کا تناؤ
پربت بھی کاٹ دے تو کچھ کام نہیں
دوجے کو تاکتی ہے پچھلتا سے
لمبی چوٹی کمر پہ بل کھاتی ہے
ہنستی جاتی ہے چلبلاہٹ سے بھری
ساجن کو جھلک دکھا کے اکساتی ہے
دیکھو تو سہاگنی کے مکھڑے کی دمک
اپنے پریتم کی آنکھ کا تارا ہے

جیون کھیتی کو سینچتی جائے

امرت کی ندی کا رس بھرا دھارا ہے

میلان کنڈیرا کی طرح فہمیدہ بھی اصل زندگی اور سچائی فوک لور میں پاتی ہے۔ وہ زندگی جو زمین سے قریب تر ہے صرف زمین سے پھوٹنے والی تہذیب اور دانش تہذیب انسانی کی بقا کی ضامن ہے۔

فہمیدہ کی انفرادیت کی ایک اور جہت اس کی مامتا کا رنگ ہے۔ گو گھر اور شوہر کی شخصیت اس کی شاعری میں موجود نہیں مگر بچے اور ماماتا اس کا ایک مستقل موضوع ہیں۔ اس کی بہت سی لوریاں اس کا ثبوت ہیں۔ ماماتا ہماری شاعرات کا محبوب اور مشترک موضوع ہے۔ سب نے ماماتا کو عورت کی معراج اور اسے موقر اور عظیم منصب عطا کرنے کا وسیلہ بتایا ہے۔ بچوں میں اپنے وجود کا جواز اور ہستی کی تکمیل پانے کا تذکرہ ہر شاعرہ نے کیا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ شبنم اپنی بیٹی کو زمانے سے مصالحت کا درس دیتی ہے کیونکہ ایک رکھ رکھاؤ والی پاکستانی عورت کا تجربہ اسے یہی سکھاتا ہے۔ مگر فہمیدہ کی باغی روح اسے اپنے موقف سے دست بردار ہونے کا درس نہیں دیتی وہ ہر قیمت پر سچ کی حفاظت کرتی ہے۔ اس لیے بھی کہ گھر اور رفیق حیات اس کی زندگی کا محور نہیں ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو بھی مخالف حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی تلقین کرتی ہے وہ عصر حاضر کی عورت کو بزدل نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ اسے اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ زندہ رہنے کا درس دیتی ہے۔ اور ہر طرح کی سودے بازی اور سمجھوتے سے دور رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ اس کے نزدیک بیٹی دراصل ماں کا روپ ہے جس پر پورے معاشرے کا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے بیٹی کو شروع سے ہی انسانی اقدار اور احترام آدمیت کی تربیت دینا ضروری ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو لوری بھی یہی دیتی ہے۔

سن مری ننھی سی جان

یہ زمین یہ آسمان

سکھ کی ساری آن بان

منڈیوں میں بھرا دان
جب تلک ہمارا نہیں
چین سے گزارا نہیں
کسی کا سہارا نہیں
کوئی اور چارہ نہیں
بھیڑیے سے نہیں ڈرنا
مری جان! جم کے لڑنا
کبھی مت ہونا نراس
ویرتا سکھاؤں تجھ کو
شیرنی بناؤں تجھ کو
ڈر نہ پھٹکے پاس
سن میری ننھی نویلی
نہیں ہوگی تو اکیلی
سنگ ہوں گے بانہہ بیلی
ترے سنگی تیرے میت
تیرے ساتھ ساتھ ہوں گے
ہاتھ میں کئی ہاتھ ہوں گے
یہی میری اک آس

''کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے''۔ میں فہمیدہ کا نظریاتی پہلو سامنے آتا ہے۔ وہ جبر و استبداد اور گھٹے ہوئے ماحول کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ یہ ایک طویل نثری نظم ہے۔ نظم کے روپ میں ایک داستانِ غم کہ جس میں مفلس فاقہ کش کچلے ہوئے عوام کو زندگی کا حق حاصل کرنے کی ہمت دلائی جا رہی ہے۔ اب عورت ایک رجز خواں کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ عورت جو صرف نسائی مسائل میں گرفتار نہیں بلکہ معاشرے کے ایک حساس فرد ہونے کی حیثیت سے اس کی اچھائی برائی کا شدید احساس

رکھتی ہے۔ طبقاتی لوٹ کھسوٹ پر مبنی نظام کے بارے میں فکر مند ہے۔ انسانی اور قومی مسائل کو اولین اہمیت دیتی ہے۔ یہ ایک عصری آگہی رکھنے والی فعال عورت کی شخصیت ہے۔ جو اس دور کی راہ تک رہی ہے جب

لوٹ کھسوٹ کے باؤلے درندے کو
چوراہے پر شوٹ کیا جائے گا
دفن کر دیں گے ہم اسے
اتنی گہری قبر کھود کر
ہماری حسین اور معصوم دھرتی پر
پھر کبھی وہ اپنے نجس پیر نہ دھر سکے گا
ممکن تو یہی ہے اے باغبان
ہزار گلابوں کا چمن کھلے
بارش کی بوچھاڑ میں
ایک شاخچہ بھی تشنہ نہ رہے
میں اسی دن کے لیے گاتی ہوں
گاتی رہوں گی
ہر آخری گیت۔ امید کا گیت
یہ شاعر کے دل کا فرمان ہے

اپنے مجموعے ہم کتاب تک آتے آتے ہماری شاعرہ میں ایک نمایاں تبدیلی آتی ہے۔ اس کی رجز خواں رگوں میں لہو دھمال ڈالنا بند کر دیتا ہے۔ اس کے لہجے اور انداز پر اک تھکن طاری ہونے لگتی ہے۔ ایک خاموش سی افسردگی۔ وہ بہت سے آدرش اور نظریات جنہیں اس نے اپنی ہستی کا جواز بنایا تھا' لگتا ہے کہ ماضی کے توشہ خانے میں سرکتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی زبان اب وہی فارسیت کا رنگ لیے کلاسیکی اردو ہے وہ پورب کی بولی ٹھولی اب موسمی پرندوں کی طرح مراجعتی پرواز کرتی محسوس ہوتی ہے۔ اب پھر وہی رومانی کرب کی بازگشت ہے کچھ پچھتاوے ہیں۔ احساسِ زیاں ہے۔

بڑھتی عمر کا غم ہے۔ دنیا کے محدود ہونے کا احساس ہے۔ کچھ یہ فکر کہ جو کچھ چاہا تھا پا نہ سکے۔ دل کی سکت میں کمی ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ برملا اپنے طبعی بڑھاپے کا ذکر نہیں کرتی مگر درپردہ عناصر میں اعتدال کا فقدان اور وقت کی بے رحم طاقت کا احساس ابھر رہا ہے۔

کس کو بتائیں
کیوں بن گیا ہے
معمورۂ دل
قریۂ برباد
کیا کاسۂ سر ہے خون سے تر
پیوندِ قبا دشنام بہت
پیوستِ جگر الزام بہت
یہ نظر کرم کیوں ہے پُرنم

مگر اب بھی وہ ایک ضعیف شیرنی کی صورت زندگی کو تاکتی ہے۔ ''آدمی کی زندگی'' اس کا تازہ ترین مجموعہ اسے فلسفیانہ زمینوں پر دشت خرامی کروا رہا ہے۔ اس کا موقف وہی ہے جسمانی ۔ مادی۔ زمینی زندگی کا حسن اور عظمت ۔لہو کی دانش۔ پوری کائنات عورت نے کاندھوں پر اٹھا رکھی ہے۔عورت جو زندگی کی افزائش کرنے والی' محبت کرنے والی۔ تحفظ دینے والی۔ دکھ درد بانٹنے والی ہے۔

تادم تحریر آدمی کی زندگی' فہمیدہ کا آخری مجموعہ کلام ہے۔ خدا کرے کہ اور بہت سے آئیں۔ اس میں شاعرہ ایک انقلابی عورت کی لاحاصل جدوجہد کا تذکرہ بھی کرتی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک روایتی رول ٹھکرا کے اس نے معاشرے میں جو انقلابی کردار ادا کرنے کا انتخاب کیا۔ اس کا حاصل کچھ بھی نہیں اب اس پر تھکن اور اضمحلال طاری ہے اور وہ اپنے ماضی کی گم گشتہ سرخوشی اور سرشاری کے لیے بہت اداس ہوتی ہے۔ ابھی بھی وہ سمجھتی ہے کہ عورت کی جسمانیت اس کا بہت بڑا امتیاز ہے اور اسے اسی میں تسکین ملتی ہے۔ یہ جسمانیت اسے ایک مخصوص ذہانت' شعور اور وجدانی طاقت عطا کرتی ہے جس کے

بل بوتے پر وہ ایک مکمل ذاتی زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں مثبت انقلاب بھی لاسکتی ہے۔ انقلاب جو جمہوریت۔ مساوات۔ احترام آدمیت کا علمبردار ہو اور ہر ایک کو کامیابی کے مواقع عطا کرے۔ جو کمزور اور پسماندہ مخلوق کو مسند وقار پر بٹھائے یہ آدرش ابھی اس بڑھاپے کی حدوں تک پہنچتی عورت کے اندر زندہ ہیں۔ مگر زندگی کی بہت سی محرومیاں اور ناکام کوششیں خصوصاً جسمانی حسن وصحت کا زوال اسے ایک روحانی افسردگی سے دوچار کررہا ہے۔

لیکن وہ فطرتاً ایک مثبت فکر رکھنے والی عورت ہے 'مردمکِ چشم من' میں اپنے نورِ نظر سے مخاطب ہے۔

راستے کے موڑ پر
یہ ہے میری خواب گاہ

پر درو دیوار پر
رنگ نہیں کوئی بھی

میں نے یہ چاہا پسر
رنگ سنہرا کروں
وہ نہ مجھے مل سکا

یاں ملا نہ واں ملا
عمر ختم ہوئی
وقت ختم ہوگیا
پس تجھے معلوم ہوتا کید ہے
اس جہاں میں ضرور بالضرور

یاں کہ واں

یا نہاں
رنگ سنہرا بھی ہے
اور جو نہیں ہے تو اس کو خلق کر

کیونکہ اس کی آرزو
کیونکہ اس کی جستجو
سینۂ مادر میں تھی
سینہ بہ سینہ جو تجھے سونپ دی
ایک شاعرہ آنے والی نسل کو اس سے بڑھ کر اور کیا تحفہ دے سکتی ہے۔

پروین شاکر

قاعدہ ہے کہ کانچ کے قیمتی سامان کے باہر ''بہت نازک ہے۔ احتیاط سے ہاتھ لگائیں'' لکھ کر سپردِ سفر کر دیا جاتا ہے۔ اب منزل تک پہنچتے پہنچتے وہ کیسے کیسے ہاتھوں میں جاتا ہے۔ کیا کیا ٹھوکریں کھاتا ہے۔ سب مقدر کی بات ہے۔

پروین شاکر کو دیکھ کر ایسے ہی آبگینوں کا خیال آتا ہے۔ مگر جرأت دیکھئے کہ اس نے اپنے گرد سے نزاکت اور احتیاط کے اس ہدایت نامہ کو اتار پھینکا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ زندگی کی جنگ میں رو رعایت کی قائل نہیں۔ اور کچھ پروین شاکر ہی پر منحصر نہیں۔ عصری اردو ادب کو دیکھیں تو نظم و نثر دونوں ایوانوں میں بھرپور نسائی لہجوں کی تمکنت کا ایک سلسلہ نمو پاتا نظر آتا ہے۔ لگتا ہے کسی مستجاب گھڑی میں اس ست نہاد نے فلاطوں کے ساتھ ساتھ مکالماتِ فلاطوں تخلیق کرنے کا چیلنج بھی قبول کر لیا ہے۔ ادا جعفری سے پروین شاکر کا سفر ایک شعری روایت اور تخلیقی رویے کا سفر ہے جس میں زہرہ نگاہ' کشور ناہید' فہمیدہ ریاض اور شبنم شکیل کے قدِ آدم سنگِ میل کھڑے ہیں۔

نثر ذات چھپانے کا فن ہے اور شعر کی کل کائنات ہی شاعر کی اپنی ذات ہے۔ یہی اس کا جمال بھی ہے اور کمال بھی۔ پروین شاکر کے چار شعری مجموعے کچھ اور نہیں بس اس کی ذات کا نچوڑ ہیں۔ فرق محض یہ کہ زندہ جیتی جاگتی پروین شاکر تک ہر کسی کی رسائی نہیں۔ ہو بھی تو ہر کسی پر ہر کسی کا کھلنا ناممکن اور تخلیق ایک ایسا دروازہ ہے جس کے راستے آپ بغیر دستک دیئے ہر ایک کے حریم ذات میں داخل ہو سکتے ہیں۔ جب تک جی چاہے براجمان رہیے۔ سو یہ چار مجموعے وہ چہار در ہیں جو اس دور کی ایک حساس ذہین اور خود اعتماد عورت کی سائیکی پر کھلتے ہیں۔ ان سب میں ایک منطقی ربط ہے۔ ایک تسلسل ہے جو تخلیق

کار کی شخصیت کے سفر کی عکاسی کرتا ہے۔

شعری روایت میں ڈوبے ایک اثنا عشری گھرانے میں آنکھ کھولنے والی بچی ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی شعر کے آہنگ کو جزو سماعت بنا چکی ہوتی ہے۔ شاعرِ جلیل میر انیس کے اشعار غیر شعوری طور پر اس کی لفظیات کا حصہ بن چکے ہوتے ہیں۔ اور سوچتے بولتے میں اکثر سادہ لفظ آہنگ کی صورت اختیار کرتے چلے جاتے ہیں۔ سو زبان کی وہ تہذیب جو ہمیں اکثر شعوری طور پر کرنا پڑتی ہے۔ پروین شاکر نے ورثہ کے طور پر پائی۔ گویا ایک بڑی منزل سفر شروع کرنے سے پہلے ہی طے ہوگئی۔ گمان کہتا ہے کہ گڑیا سی لڑکی اپنے ننھے سے وجود میں وہ شدید جذبے اور تجربات جن میں انسانی رشتوں کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر جذبوں کا ارتفاع بھی تھا اور رزم و بزم کی دھڑکتی واردات۔ عقیدت و اعتقاد کے معجزے بھی تھے اور واقعہ نگاری کے کمالات بھی۔ چپ چاپ اپنے اندر سموتی رہی۔ یہیں سے اس کی شخصیت کے دو واضح رُخ سامنے آتے ہیں۔

ایک مختصر سے خاندان کی انتہائی محفوظ زندگی گزارنے والی بچی جو زمانے کی ہر شورش اور اس کی تباہ کاریوں کی دسترس سے دور رہی ہو مگر عاریتاً پُرشور اور مضطرب زندگی کا بھی احساس رکھتی ہو۔ اس طرح اس نے vacarious تجربوں سے اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں میں ایک ایسی دنیا کا پتہ بھی چلا لیا ہو جو ہمہ وقت آندھی طوفان کی زد میں رہتا ہے۔ جہاں ہر لمحہ حق و باطل کی جنگ جاری رہتی ہے۔ اس کی یہ دو شخصیات آج تک ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں۔ ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوئیں۔ ایک طرف حیاتی لطافت کی وہ رنگین خوشبو بھری دنیا ہے جس میں چوڑیوں کی میٹھی کھنک اور چنری کے شگفتہ رنگ ہیں۔ پھولوں کے میلے اور چاند تاروں کے کھیت اُگے ہیں۔ اس دنیا میں وسعت ہے۔ پھیلاؤ ہے۔ گہرائی نہیں۔ اور یہاں گہرائی کی ضرورت بھی نہیں کہ یہ ایک طلسماتی دنیا ہے۔

یاد رہے کہ میں پروین کے صرف پہلے مجموعہ خوشبو کی بات نہیں کر رہی بلکہ اس کے چاروں مجموعوں کے حوالے سے سوچ رہی ہوں۔ یہ طلسماتی فضا تو انکار تک برابر قائم رہتی ہے۔ اس میں پروین شاکر نے قدیم داستانوں اور legends کا سحر تازہ کیا ہے اور یہ سب اس کے لیے اتنا فطری ہے کہ کہیں بھی بیگانگی اور تکلف کا احساس نہیں ہوتا۔ اس نے

صرف مشرقی legends کو اپنے تجربے کا حصہ نہیں بنایا بلکہ مغربی لوک داستانیں بھی اس کے تخلیقی تجربے کا ایک جزو ہیں۔ اور اس طرح اردو شاعری میں زندگی ایک نئے اجتماعی لاشعور کے حوالے سے داخل ہوتی ہے۔ ہمارے قدیم استعارے جو فارسی ادب سے مستعار ہیں آج تک نئی سے نئی معنویت کے ساتھ شاعری میں ظہور پا رہے ہیں مگر عہدِ حاضر کی ایک نسائی ذہانت جس کی اہمیت مغرب و مشرق کے امتزاج سے ہوئی زندگی کو کن تمثالی پیکروں میں دیکھی ہے۔ پروین شاکر کی شاعری اس کی ایک مثال ہے۔ اس کے ہاں یہ خدشہ بھی موجود ہے۔

دریا پار یہ سوچ کے چل
گھڑے بدل بھی جاتے ہیں

تو وہ شہزادی بھی ہے کہ جس کے تمام جسم کو سوئیوں سے گوند کر ایک طلسمی خواب کا اسیر کر دیا گیا ہے۔ اور کسی شہزادے کا انتظار ہے کہ آئے اور یہ تمام سوئیاں نکالے کہ شہزادی پھر سے زندوں میں آ جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ سنڈریلا بھی ہے جو اپنی طلسماتی بگھی اور عارضی شاہانہ لباس میں عظیم الشان ایوانوں میں رقص کرتی ہے جس کے دل میں بارہ کا گھنٹہ بجنے کا دھڑکا بھی ہے۔ اور شہزادے سے جدائی کا خوف بھی۔ اس پر اپنا آپ کھل جانے کا لرزہ بھی۔ مگر وہ رقص کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز بھی ہونا چاہتی ہے۔ اس کے ہاں آپ کو حسنِ خفتہ کا تمثالی پیکر بھی ملے گا جو جنگلوں سے ڈھکے ایک ویران محل میں طلسماتی نیند میں محو کسی شہزادے کی آمد کا منتظر ہے کہ آ کر اس کو نیند کے اس حصار سے آزاد کرائے۔ میرا اندازہ ہے کہ کسی اور خاتون شاعرہ کے ہاں برق رفتار مشکی راہوار۔ اور اس کے نسائی راکب کا تذکرہ نہیں ملتا۔

پروین شاکر کے خواب بھی ایک داستانوی عہد کا پتہ دیتے ہیں کبھی یوں لگتا ہے کہ وہ بھی کسی گم شدہ نسل کی شہزادی ہے جو حال کی چومکھی لڑنے کو مقدر کر دی گئی ہے۔ مگر جس نے اپنے ماضی سے رشتہ نہیں توڑا۔ مشکی گھوڑے۔ شہزادے شہزادیاں' غلام گردشیں۔ راہداریاں۔ پراسرار راستے۔ جنگل' کائی لگے حوض' خاموش طلسماتی خواب میں ڈوبے باغ اور ایوان۔ ان سب لفظی تصویروں سے مل کر مونتاژ نما ہے جو پروین کی شاعری کا ایک

اہم جزو ہے۔

جنگل کا استعارہ اس کے ہاں ایک مستقل صورت اختیار کر گیا ہے۔ کہ جنگل ایک آسیب بھی ہے جس کی نوعیت اجتماعی بھی ہے اور ذاتی بھی۔ یہ جنگل شہر ذات کے راستے کو بھی مسدود کرتا ہے اور اپنی سرزمین پر بھی محیط ہے۔ میرا ارادہ تو تھا کہ پروین کی ذات کے بارے میں کچھ گفتگو کروں تو اس کی شاعری کی حکایاتی دنیا مجھے کھینچ رہی ہے کہ جا اینجا است۔ کہانی میری کمزوری ہے خواہ وہ دن ہی میں کیوں نہ سنائی جائے کہ مسافر راستہ بھول جائیں۔ بس پروین کو پڑھتی ہوں تو بار بار راستہ بھول جاتی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ اس کے شعوری ارتقا کا تجزیہ کروں اس نے خود بھی برملا' ڈنکے کی چوٹ پر اس طلسماتی دنیا کو خیر باد کہنے کا اعلان کیا ہے۔ مگر میں اس کے اس اعلان کو زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں اس لئے کہ آدمی اپنے خمیر میں سکون پاتا ہے۔ اور اس دنیا میں آنا جانا کوئی عیب نہیں۔ میں اس کے سماجی شعور اور عصری تجزئیات کی طرف آنا چاہتی ہوں مگر اس کے شجر' ہوا' چاند' چڑیاں' گلاب' آبشار میرا دامن پکڑتے ہیں۔

شجر ہمارے عہد کا ایک اہم استعارہ ہے۔ پروین شاکر نے اس کو سماجی اور ذاتی دونوں حوالوں سے باندھا ہے۔

اس بار جو ایندھن کے لئے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بڑا پیار تھا اس بوڑھے شجر سے

یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا

چکر لگا رہے تھے پرندے شجر کے گرد
بچے تھے آشیانوں میں طوفان سر پہ تھا

میں نے سوچا تھا۔ شعر کا حوالہ نہیں دوں گی مگر کچھ ایسے اشعار ہیں جن کی فضا خود بول اٹھتی ہے۔

پتھرایا ہے دل یوں کہ کوئی اسم پڑھا جائے
یہ شہر نکلتا نہیں جادو کے اثر سے

اس کی مٹھی میں بہت روز رہا میرا وجود
مرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے

مگر کون کہے' اس ساحر پہ کس کو اتنا اختیار ہے؟ ذہن پھر ایک طلسماتی فضا میں کھو جاتا ہے شاید دیو نے شہزادی کو تتلی بنا کر دیوار سے چپکا دیا ہے اپنے گرد پھیلے موسموں اور رنگوں کا تجربہ پروین کی شاعری میں پلٹ پلٹ کے آتا ہے۔ خوشبو۔ ہوا۔ سمندر۔ پرندے۔ ان سب کے ساتھ اس کے احساس کا گہرا رشتہ ہے۔ یہ کوئی مابعد الطبیعاتی رشتہ نہیں۔ نہ ہی یہ مغربی رومانوی اور فطرت پرست شعراء کا رویہ ہے کہ فطرت کسی حصول مقصد کا ذریعہ ہو۔ مناظر کے ساتھ یہ ربطہ دلی وابستگی ہے ان کے ساتھ کچھ تھوڑی بہت یادیں وابستہ ہوں تو۔ ورنہ وہ ان سے بے غرض بے ریا محبت کرتی ہے کہ ان مظاہر نے اس کی زندگی کو خوبصورتی اور محبت سے بھر دیا ہے۔

پروین شاکر کے ہاں خالص نسائی تمثالیں' دلہن' حنا' سیج' چوڑیاں۔ افشاں۔ بندیا سبھی کا تذکرہ انکار' تک کسی نہ کسی صورت میں پلٹ پلٹ کے آتا ہے۔ اس سے میں اسی نتیجہ پر پہنچتی ہوں کہ پروین خواہ کتنی ہی بیوروکریٹ اور سماجی نقاد کیوں نہ بن جائے۔ بنیادی طور پر وہ ایک روایتی عورت ہے۔ اور روایتی عورت ہونا ہمارا حق ہے۔ منصب ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ یہ جو ہم سب پاپڑ بیلتے ہیں۔ انٹیلکچو ئلزم' لبرل اِزم کے سلسلے میں تو اسی لیے کہ ہمارے روایتی کردار و منصب کو وہ تکریم حاصل نہیں جو اس کا حق ہے۔ معاشرے کے ساتھ ہمارا تصادم اسی قدر ہے۔ پروین شاکر کو قدرت نے حسیاتی تجربے کی ایک وسیع دنیا ودیعت کی ہے۔ اس کے ہاں حواس سے لطف اندوز ہونے کی ایسی سکت ہے جو میدانِ کارزار میں سپاہی کو تازہ دم کرنے کے لیے لازمی ہوتی ہے۔ اس لیے ایک عورت ہونے کے حیثیت سے پروین زندگی سے کبھی پوری طرح disillusioned نہیں ہوئی۔ اس نے کچھ الیوژن بہت سینت سینت کے رکھے ہیں۔ اور جب صحرا میں کسی

نخلستان کی امید نہ ہوتو وہ اپنے توشہ میں سے کوئی سراب عرصۂ حیات میں پھیلا دیتی ہے۔یہیں سے یہ نقطہ بھی نکلتا ہے کہ ایک داستان محبت ہے جو بار بار' پلٹ پلٹ کے آتی ہے۔اور ہر بار ایک نئے حوالے سے اور حسیاتی فضا کے ساتھ۔کسی ایک دلہن کے سراپے میں تو کبھی دوسرے کے آنگن کو حسرت سے دیکھنے اور احساس جرم میں گرفتار ہونے کی صورت میں۔کہیں یہ ترکِ تعلق کا شعوری اور ہوشمندانہ فیصلہ ہے اور کہیں یہ ایک ایسا تعلق ہے جو ٹوٹ پھوٹ کے جڑ تا ہے۔ختم ہو کر بھی ختم نہیں ہوتا۔

صد برگ سے پروین شاکر اجتماعی نقطۂ نظر کا اعلان کرتی ہے۔اجتماعی احساس کے کچھ اشارے خوشبو میں بھی موجود ہیں۔مگر بات یہ ہے کہ تخلیقی فن کبھی اعلانات کا پابند نہیں رہتا اور نہ ہی تخلیق کار کو اپنے آپ کو محدود کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔اس کا احساس خود ہی طوفان حوادث کے سامنے یکہ وتنہا کھڑا ہے تو ان آفتوں سے بے نیاز کیوں کر رہ سکتا ہے۔جو چاروں سمت سے یلغار کر رہی ہیں۔

پروین شاکر نے اپنی ذات کا یہ دوسرا در وا کیا تو رکے ہوئے طوفان تمام خس و خاشاک سمیت اس کو بھی ریلے میں بہا لے گئے۔زمانے نے اسے تند لہجہ' غرور' تمکنت حسبِ ضرورت و بقدرِ ذائقہ' سخت گیری' طعنہ و تشنیع' سب کچھ سکھا دیا سماجی نقاد کی حیثیت سے وہ عصری مسائل کا واضح ادراک رکھتی ہے۔نا اتفاقی جبر و منافقت کے خلاف اس کا علم سر بلند ہی رہا۔ادرکی' تقیہ' ظلِ الٰہی کے پرابلمز۔کنیا دان۔اور اسی طرح کی اور بہت سی نظمیں تلخی میں شرابور' ایک براہِ راست انداز میں آمریت کے زیرِ سایہ پلنے والی منفی سیاستوں کے خلاف اعلان جہاد ہے۔اور اس کے لیے پروین شاکر نے زیادہ تر نظم کا پیرایہ اختیار کیا ہے۔مگر اس کی غزلیات میں بھی اکثر بڑے کاٹ دار اشعار یہ منصب ادا کرتے ہیں۔کبھی کبھی ایک ایک شعر پوری پوری نظم پر بھاری ہوتا ہے۔

پروین شاکر کا یہ احتجاج دو سطحوں پر ہے۔ایک معاشرے کے عام فرد کے حوالے سے دوسرے ایک عورت کی نمائندگی میں۔اس سلسلے میں اس کا ایک دفتری اور سرکاری کلچر ہے جو اس کی نظموں کو انفرادیت دیتا ہے۔سٹینو گرافر۔چیلنج اور اس قسم کی دوسری نظمیں۔پروین شاکر نے ایک کارکن عورت کی روزمرہ زندگی اور اس کے مسائل کو شاعری

کا موضوع بنا کر اردو شاعری کو عورت کا ایک نیا کردار دیا ہے۔ گو یہ روایت کشور ناہید سے شروع ہوئی مگر پروین نے اس کو ایک مستقل حیثیت دینے میں مدد کی۔ عورت جو اسٹینو گرافر بھی ہے اور افسر بھی۔ استاد بھی ہے اور بیوروکریٹ بھی۔ شاعرہ بھی ہے اور مصورہ بھی۔ مگر ہر کہیں استحصال اور بد نیتی کے جال پھیلے ہیں۔ کہیں جبر و تشدد اور کہیں خوشامد کے عفریت اپنے تیز نوکیلے دانتوں سے اس کی شہ رگ سے خون نچوڑنے کے لیے بے تاب ہیں۔ فقیہ شہر اور قاضی سلطنت کی کند ذہنی اور منافقت پوری قوم کا سستے داموں سودا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں پروین شاکر کی نثری نظمیں بھی آ جاتی ہیں۔ جن میں براہِ راست بات کی گئی ہے۔ زبان سادہ اور عام بول چال کے قریب۔ یہ تمام نظمیں غالباً وہ کفارہ ہے جو پروین شاکر اپنے تخلیقی جوہر کی لطافت اور سرشاری کے صدقے میں پیش کرنا چاہتی ہے۔ حقیقت نگاری اور حالات کی سنگینی اور تلخی اوقات کے حوالے سے یہ نظمیں اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہیں۔ اور اس منظرنامے کی تکمیل کرتی ہیں جس میں پروین کی شاعری پروان چڑھتی ہے۔ ذاتی اور اجتماعی واردات کے خانے بھی بھرے جاتے ہیں اور شاعری کے مبصر و نقاد ہونے کا فریضہ بھی ادا ہو جاتا ہے۔

اب اس جگسا پزل کا ایک ٹکڑا باقی ہے' اس کو بھی لگا لیں کہ شعر مکمل ہو جائے۔ یہ ہے ماماتا کا انگ۔ زمانے سے ٹکر لینے والی یہ کانچ کی گڑیا۔ جب مزاحمت پر آتی ہے تو سنگِ خارا بن جاتی ہے۔ مگر محبت کے معاملے میں total submission مکمل اطاعت کا روپ ہے۔

ماماتا میں بھی اتنی possessive کہ کسی اور کے شریک ہونے کے خیال ہی سے بے کل ہو جاتی ہے۔ بیٹے میں بھی محبوب کا چہرہ دیکھتی ہے۔ اس کی ماماتا کی نظمیں پڑھ کے ڈی ایچ لارنس کی سنز اینڈ لورز یاد آتی ہے۔ مگر یہی غیر مشروط اور مکمل محبت ہی عورت کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ کچھ اس کی سہار رکھتی ہیں کچھ اس کی شدت کے سامنے ٹوٹ جاتی ہیں۔

پروین کے ہاں روایتی لفظیات کا بہت منفرد روپ نظر آتا ہے اس سلسلے میں اس کی تراکیب خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ دراصل تراکیب بھی تخیل کی نئی صورتیں ہیں جو عام

لفظوں کو ملن کی نئی دنیا میں سے آشنا کرتی ہیں۔ پروین کے ہاں ایسی تراکیب خودرد پھولوں کی طرح بھری پڑی ہیں۔ شاخ گریہ فصیلِ شوق۔ حرفِ تحریص موجِ خواب شکن کا پہلا پرندہ۔

اس کا کینوس وسیع ہے۔ جس میں موسموں کے رنگ' سمندروں کی نیلاہٹ' چڑیوں کی چہکار' میدان جنگ کی جھنکار' دفتروں کی زرد اکتاہٹ۔ درباروں کے جبر اور گھروں کی تنہائیاں سبھی شامل ہیں۔ اس میں پھیلاؤ ہے مابعد الطبعیاتی گہرائی نہیں۔ وجود وعدم کے مسائل فوکس میں نہیں آتے کہ پروین شاکر کارِ زمیں سلجھانے میں یقین رکھتی ہے۔ آسمان سے جھگڑا مول لینے کے موڈ میں نہیں۔ زبان و بیان میں امکانات کی تلاش اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ کبھی ہندی لب ولہجہ میں گوکل متھرا جا پہنچے۔ کبھی نہیں چُنر یا اوڑھ امیر خسرو کی چوکھٹ پکڑ لی۔ ورنہ میر' غالب۔ فیض وفراز کی مجلسوں میں کنول آسن جمایا مگر جہاں بھی گئے اپنے ذہن سے سوچا ''اپنی بات کی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اردو شاعری میں نسائی حسیت ایک مستقل صورت اختیار کر رہی ہے۔ اور اظہار دونوں اعتبار سے اگلا قدم ہے اور بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ جب دورِ حاضر کی شعری تاریخ مرتب ہونے لگے تو کانچ کی گڑیا اپنی پوری دلآویزی اور خاراشگافی کے ساتھ اپنے مقام پر کھڑی ہو۔

موت ہستی پر مُہر تکمیل ثبت کرنے کا نام ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ غیر معمولی صلاحیت رکھنے والوں کو اپنی تکمیل کی بڑی عجلت ہوتی ہے۔ پروین شاکر نے بھی کمال محبت سے عرصہ حیات طے کیا اور اچانک نظروں سے غائب ہوگئی۔ اس طرح کہ آج تک زندگی کے اس منظرنامے سے اس کا اوجھل ہو جانا سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کا فن شعر ایک مکمل صورت میں ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ اور پھر حیرت ہوتی ہے کہ شعر گوئی کے کیا کیا کمالات اس میں چھپے تھے۔ جنہیں اس کی زندگی میں کوئی اہمیت نہ دی گئی اور پھر موت کے بعد بھی اس کی قدر و قیمت کا صحیح تعین نہ ہو سکا۔ صرف اس لیے کہ وہ ایک شاعرہ تھی۔ ایک عورت' جس سے سوائے رومان' ممتا اور جذباتیت کے اور کوئی توقع نہیں کی جاتی۔

پروین شاکر نے زندگی کے ہر مرحلے اور معاشرے کے ہر پہلو کو بڑی سنجیدگی

سے لیا یہ اور بات ہے کہ اس کی ذاتی خوبروئی اور دلکشی کے باعث سب کی نظر اس کی رومانی شاعری پر زیادہ رہی اور اسے ٹین ایجز کی شاعرہ کا درجہ دیا جاتا رہا مگر ایک باشعور' گہری بصیرت رکھنے والی اور گرم و سرد زمانہ سمونے والی عورت کا جو کردار ہمیں اس کے اشعار میں جا بجا نظر آتا ہے۔ اس نے اردو شاعری میں ایک نئی روش کی طرح ڈال دی ہے اور اب یہ روش آبادہ تر ہونا چاہیے۔

پروین کے تمام شعری مجموعوں کو اٹھا کر دیکھیں تو ان میں ایک واضح ذہنی ارتقاء کی صورت نظر آتی ہے۔ وہ ایک نرم و نازک روحانی دنیا میں بسنے والی لڑکی سے نکل کر جب ایک کارکن' زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے والی عورت کی شکل میں ظاہر ہوئی تو اس نے اپنے اس تجربے کو شعر کا قالب دینے کی جدت کی۔ اس کی نظم ''ورکنگ وومن'' آج کی پاکستانی عورت کی ذہنی کیفیت بیان کرتی ہے۔

سب کہتے ہیں
کیسے غرور کی بات ہوئی ہے
میں اپنی ہریالی کو خود اپنے لہو سے سینچ رہی ہوں
میرے سارے پتوں کی شادابی
میری اپنی نیک کمائی ہے
میرے ایک شگوفے پر بھی
کسی ہوا اور کسی بارش کا بال برابر قرض نہیں ہے
میں جب چاہوں کھل سکتی ہوں
میرا سارا رُوپ' مری اپنی دریافت ہے
مَیں اب ہر موسم سے سر اونچا کر کے مل سکتی ہوں
ایک تناور پیڑ ہوں اب میں
اور اپنی زرخیز نمو کے سارے امکانات کو بھی پہچان رہی ہوں
لیکن میرے اندر کی یہ بہت پرانی بیل
کبھی کبھی ___ جب تیز ہوا ہو

کسی بہت مضبوط شجر کے تن سے لپٹنا چاہتی ہے!

پاکستان کے ابھرتے ہوئے نام نہاد روشن خیال معاشرے میں عورت اپنے آپ کو جن مصائب اور خطرات میں گھرا محسوس کرتی ہے اس کا اندازہ کسی مرد شاعر کے بس کی بات نہیں۔ یہ تو صرف آ ہوئے صیاد دیدہ ہی جانتا ہے کہ ایک ایک سانس کی کیا قیمت چکانا پڑتی ہے اور گوشۂ عافیت محض ایک خواب' ایک سراب ہے۔

بھیڑیئے مجھ کو کہاں پا سکتے
وہ اگر میری حفاظت کرتا

''اختیار کی ایک کوشش''

اگر بن میں رہنا مقدر ہے
اور یہ اک طے شدہ امر بھی ہے
کہ ہر بن میں بس بھیڑیئے منتظر ہیں مرے
تو یہ سوچتی ہوں
کہ اس صورتِ حال میں
کیوں نہ پھر
اپنی مرضی کے جنگل میں ہی جا بسوں!

مگر یہ نہ سمجھئے کہ پروین نے صرف اعلیٰ متوسط طبقے کی تعلیم یافتہ عورت ہی کے تجربات کو اپنے سے قریب پایا ہے۔ وہ نچلے طبقے کے کچلے ہوئے انسان کے ساتھ بھی وہی دلی رفاقت محسوس کرتی ہے جو افسری معاشرے کے افراد کے ساتھ۔ یہ اس کی فنی بصیرت کا کمال ہے کہ اس نے جس طبقے کی بات کی اسی سے مناسبت رکھنے والا اسلوب بھی اپنایا۔ جب وہ عام اور نچلے طبقے کے مفلس' بیمار اور استحصال شدہ لوگوں کا ذکر کرتی ہے تو اکثر نثری نظم کا پیرایہ اختیار کرتی ہے۔ اس کی یہ نظم دیکھیے۔ ''بشیرے کی گھر والی''

ہے رے تیری کیا اوقات!

دودھ پلانے والے جانوروں میں

اے سب سے کم اوقات

پُرش کی پسلی سے تو تیرا جنم ہوا

اور ہمیشہ پیروں میں تو پہنی گئی

جب ماں جایا پھلواری میں تتلی ہوتا

تیرے پھول سے ہاتھوں میں

تیرے قد سے بڑی جھاڑو ہوتی

ماں کا آنچل پکڑے پکڑے

تجھ کو کتنے کام آجاتے

اُپلے تھاپنا

لکڑی کاٹنا

گائے کی سانی بنانا

پھر بھی مکھن کی ٹکیہ

ماں نے ہمیشہ بھیا کی روٹی پہ رکھی

تیرے لیے بس رات کی روٹی

رات کا سالن

روکھی سوکھی کھاتے

موٹا جھوٹا پہنتے

تجھ پہ جوانی آئی تو

تیرے باپ کی نفرت تجھ سے اور بڑھی

تیرے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے پر

ایسی کڑی نظر رکھی

جیسے ذرا سی چُوک ہوئی

اور تو بھاگ گئی
سولھواں لگتے ہی
ایک مرد نے اپنے من کا بوجھ
دوسرے مرد کے تن پہ اُتار دیا
بس گھر اور مالک بدلا
تیری چاکری وہی رہی
بلکہ کچھ اور زیادہ
اب تیرے ذمے شامل تھا
روٹی کھلانے والے کو
رات گئے خوش بھی کرنا
اور ہر ساون گابھن ہونا
پورے دنوں سے گھر کا کام سنبھالتی
پتی کا ساتھ
بس بستر تک
آگے تیرا کام!
کیسی نوکری ہے
جس میں کوئی چھٹی نہیں
جس میں الگ ہو جانے کی، سرے سے کوئی ریت نہیں
ڈھوروں ڈنگروں کو بھی
جیٹھ اساڑھ کی دھوپ میں
پیڑ تلے سستانے کی آزادی ہوتی ہے
تیرے بھاگ میں ایسا کوئی سمے نہیں
تیری جیون پگڈنڈی پر کوئی پیڑ نہیں ہے
ہے رے!

کن کرموں کا پھل ہے تُو
تن بیچے تو کسبی ٹھہرے
من کا سودا کرے اور پتنی کہلائے
سمے کے ہاتھوں ہوتا رہے گا
کب تک یہ اپمان
ایک نوالہ روٹی
ایک کٹورے پانی کی خاطر
دیتی رہے گی کب تک تُو بلیدان!

جس طرح کسی جسمانی عارضہ کے علاج کا پہلا قدم اس کی صحیح تشخیص ہے اسی طرح معاشرے کی تاریکیوں اور ناانصافیوں کو منظر عام پر لانا بھی ان کی اصلاح کی جانب اشارہ کا حکم رکھتا ہے۔ پروین کی پوری شاعری انسانی صورت حال کی ایسی تفسیر ہے کہ اس کی مثالیں منتخب کرنا خاصا ناممکن سا نظر آتا ہے۔ یہ تو اس کی دنیائے شعر کی پوری روح اور اس کائنات ہے۔ کہاں تک حوالے دیئے جائیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ''ٹماٹو کیچپ'' جیسی نظم پر ہمارے معاشرے کا نام نہاد دانشور اور تخلیقی طبقہ کانپ کر نہ رہ گیا ہوگا۔

ہمارے ہاں
شعر کہنے والی عورت کا شمار عجائبات میں ہوتا ہے
ہر مرد خود کو اس کا مخاطب سمجھتا ہے
اور چونکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا
اس لیے اس کا دشمن ہو جاتا ہے!
سارا[1] نے ان معنوں میں
دشمن کم بنائے
اس لیے کہ وہ وضاحتیں دینے میں
یقین نہیں رکھتی تھی

وہ ادیب کی جورو بننے سے قبل ہی
سب کی بھابی بن چکی تھی
ایک سے ایک گئے گزرے لکھنے والے کا دعویٰ تھا
کہ وہ اس کے ساتھ سو چکی ہے
صبح سے شام تک
شہر بھر کے بے روزگار ادیب
اس پر بھنبھناتے رہتے
جو کام کاج سے لگے ہوئے تھے
وہ بھی
سڑی بُسی فائلوں اور بوسیدہ بیویوں سے اُوب کر
ادھر ہی آتے

---

(۱) سارا شگفتہ

(بجلی کے بل، بچے کی فیس اور بیوی کی دوا سے بے نیاز ہو کر
اس لیے کہ یہ مسائل
چھوٹے لوگوں کے سوچنے کے ہیں)
سارا دن
ساری شام
اور رات کے کچھ حصے تک
ادب اور فلسفے پر دھواں دھار گفتگو ہوتی
بھوک لگتی تو
چندہ وندہ کر کے
نکڑ کے ہوٹل سے روٹی چھولے آ جاتے
عظیم دانشور

اس سے چائے کی فرمائش کرتے ہوئے کہتے
تم پاکستان کی امرتا پریتم ہو
بے وقوف لڑکی
سچ سمجھ لیتی
شاید اس لیے بھی
کہ اُس کے نان ونفقہ کے ذمہ دار تو اسے ہمیشہ
کافکا کی کافی پلاتے
اور نرودا کے بسکٹ کھلاتے رہتے
اس رال میں لتھڑے ہوئے compliment کے بہانے
اُسے روٹی تو ملتی رہی
لیکن کب تک
ایک نہ ایک دن تو اسے بھیڑیوں کے چنگل سے نکلنا ہی تھا
سارا نے جنگل ہی چھوڑ دیا!
جب تک وہ زندہ رہی
ادب کے رسیا اسے بھنبھوڑتے رہے
ان کی محفلوں میں اس کا نام
اب بھی لذیذ سمجھا جاتا ہے
بس یہ کہ اب وہ اس پر دانت نہیں گاڑ سکتے
مرنے کے بعد انہوں نے اسے
ٹماٹو کیچپ کا درجہ دے دیا ہے!

یہ درست ہے کہ دنیا کا کوئی بھی معاشرہ ذہنی منافقت اور دلی بددیانتی سے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا مگر ترقی پذیر ممالک میں ان کا چلن خوفناک حد تک موجود ہے اس کی بنیادی وجہ جہالت' غربت اور غیر جمہوری روایات کا تسلّط ہے۔ پروین شاکر صرف پاکستانی معاشرے ہی کی نہیں پوری انسانیت کی بات کرتی ہے اور اکثر اس میں عورت مرد

کی تخصیص نہیں نفرتیں ہوتی۔ وہ انصاف، رواداری اور محبت ایسی اعلیٰ انسانی اقدار کی علمبردار ہے۔ پروین جیسے اسلوب شعری میں ادا ہونے والے یہ مضامین کسی نہ کسی طور معاشرے پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ دیکھئے طالع آزماؤں اور سورج مکھی سرشت والوں کا کیا عالم اس بے مثال نظم میں کھلتا ہے۔ یہ سیاسی اور معاشرتی حالات پر ایک عورت کی تفہیم اور بصیرت کی ایک مثال ہے۔

"شہزادی کا المیہ"

محل کے نیچے
ہجومِ عشاق منتظر ہے
کہ خواب گہہ کا حریری پردہ ذرا ہٹے تو
سب اپنے اپنے شناخت نامے ہوا میں لہرائیں
اور یہ کہنے کا موقع پائیں
کہ عُلیا حضرت!
ہمیں بھی پہچانیے
کہ ہم نے
خزاں کی رت میں
سیاہ اپریل کے اوائل میں
شامِ بے وارثی اترنے کی ساعتِ بے لحاظ میں
دودمانِ عالی جناب کو چادرِ عزا نذر کی تھی
جن کے کناروں پہ تارِ خوں سے اب تک
ہمارے ناموں کے حرف اول کشیدہ ہوں گے
جو خامشی سے، کھلے سروں اور ننگے قدموں سے
پارۂ نان و جرعۂ آب لے کر
اُس شام سمتِ مقتل گئی تھیں
وہ عورتیں ہمارے نکاح میں تھیں

سوادِ شہر صبا میں
خوشبو کی واپسی کے لیے
وہ ہم تھے
جو مثلِ خاشاک در بدر تھے
شمالی یورپ کے دور افتادہ یخ کدے میں
تمام مرکزی نظامِ حرارت و نور و نغمگی میں
وہ ہم تھے جو
سخت اجنبیت کی برفباری میں جل رہے تھے
اور اپنے گھر بار' اپنی املاک' اپنے پیشوں سے دور ہو کر
نئے وسیلوں سے رزق کی دوڑ میں تھے شامل
خمیری روٹی کی یاد میں
سینوچ پر کرتے رہے گزارا
(یہ کارِ غالیچہ و جواہر تو صرف فرصت کا مشغلہ تھے)
جو لوگ گمنام و سادہ دل تھے
سرشتِ موسم نہیں سمجھتے تھے
اور پیچھے وطن میں رہ کر
ہمارے حصے کے دن
عقوبت کدوں میں تنہا گزارنے
اور ہمارے حصے کے کوڑے بھی
نوشِ جاں کرنے میں منہمک تھے
(شراکت کار بھی تو کوئی اصول ٹھہرا)
مباح ہو گا کہ ان کی قربانیوں کا بھی کچھ حساب ہو جائے
اور عطا ہو
انہیں بھی

دینارِ سرخ و رہوارِ مشک رنگ و اراضی بزہ آفرین و
کلاہِ زرتار و خلعتِ کارچوب و دوشالہ
شاہ طوسی!

جہاں پنہ!
یہ تو دیکھیے
آپ کے لیے
ترک ہم نے کیا کچھ کیا ہے اب تک
کہیں ترقی کا ایک زینہ
کہیں عنایاتِ خسروی کا کوئی وسیلہ
کہیں کوئی منفعت اثر رشتۂ سیاست
کہیں کوئی سیم رنگ شملہ
کہیں کوئی زرنگاہ طرّہ

اور ان سے بڑھ کر
وطن کی خوشبوٴ وطن کی گرمی!
ہمارے ایثار کے تناسب سے
اب صلے کی نوید پہنچے
کسی دیارِ غزال چشماں و گل عذاراں میں ہم کو تفویض ہو سفارت
مناصب و مال و فصل و املاک کی وزارت
نہیں تو بابِ مشاورت ہی کھلے کسی پر
جو یہ نہیں تو
کسی علاقے کی صوبہ داری
کسی ریاست میں منصب چار دہ ہزاری
بکارِ خاص افسروں کی لمبی قطار ہی میں کوئی جگہ دیں
ہمیں صلہ دیں!

کسی طرح قربِ تاج و دربار کی فضیلت ہمیں عطا ہو
حضور کی بارگاہِ جود و سخا میں
حاضر جو ہونا چاہیں
تو کوئی درباں ہمیں نہ روکے
تو کوئی حاجب' مقربِ خاص تک نہ ٹوکے
غلام گردش میں مثلِ موجِ صبا گزرنے کی ہو اجازت!
یہ کیا کہ
ہم سے کہیں بعد آنے والے تو راج رتھ میں اڑے پھریں
اور ہم فقط گردِ راہ دیکھیں!
ہمیں صلہ دیں!
عریضوں اور عرضیوں کے طوفانِ بے پناہ میں
گھری ہوئی ایک شاہ زادی
کبھی کبھی سوچتی تو ہو گی
کہ اپنی چھوٹی سی سلطنت کو
جو پہلے ہی دشمنوں کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہی ہے
خود اپنی پیاری سپاہ سے کس طرح بچائے!

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے پروین کی پوری شاعری اپنی ذات میں ایک حوالہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس نے معاشرے پر تنقید کرتے ہوئے باغیانہ لہجہ ایک ضبط کے ساتھ اختیار کیا ہے کہیں بھی نعرہ بازی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اس کے لہجہ کی یہی تہذیب اور شائستگی اس کو تمام ہمعصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

ہجوِ ملیح کا یہ سلیقہ اور کہیں نظر نہیں آتا۔

"ظلِ الٰہی کے پرابلمز"

راج پاٹ کرنے والوں کی جان
ہتھیلی پر رہتی ہے

بے چاروں کے مسائل کیسے عجب ہوتے ہیں
کبھی اس باجگزار ریاست کی شوریدہ سری
کبھی اس زیرِ نگیں صوبے کی نافرمانی
کبھی خود پایۂ تخت کے اندر غیر مناسب بیداری
کبھی سپہ سالارِ اعظم کا شوقِ لشکر آرائی
کبھی امیرِ مطبخ کی خاصے میں خاصی غیر ضروری دلچسپی
شہزادوں کی شورہ پشتی
حرم سرا میں پلنے والی چھوٹی بڑی سیاست
بالاعلان بغاوت' درپردہ سازش!
دشمن جلد ہی کھل جاتے ہیں
ان سے نبٹنا اتنا مشکل کام نہیں
الجھاوا تو پاؤں چومنے والوں سے پڑتا ہے!
اور ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں
ایک تو کتے ____
اپنی وفاداری میں شہرۂ عالم رکھنے والے
جب تک جی چاہے پیروں میں لوٹتے ہیں
پھر اپنی ہڈی لے کر الگ ہو جاتے ہیں
دوسری قسم زیادہ مہلک ہے
یہ دو پیروں پر چلتی ہے
دیکھنے میں انسان مگر باطن کے ریچھ
تلوے چاٹتے چاٹتے اپنے پیارے آقا کو ایسا کر دیتے ہیں کہ
ایک سہانی صبح کو جب
اپنی کنیزِ خاص کی بھیرویں سن کر آنکھیں کھولتے ہیں تو
ظلِ الٰہی

اپنے پاؤں ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں!

''ایک افسر اعلیٰ کا مشورہ'' بھی مادہ پرست معاشرہ پر ہجو ملیح کی ایک مثال ہے۔

میرے ایک افسر اعلیٰ نے
ایک دن مجھے اپنی بارگاہِ خاص میں طلب کیا
اور ایک دو فائلوں کا حال پوچھنے کے بعد
میری غیر سرکاری مصروفیات پر چیں بہ جبیں ہوئے
معاشرے میں شاعر کی اوقات پر روشنی ڈالی
خلاصہ گفتگو یہ کہ
ملک میں شاعر کی حیثیت وہی ہے
جو جسم میں اپنڈکس کی
بے فائدہ ___ مگر کبھی کبھی سخت تکلیف کا باعث
سو اس کا ایک ہی حل ہے ___ سرجری!
چشمِ تصور سے، میری شخصیت کے اپنڈکس سے نجات پا کر
کچھ شگفتہ ہوئے
پھر گویا ہوئے
ایک آئیڈیل افسر وہ ہے
جس کا کوئی چہرہ نہیں ہوتا
پہلے اس کے ہونٹ غائب ہوتے ہیں
پھر آنکھیں
اس کے بعد کان
آخر میں سر
ہونٹوں، آنکھوں، کانوں اور سر سے نجات پائے بغیر
کوئی افسر، فیڈرل سیکرٹری نہیں بن سکتا!
اپنی بات پر زور دینے کے لیے

انہوں نے دو ایک مشہور سر کٹے افسروں کا حوالہ دیا
لیکن میرے چہرے پر
شاید انہوں نے پڑھ لیا تھا
کہ یہ بے وقوف لوکل شاعر رہنے میں ہی خوش ہے
سو بدمزہ ہو کر
انہوں نے مجھے واپس جانے کی اجازت مرحمت فرمادی
اور میں بے وقوف
ایک نئی نظم کو سوچتی ہوئی اپنے دفتر لوٹ آئی
اپنی A.C.R میں
سُرخ روشنائی کے ایک ممکنہ اندراج کے باوجود!
آخر میں اس طلسم شخصیت شاعرہ کی الہامی کیفیت کا تذکرہ کرنے کو جی چاہتا ہے جس نے زندگی کے عین عروج پر موت کی آہٹ سن لی تھی اور فنا کے سایے کو تعاقب کرتے محسوس کرلیا تھا۔

کھول دیں زنجیرِ در اور حوض کو خالی کریں
زندگی کے باغ میں اب سہ پہر ہونے کو ہے

موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے دل میں کیوں
کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے

دل کو مہر و مہ انجم کے قریں رکھنا ہے
اِس مسافر کو مگر خاک نشیں رکھنا ہے

سہہ لیا بوجھ بہت کوزہ و چوب و گل کا

اب یہ اسبابِ سفر ہم کو کہیں رکھنا ہے

ایک سیلاب سے ٹوٹا ہے ابھی ظلم کا بند
ایک طوفاں کو ابھی زیرِ زمیں رکھنا ہے

رات ہر چند کہ سازش کی طرح ہے گہری
صبح ہونے کا مگر دل میں یقیں رکھنا ہے

درد نے پوری طرح کی نہیں تہذیب اس کی
ابھی اس دل کو ترا حلقہ نشیں رکھنا ہے

مگر کچھ لوگ مر کر زیادہ زندہ اور فنا ہو کر زیادہ پائندہ ہو جاتے ہیں اسی کو فن کا رنگِ ثباتِ دوام کہا گیا ہے۔

تحریر و تحقیق: خالدہ حسین

شبنم شکیل

نام شبنم عابد علی، شادی کے بعد شبنم شکیل۔ تخلص شبنم۔ عظیم شاعر، ادیب، نقاد اور دانشور سید عابد علی عابد کی صاحبزادی ہیں۔ لاہور میں پیدا ہوئیں۔ یونیورسٹی اور نٹیل کالج لاہور ہی سے اردو ادبیات میں ایم اے کیا اور بعد میں درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہوئیں۔

عظیم علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث شعر و ادب کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ ان کا گھر شعری و ادبی نشستوں کا مرکز تھا۔ وقت کے مستند شاعر اور ادیب ان نشستوں میں شرکت کرتے۔ سید عابد علی عابدؔ، صوفی غلام مصطفےٰ تبسمؔ، فیض احمد فیضؔ، ڈاکٹر سید عبداللہ اور قتیل شفائی کے زیرِ سایہ شبنم کے شعری ذوق کی تربیت ہوتی رہی۔ یہ اصحاب کلاسیکی اردو شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری کی پوری روایت کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ فارسی، اردو، انگریزی ادب کی درس و تدریس کے ساتھ بھی ان کا تعلق تھا۔ اس طرح یہ کلاسیکی اور جدید شعری رجحانات کے علمبردار اور روحِ رواں تھے۔ ان کی شاعری اردو فارسی کی کلاسیکی روایت اور جدید مغربی رجحانات کا امتزاج تھی۔

شبنم کے سنِ شعور کو پہنچتے پہنچتے نوزائیدہ مملکت پاکستان مستحکم ہونے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ ابھی آزادی کے جلو میں آنے والے فسادات اور اس کی تباہ کاریاں اور انسانی اقدار کی شکست، تعصب اور نفرت کے نتیجے میں جنم لینے والی بربریت کی المنا کی تازہ تھی۔ بلکہ کام و دہن کا زہر رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ جیسا کہ دیکھا گیا ہے پُر آشوب دور تخلیقی فن کے سرچشموں کو تحریک دیتے ہیں۔ اس وقت کا لاہور بھی شعر و ادب کی گہما گہمی سے دھڑک رہا تھا۔ فسادات کے المیے اور ہجرت کے تجربے کو اپنے اظہار کے لیے شعر و

ادب سے بڑھ کے اور کیا فورم مل سکتا تھا۔ تب شعر و ادب ایک سنجیدہ مسئلہ تھا اور اہلِ علم اسے نہایت سنجیدگی سے لیتے تھے۔ ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ ایک طرف میر کی روایت حیاتِ نو پا رہی تھی تو دوسری طرف انقلابی شاعری اپنا رنگ جما رہی تھی۔ فیض، مجاز، جذبی، ساحر، اختر الایمان اور ناصر کاظمی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ کچھ عرصے بعد ابنِ انشاء بھی اس میں شامل ہو گئے۔

شبنم کے اپنے کہنے کے مطابق اس نے پہلی غزل سن ساٹھ کے لگ بھگ کہی۔ اظہارِ خیال کے لیے غزل کا پیرایہ منتخب کرنا اس کے روایت پسند دھیمے مزاج کا پتہ دیتا ہے۔ حالانکہ فیض بحیثیت ایک ترقی پسند نظم گو شاعر اس وقت بے حد مقبول تھے۔ مگر نو عمر شبنم نے انہیں نہ تو اپنے رول ماڈل تخلیق کار کی صورت قبول کیا نہ ہی انقلابی رجحانات کے ساتھ مناسبت محسوس کی۔ ایک تو نو مشقی کے دور میں ایسا کوئی انتخاب تخلیق کار کے مدِ نظر نہیں ہوتا۔ وہ بآسانی جو بھی فارم اپنا سکے اپنا لیتا ہے۔ شبنم چونکہ آس پاس زیادہ تر غزل ہی سنتی پڑھتی چلی آئی تھیں۔ اس لیے انہوں نے یہی فارم اپنائی اور روایتی مضامین سے شاعری کا آغاز کیا۔ یہ تو بہت مشق کے بعد، جب تخلیق کار کے مطالعے میں وسعت اور گہرائی آتی ہے اور اس کے اندر تنقیدی بصیرت کوئی واضح صورت اختیار کرتی ہے تو وہ اپنے لیے ہیئت اور موضوع کا انتخاب کرنے پر قادر ہوتا ہے۔

جیسا کہ شبنم کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے والد نے کبھی شعوری طور پر اور بالالتزام بحیثیت شاعر ان کی تربیت کی کوشش نہیں کی۔ ان کی توجہ زیادہ تر اپنے بچوں میں علم اور کتاب کی محبت پیدا کرنے کی طرف رہی۔ جب انہیں اپنی بیٹی کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ ہوا تب بھی انہوں نے اس کو کسی خاص نہج پر چلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ غیر ضروری حوصلہ افزائی سے بھی احتراز کیا۔ اور اسے خود اپنا راستہ تلاش کرنے کی راہ دکھائی۔ البتہ زبان کے معاملے میں وہ بہت محتاط بلکہ سخت گیر تھے۔ الفاظ کا صحیح استعمال، تلفظ کی درستگی اور زبان میں کوئی بدعت نہ لانا ان کے نزدیک شاعری کے بنیادی لوازمات تھے۔ سو الفاظ کی تراش خراش اور صوتی آہنگ اور معانی کی مختلف پرتوں کے بارے میں شبنم شروع ہی سے بہت حساس ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سید صاحب کی اسی دور اندیشی کے باعث شبنم نے

بہت جلد اپنے اندر کی نسائی شخصیت کو فنی طور پر نہ صرف قبول ہی کیا بلکہ اس کا برسرِ عام اعتراف کر کے اس کے تمام تجربوں کی ترجمانی کی۔ گو ان سے پہلے ادا جعفری شاعری میں اپنا نمایاں اور مستحکم مقام حاصل کر چکی تھیں۔ مگر ان کی غزل میں نسائی لہجہ اتنا واضح اور مستقل نہ تھا۔ غزل کی روایت میں جہاں طالب و مطلوب دونوں ہی مردانہ صفات کے مالک تھے نسائی حقیقت اور موضوعات لے کر آنا بہت بڑی جدّت تھی۔

زہرا نگاہ کی غزل پر فیض کے اثرات بڑے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کا ابتدائی کلام جو غزلیات پر مشتمل ہے مشاعروں میں بے حد مقبول ہوا۔ اس غزل کے موضوعات محبت کے روایتی تجربے پر مشتمل ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ شام کا پہلا تارہ ۱۹۸۰ء میں آیا۔ ۵۰ء سے ۸۰ء تک کے قریباً تیس سالہ عرصے میں انہوں نے اپنے آپ کو نظم کی نہایت منفرد اور باکمال شاعرہ ثابت کر دیا۔ نظم میں نسائی حیثیت کے فنکارانہ اظہار میں ان کا تقدم صاف اور واضح ہے۔ غزل میں کریڈٹ ہمیں شبنم اور پروین شاکر کو دینا ہوگا۔ شبنم کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کا پہلا مجموعہ ''شب زاد'' بہت تاخیر سے آیا (۸۶ء) جبکہ پروین شاکر جونیئر ہونے کے باوجود اپنا مجموعہ خوشبو اس سے بہت پہلے اور کم عمری میں لے آئیں۔ اور ادب کی دنیا میں جب تک تخلیقات کو کتابی صورت نہ ملے ان کی کوئی مستقل قدر و قیمت متعین نہیں ہو سکتی۔

شبنم کا پہلا شعری مجموعہ ''شب زاد'' تمام تر غزلیات پر مشتمل ہے ان غزلیات میں روایتی رنگ و آہنگ بھی ہے اور شاعرہ کے منفرد تجربات کی جھلک بھی۔ روایتی رنگ نیم رومانی کیفیت پر مشتمل ہے مگر کہیں بھی محبت کا کوئی توانا تجربہ نظر نہیں آتا۔ کسی جذباتی وابستگی اور اس کے ساتھ مربوط یادوں کا ایک سلسلہ کبھی کبھار ڈوبتا ابھرتا ضرور نظر آتا ہے۔

عشق کا جو شدید تجربہ اور سرخوشی انکی ہمعصر شاعرات مثلاً زہرا نگاہ۔ فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر کے ہاں تواتر کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ شبنم نے اس پر بہت سی بندشیں عائد کر رکھی ہیں۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ شبنم نے اسی تجربے کو بالالتزام ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ ایسی جذباتی وابستگی کے کچھ ہلکے سے اشارے ادھر ادھر مل جاتے ہیں۔

اس شہر کی گلیوں سے کیا میرا تعلق تھا
کیا سوچ کے میں ان سے سو بار مگر گزری

وقت کی گرد نے دھندلا دیئے سب نقش و نگار
ورنہ دل ایک دھنک رنگ مکاں تھا پہلے

میں نے وہ اوراق ہی اس میں سے غائب کر دیئے
تھا کتابِ جاں میں جو خوابوں کے ابریشم کا باب

مٹا ڈالا ہے اب دل سے وہاں جو نام کندہ تھا
جسے سن کر کبھی یہ دل دھڑکنا بھول جاتا تھا

شبنم نے محبت کے اس نوخیز تجربے کو اگر کبھی موضوع شعر بنایا بھی تو وہ اشعار اس کے مجموعۂ کلام میں موجود نہیں۔ اس طرح انسانی ذات کو وسعت اور ترفع بخشنے والے اس جذبے کی حکایت ہمیں اس کے ہاں کم کم دکھائی دیتی ہے۔ اس کے ہاں محبت میں بھی شعورِ انا ایک دیوار ہے جو خود سپردگی اور محبوب کی ذات میں مدغم ہونے کے راستے میں حائل ہے۔ اس کا استدلال اُسے کبھی حدِ اعتدال سے آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ جب کہ وہ خود تسلیم کرتی ہے کہ عشق میں حدِ اعتدال سے آگے گزر جانا شرطِ اوّل ہے۔ شروع ہی سے وہ ایک انتہائی خود آ گاہ عورت نظر آتی ہے جسے پورا احساس ہے کہ اسے چاروں طرف سے ایک سخت گیر معاشرہ گھیرے ہوئے ہے اور گو اسے حسن سے لگاؤ ہے مگر زندگی عزیز ہے۔ اپنے ترک کردہ یا دبائے ہوئے جذبوں کے سامنے وہ کبھی کبھار مجوب بھی نظر آتی ہے۔

معذرت کرتے ہوئے لگتے ہیں اپنے آپ سے
میرے بچپن کا زمانہ اور مرا عہدِ شباب

یہ ایک خالصتاً نسوانی رویہ ہے۔ مرد عشق میں رسوائی کو طرّے کی طرح سر پہ

سجائے پھرتا ہے۔ یہ گویا معرکۂ عشق میں سرخرو ہونے کا پروانہ ہے۔ عورت اکثر اس کو ایک حادثہ سمجھ کر فراموش کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے کہ وہ معاشرے کے بندھے ٹکے اصولوں اور تعصّبات سے ٹکرانے کی ہمت نہیں رکھتی کہ ہر عورت ہیر اور سسی نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً جس معاشرے میں عورت کی سلامتی اور ایک باوقار زندگی کا انحصار معاشرے سے مفاہمت میں ہو اور جب عورت کے ساتھ بے شمار رشتوں اور تعلقات کا تقدس اور تحفظ وابستہ ہو تو اسے حدِ اعتدال ہی میں رہنے میں عافیت نظر آتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شبنم نے اردو شاعری کو ایک رکھ رکھاؤ والی گھریلو عورت یا گھر والی کا تصور دیا۔ جو اپنے تمام جذبوں اور تجربوں کو اس کردار کا مطیع رکھنا چاہتی ہے۔ یہ اور بات کہ وقتاً فوقتاً اس مصلحت کا پردہ چاک ہوتا رہتا ہے اور حقیقی جذبے اپنی جھلک دکھاتے رہتے ہیں۔

عمر بھر کے ضبطِ غم کو بھولنے کا وقت ہے
اب ہمیں دل کھول کر آنسو بہانا چاہیے

ہم ایک ایسے روایتی معاشرے میں زندہ ہیں جہاں عورت کی کامیابی کی انتہا ایک آسودہ عائلی زندگی کو سمجھا جاتا ہے۔ عورت کی تمام تر تعلیم و تربیت اسی ایک مقصد کو سامنے رکھ کے کی جاتی ہے کہ وہ ایک اچھی بیوی اور بہترین ماں ثابت ہو سکے۔ اس کی اصل شخصیت' اس کی امنگیں اور آرزوئیں۔ بہ حیثیت ایک نسائی ہستی اس کی عزتِ نفس۔ شعور کی پرداخت۔ معاشرے کی ایک موقر فرد کی حیثیت سے اس کی صلاحیتوں کی نشوونما۔ اعتمادِ ذات۔ فکری بالیدگی اور قوت ارادی کے استحکام کو کبھی پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ بیس سال عمر تک کی ساری ذہنی کامرانیوں پر اس وقت خطِ تنسیخ پھر جاتا ہے جب والدین لڑکی کو بخیر و عافیت رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بحیثیت ایک ذہین اور خود مختار فرد اپنی ہستی کھو دیتی ہے۔ اور بطور ایک خانہ دار' بیوی اور ماں اپنی صلاحیت منوانے کی پابند کر دی جاتی ہے۔ معاشرے میں اس کا عزّ و وقار اسی صورت حال سے وابستہ سمجھا جاتا ہے۔ جو لڑکیاں بر وقت یعنی بیس پچیس برس عمر تک شادی کی زندگی شروع نہیں کر سکتیں۔ ان میں خود بخود کئی طرح کے ذہنی اور جذباتی دباؤ اور احساسِ کمتری کی صورتیں نمایاں ہونے لگتی ہیں۔ جسے فرسٹریشن کا نام دیا جاتا ہے۔ مگر شادی کی صورت

میں جب عورت کو اپنے تشخص کی قیمت پر نئے ماحول اور رفیق حیات کے ساتھ سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں تو اس پر معاشرے کی نظر بہت کم پڑتی ہے۔ اگر یہ سمجھوتے کوئی بڑا بحران پیدا نہیں کرتے تو سب کی نظروں سے روپوش رہتے ہیں اور راوی چین ہی چین لکھتا ہے اور ایک عورت کی کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے یا کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد عورت کی زندگی میں تا دمِ آخر جو کچھ ہوتا ہے۔ دو انائیں جس طرح آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں۔ اندر ہی اندر چلنے والی سرد جنگ اور عورت کے باطن میں ادھورے پن کی خلش اور اس کے مضمرات۔ ان سے عام طور پر معاشرے کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ جب تک کہ گھر چلتا ہے۔ عورت ایک گھر والی کے روپ میں متمکن ہے کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن ایک حساس عورت کے لیے تمام مسائل یہیں سے شروع ہوتے ہیں کیونکہ وہ ایک کٹھ پتلی کی زندگی بسر نہیں کرنا چاہتی۔

شبنم نے زندگی کے اس حصے کو اپنا مرکزی موضوع بنایا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی شاعری منکوحہ محبت کی داستان ہے تو غلط نہ ہوگا۔

مشرقی اور خصوصاً اسلامی یا برصغیر کے مسلم معاشرے میں مرد خاندان کا کفیل اور مالک و مختار ہے جبکہ عورت اس کی مطیع رہ کر گھر کے معاملات سنبھالتی اور چلاتی ہے۔ اس کو معاشرے میں جو بھی مقام حاصل ہے وہ مرد کی طفیل ہے۔ زندگی کی ساری سہولتیں اور سوسائٹی میں عزو وقار اسی کے دم سے ہے۔ اگر عورت اور مرد دونوں کسبِ معاش کرتے ہوں تب بھی تحکم اور فوقیت مرد ہی کو حاصل ہے۔ سکہ اسی کے نام کا چلتا ہے۔

خود رات گئے آیا جھنجھلا کے بہت بولا
کیا سکھ ہے مجھے گھر میں ہر روز کا مرنا ہے

سو شبنم کے ہاں ایک ایسی گھریلو فضا ملتی ہے جس میں ایک گھر والی شوہر کو اپنا محبوب مانتی ہے۔ اور اس کی محبت حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری ذات وقف کر دیتی ہے۔ وہ پورے خلوص کے ساتھ اس رشتے کی ابتدا کرتی ہے اپنا ماضی حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالتی ہے۔ فراموش کر دیتی ہے اور وہ جذباتی وابستگیاں جو کبھی شادی سے پہلے اس کے سرسبز و شاداب دل میں بہار بن کر آئی تھیں اب اس کے لیے ایک تہمت بلکہ جرم کی صورت

اختیار کر جاتی ہیں۔ وہ اپنا ماضی ہمیشہ کے لیے دفن کر دیتی ہے۔ جبکہ مرد اپنے ماضی کی ہر یاد اور تجربے کو حرزِ جاں بنائے رکھتا ہے اور اس پر نازاں رہتا ہے۔ مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی بیوی ایک ''باماضی'' عورت ہو۔ اس کا حوالہ محض اور محض شوہر کی ذات ہونا چاہیے۔ اور اس کی ہر سانس شوہر کی رضا کی پابند۔

وہ اندھیری کوٹھری میں مجھے بیٹھنے سے روکے
مرے آنسوؤں پہ ہنس دے جو دیا جلا کے رکھوں

روزِ ازل سے طے یہ ہوا تھا کٹ جائے بس ایسے ہی
میری عمر جواب دہی میں تیری عمر سوالوں میں

نہ سہی جنسِ گراں اس قدر ارزاں بھی نہ تھی
کس سہولت سے مگر تو نے مجھے ہار دیا

اس طرح عورت ہمہ وقت کٹہرے میں کھڑی ہے۔ اس کے عام معصوم روزمرہ اعمال اور مصروفیات کو بھی شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بے خبری میں کہی جانے والی باتوں کو ذومعنی قرار دے کر تفتیش کی جاتی ہے اور اس طرح اسے ایک ناقابلِ علاج احساسِ جرم کا شکار کر دیا جاتا ہے۔ اسی لیے وہ ناکردہ گناہوں کا خمیازہ بھی خاموشی سے بھگتی رہتی ہے۔

میں زندگی میں مروں گی نہ جانے کتنی بار
مجھے خبر ہے کہ رشتہ مرا صلیب سے ہے

اس کے وقت کے ایک ایک لمحے کا حساب مانگا جاتا ہے۔ مگر گھر کا تحفظ اور معاشرے کا اعتبار حاصل کرنے کے لیے عورت کو اپنی عزتِ نفس اور حریتِ فکر کی قربانی دینی پڑتی ہے اور اس کے عوض وہ بے شمار آسائشیں اور سہولتیں ملتی ہیں جنہیں شبنم نے سونے کے قفس اور ریشم کے انبار کا نام دیا ہے۔

آپ سونے کا قفس لانے کی زحمت مت کریں
ہم وہ طائر ہیں کہ جن کے بال و پر باقی نہیں

اب دفن رہوں گی اسی ریشم کے کفن میں
جب اس کے سوا دوسری صورت بھی نہیں ہے

اس زندگی کے کھیل میں سائے کا ہی سہی
کرنا ہے جب ادا یہی کردار کر ہی دیں

عورت کے لیے شادی اپنی ساری کشتیاں جلا دینے کا نام ہے۔ جب وہ سسرال اپنے گھر قدم رکھتی ہے تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی۔ اپنے میکے کی دہلیز پار کرنے گویا ایک دنیا سے دوسری دنیا تک کا سفر ہے اور اس سفر کو دوہرایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ برِصغیر کے روایتی معاشرے میں ہر لڑکی جانتی ہے کہ وہ شادی کر کے تمام رشتوں کے عوض محض ایک رشتے کا انتخاب کر رہی ہے اور یہ صرف اس کے ساتھ نہیں۔ برسوں صدیوں سے عورت کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔ اسی لیے ماں اپنی بیٹی کو سب کچھ سہنے کی عادت ڈالتی ہے اور لوگوں کی کڑوی کسیلی باتوں کو گھونٹ گھونٹ لہو میں اتارنے کی تربیت دیتی ہے۔ وہ بیٹی میں باغی روح بیدار نہیں ہونے دیتی اور اخلاق کے تمام معیار ایثار۔ قربانی۔ قوتِ برداشت اور پھر غیر مشروط اطاعت کے حوالے سے قائم کرتی ہے۔

بچپن سے سب سہنے کی عادت ماں نے ڈالی تھی
کنکر تھے کچھ ہنڈیا میں اور اک بچوں والی تھی

سسرال کے سب طعنے چپ چاپ سہے جاؤں
میکہ جو نہیں میرا اس گھر ہی میں رہنا ہے

وہ معاشرے میں اپنے عزّ و وقار کی خاطر اپنے ضمیر کے خلاف سمجھوتے کر کے

اپنے گھر کو بچائے رکھتی ہے۔ مگر ایک سچی، مخلص اور پھر حساس، تخلیقی عورت کے لیے ضمیر کو کچلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اپنے ان سمجھوتوں کو وہ مصلحت پسندی اور مصلحت اندیشی اور عقل و تدبر کا نام دیتی ہے مگر اس کے دل کے اندر کی سچی عورت جسے وہ اپنی ہمزاد بتاتی ہے۔ اسے اس منافقت پر کسی دم چین نہیں لینے دیتی۔ اس طرح وہ اپنی سب سے بڑی محتسب بن جاتی ہے۔

پہلے صداقتوں کے وہ پرچار اور دل
اب قول و فعل کے یہ تضادات اور میں

دروغِ مصلحت آمیز پر رہی قائم
یوں اپنی بات ابھی تک ہوں میں بنائے ہوئے

اس سلسلے میں نظم "ایک دفعہ کا ذکر ہے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جس میں معاشرے کی نگاہ میں گری ہوئی ایک عورت، ایک اعلیٰ نسب عالیشان بیگم کو یہ احساس دلاتی ہے کہ ہر عورت مرد کی زر خرید ہے اور اسے لبھانے بہلانے پر مجبور و مامور۔ کوئی یہ کام سرِ عام کرتی ہے اور کوئی گھر کی خلوت میں شوہر کے سامنے۔ اپنے فکر و خیال اور تصورات کے مطابق زندگی بسر کرنا کسی کے بھی اختیار میں نہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے

ملی تھی مجھ کو اک بوڑھی طوائف ایک محفل میں
جو خود پیشہ نہیں کرتی تھی، اک چکلا چلاتی تھی
مرے جیسی گھریلو بیویوں کے دل جلاتی تھی
تھی اسی کے ساتھ اک من موہنی سی نوجواں لڑکی
جو اس رنگین محفل میں برائے رقص آئی تھی
کہ صاحب خانہ کو صورت اس البیلی کی بھائی تھی
یونہی بس اتفاقاً دونوں میرے پاس آ بیٹھیں
بہت ہی زعم میں تھی میں کہ اپنی پاکبازی کے

ذرا سی دیر میں اوقات ان کو ان کی سمجھا دی
بہت سا بوجھ لے کر پھر رہی ہو تم گناہوں کا
حسابِ عاقبت کا خوف بھی تم کو نہیں آتا
یہ سن کر رنگ جیسے اڑ گیا لڑکی کے چہرے کا
ندامت سے سر اس کا جھک گیا بھر آئیں آنکھیں بھی
مگر بڑھیا جو ناچ اوروں کو تگنی کا نچاتی تھی
نظر بازوں کو جو گھر بار کی سدھ بدھ بھلاتی تھی
تاثر لینے والی تھی بھلا وہ ایسی باتوں کا
ہنسی پہلے تو وہ اپنے مِسی آلود ہونٹوں سے
مرے کانوں میں پھر بولی وہ سرگوشی کے لہجے میں
یہاں پر ناچنا پڑتا ہے سب کو پیٹ کی خاطر
ہمیں غیروں کے آگے تم کو شوہر کے اشاروں پر

اس طرح شبنم کی ہمزاد اس کی سوپر ایگو ہے جو اسے حقیقت اور سچ کے راستے سے ادھر ادھر بھٹکتے نہیں دیکھ سکتی اور شبنم نہ تو اس کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہے نہ ہی اس کے بغیر۔ اعلیٰ اقدار کی موت اس کے لیے ایک مسلسل عذاب ہے۔ عورت ایک مسلسل جبر اور روحانی ناخوشی میں زندگی کرنے پر کیوں کر آمادہ ہو جاتی ہے۔ شاید اس لیے کہ آشیاں سازی اس کی فطرت ہے اور رشتوں کی آبیاری اس کا جوازِ ہستی۔ وہ گھر اور بچوں کو سلامتی کے ساتھ منزل پر پہنچانے کے لیے ہر اذیت برداشت کرتی ہے۔

مگر ''شب زاد'' سے ''اضطراب'' تک پہنچتے پہنچتے شبنم نے احتجاج اور حق گوئی کے لیے راہِ سخن وا کر لی۔ اس نے آسائشوں اور سٹیٹس کو زندگی کا بدل تسلیم کرنے سے انکار کی جرأت پیدا کر لی۔ اس نے عزتِ نفس کو ترازو کے ایک پلڑے اور دنیا کی تمام آسائشوں اور راحتوں اور جاہ و جلال کو دوسرے میں ڈال کے دیکھا تو پہلا پلڑا بھاری نکلا۔ گو وہ ایک باغی عورت کا کردار ادا نہیں کر سکتی کیونکہ یہ اس کے مزاج کے خلاف ہے مگر سلیقے اور تحمل کے ساتھ سچ اور خیر کا اعلان کرنے کی جرأت اس کی مسلسل جدوجہد کا ثمر ہے۔

یہیں پہ روک لو آسائشوں کے ریلے کو
کہ جا رہا ہے لیے یہ مجھے بہائے ہوئے

اب تک سوئی تھی وہ آسائش کے گہوارے میں
انگڑائی سی لے کر شبنم آج انا کیوں جاگتی ہے
مسدود ہوئی جس کی ہر اک راہ سراسر
اس صف میں مجھے لا کے کھڑا کس نے کیا تھا

آسائشوں کا احوال یہ ہے کہ ان میں آدمی کے لیے لوبھ بہت ہے بلکہ اس کی نوے فیصد زندگی انہی کے حصول یا آرزو میں نکل جاتی ہے۔ اکثر یہ آدمی کو اپنی مشقت اور سعی سے حاصل ہوتی ہیں۔ کبھی ورثے میں مل جاتی ہیں اور کبھی کسی تعلق کی بنا پر جھولی میں آن پڑتی ہیں۔ ایک باشعور تعلیم یافتہ اور دیانت دار ذہن رکھنے والی عورت کو جب شادی کے نتیجے میں اور شوہر کے حوالے سے وہ بہت سی آسائش اور مرتبہ مل جائے جس سے وہ گذشتہ زندگی میں محروم رہی ہو تو کچھ عرصہ ان سے سیراب ہونے کے بعد یہ اس میں ایک ابتلا کی کیفیت پیدا کرنے لگتی ہیں۔ اس عورت کی عزتِ نفس اتنی حساس ہوتی ہے کہ وہ غیر مشروط بندگی کے عوض یہ سب کچھ حاصل کرنا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ لوگ اسے خوش نصیبی کا نام دیتے ہیں۔ مگر اس کے نزدیک جو کچھ بھی خود اپنی ہمت اور محنت اور استحقاق سے حاصل نہ کیا جائے باعثِ اضطراب ہے۔
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو!

راج سنگھاسن ہے یہ میرا
یا سولی پر چڑھی ہوئی ہوں

آدھی ریت سے باہر ہوں میں
آدھی ریت میں گڑی ہوئی ہوں

ان تمام توقیروں اور گلیمر کی قیمت اسے اپنی آزادی فکر سے چکانی پڑتی ہے۔ اس کی زندگی سے بے ساختگی اور ارادے کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ سب کچھ دوسرے کی رضا کا پابند ہو جاتا ہے۔ اسے وہی کچھ دیکھنا اور سوچنا اور پسند اور ناپسند کرنا پڑتا ہے جو دوسرا چاہتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ سب کچھ ہر عورت محسوس نہیں کرتی۔ یہ اذیت صرف بہت ہی باشعور اور سچی باصلاحیت عورت کا مقدر ہے۔

یہ خیر و شر کی جنگ نہیں ہے یہاں تو بس
ٹکراؤ ہو گیا ہے انا کا انا کے ساتھ

وہ ایک گنگ محل میں زندہ ہے جہاں بات پر زبان کٹتی ہے۔ اور خوابوں پر بھی پابندی ہے۔ وہ زندگی نہیں سرابِ زندگی میں دن بسر کر رہی ہے۔ دنیا کی تمام وسعتیں اس پر علاقہ غیر ہیں۔ اسے زندگی کی مین سٹریم سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اس کی ناؤ کو بہتے پانیوں میں باندھ کر جامد کر دیا گیا ہے۔ ذہنی اور روحانی ارتقاء کا سفر اس پر حرام ہے کیونکہ جس معاشرے اور ماحول میں وہ زندہ ہے وہاں عورت کا منصب محض ایک مضبوط گھر کو قائم و دائم رکھنا ہے۔ مگر ستم یہ کہ اپنی پوری ذات سے قیمت ادا کرنے پر بھی اسے جو گھر اور منصب دان کیا جاتا ہے اس میں استحکام نہیں۔ اس کی بنیاد بہتے پانی پر رکھی گئی ہے۔ اس کا وجود محض تین لفظوں کا محتاج ہے۔ جو کسی بھی وقت ریت کے گھروندے کی طرح منہدم ہو سکتا ہے۔

سو ایک بے یقینی اور بے اعتباری اور خدشات کی یلغار ہے کہ اس عورت کو ہر دم مضطرب رکھتی ہے۔ سوتے جاگتے وہ کسی ان دیکھے حادثے کی زد میں رہتی ہے۔ اسے اپنے گھر کی سلامتی کی فکر ہر دم پنجوں کے بل کھڑا رکھتی ہے۔ کیونکہ زندگی کا معاہدہ مساوی شرائط پر مبنی نہیں۔ وہ عورت ہونے کے باعث receiving end پر ہے اور بے اختیار ہے۔ یاد رہے کہ یہ اس پاکستانی باشعور حساس عورت کی کشمکش ہے جو عورت کے روایتی تصور سے ایک عہد استوار رکھتی ہے اور جدید دنیا کی بھی باسی ہے۔ جو روایت اور جدت۔ استحکام اور انقلاب دونوں کے بہترین اجزا سے ایسا امرت دھارا کشید کرنا چاہتی ہے جو عورت کو ایک بھرپور روشن زندگی کی راہ دکھائے جو اس کی شخصیت کے شگوفے کو آتشیں گلاب کی صورت فروزاں کر کے زندگی کے امکانات روشن کرے۔ بصورتِ دیگر جو عورت پوری کی

پوری روایت سے منسلک ہے یا جو مکمل طور پر عہدِ جدید کا باشندہ ہے اس کے لیے ایسی کوئی کشمکش معرضِ وجود میں نہیں آتی۔ یہ اس عورت کی داستان ہے جو اپنی حسیت کے باعث دو لخت ہے اور باطنی طور پر اپنے آپ سے مصروفِ جنگ رہتی ہے۔ لا انتہا مخالفتوں کے باوجود جس کی روح نے شکست قبول نہیں کی جس کے باطن میں حق کی شمع ہمیشہ فروزاں رہی ہے۔

موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والی
اس تماشا گاہ کے
خوف کے حصار میں
دیکھنا بھی جرم تھا
چیخنا بھی جرم تھا
سوچنا بھی جرم تھا
چھپ کے سامعین سے
چھپ کے ناظرین سے
چھپ کے آسمان سے
چھپ کے اس زمین سے
دیکھتی بھی تھی مگر
چیختی بھی تھی مگر
سوچتی بھی تھی مگر
وہ کہ جس کی زندگی
گول گول گھومتے
دائروں میں کٹ گئی

جنبش ہی سے ہونٹوں کی جو کچھ سمجھو تو سمجھو
اس گنگ محل میں تو بس اتنا ہی روا تھا

دکھ کا منتر پڑھی ہوئی ہوں
میں غربت میں بڑی ہوئی ہوں

ان میں وقت ہی ضائع ہو گا
جن باتوں میں پڑی ہوئی ہوں

راج سنگھاسن ہے یہ میرا
یا سولی پر چڑھی ہوئی ہوں

آدھی ریت سے باہر ہوں میں
آدھی ریت میں گڑی ہوئی ہوں

آدھی مان چکی ہوں اُس کو
آدھی بات پہ اڑی ہوئی ہوں

مجھ کو گرانا سہل نہیں ہے
اپنے سہارے کھڑی ہوئی ہوں

گھر، شبنم کا ایک مستقل استعارہ ہے۔ یہ عورت کی زندگی کا حاصل اس کی پہلی اور آخری پناہ گاہ۔ اس کا عزو وقار۔ ماما کا مسکن۔ بچوں کی قدسی مسکراہٹوں کا منبع۔ شوہر کے (متوقع) اعتماد کا مرکز اور عورت کی غیر مشروط قلمرو ہے۔ بلکہ ایسا ہونا چاہیے۔ مگر یہ بھی سب ایک شخص کے تلونِ طبع کا اسیر ہے۔ اسی لیے وہ اس کے کمزور۔ منہدم یا کسی حادثے کا شکار ہونے کے خوف سے لرزتی رہتی ہے۔

جس گھر کی ہر اک خشت ہے تعویذِ محبت
آسیب کا مسکن تو نہ بنتا وہی گھر بھی

میں جس میں رہ کے ایک مسلسل سفر میں ہوں
اک واہمہ سا ہے کہ وہی میرا گھر نہ ہو

میرا گھر بھر مرے بچوں کی ہنسی سے گونجے
کبھی فرصت ہو میسر تو اتاروں میں نظر

جب صبح ہوئی دیکھا تو ہر گھر تھا سلامت
اک میرا ہی گھر تھا جہاں شب خون پڑا تھا

وہ تو جادو کا بنا تھا ہائے ایسا ہی نہ ہو
لوٹ کر پہنچوں تو دیکھوں اب وہ گھر باقی نہیں

شبنم ایک محتاط مگر اپنے وقار اور حق کے لیے اڑ جانے والی عورت ہے وقت اور معاشرے کی تباہ کاریاں اس کی سربلند روح کو شکست نہیں دے سکیں بلکہ گرم و سرد زمانہ سمو کر اس کے لبوں پر ایک بے نیاز سی مسکراہٹ آ گئی ہے۔

وہ نہ تو کوئی دانشور ہے کہ زندگی کے معاملات کو دو اور دو چار کی نسبت سے نمٹاتی چلی جائے نہ وہ عشق کی ایک جست میں قصہ تمام کرنے کی قائل کہ ایک مخصوص تہذیب نے اسے ہر بندھن خاموشی سے نبھانے اور ہر کام دھیرج سے کرنے کی تربیت دی ہے اسی لیے میرے خیال میں شبنم شکیل دورِ حاضر کی خالص پاکستانی عورت کی تجسیم ہے وہ عورت جو روایت اور روحِ عصر کا امتزاج ہے اور آج اس معاشرے میں اپنے وجود کی جنگ لڑ رہی ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اپنا حق سمجھتی ہے مگر سہاروں کا احترام اس کے خون میں رچا بسا ہے وہ سمجھوتے کو انسانی وقار کی تذلیل سمجھتی ہے مگر معاہدوں کا پاس کرتی ہے۔

مجھے تنہائیوں کی دھوپ لا دو
کسی کے سائے میں مرجھا گئی ہوں
ہوں واقف شہرِ غم کے راستوں سے
وہاں پہلے بھی میں تنہا گئی ہوں

بڑے بڑے صاحبانِ فکر اور نقادوں نے شعر و ادب کو شاعر یا ادیب کی شخصیت کا عکس کہا ہے اور شخصیت اور سوانح حیات کے حوالے سے شاعری یا ادب کا مطالعہ' تنقید کی ایک معتبر روایت ہے میرا کیا منہ کہ اس سے ہٹ کر کوئی بات کروں مگر تجربے نے مجھے یہی بتایا ہے کہ شاعری خصوصی طور پر شاعر کی شخصیت کا ہو بہو عکس نہیں ہوتی یہ اس کی باطنی شخصیت کا اظہار ہوتی ہے۔

وہ شخصیت جو ایک غیر مرئی سائے کی طرح ہمارے ساتھ ہے مگر ہم سے الگ ہے اور ہم اس کے ساتھ مل کر ایک ہو جانا چاہتے ہیں مگر ہو نہیں سکتے اس طرح فن میں اکثر ہم اپنی سماجی شخصیت کے برعکس وہ سب کچھ تلاش کرتے ہیں جس سے دوری ہمیں ہمہ وقت عذاب میں رکھتی ہے شاعری ایک شاعر کی شخصیت کی تکمیل کرتی ہے۔ تخلیق کار اپنی ذات میں دولخت ہوتا ہے تخلیق اس کی ذات کا بہتر نصف ہے ورنہ اصل زندگی میں خون کا منظر برداشت نہ کر سکنے والا فلسفہ شہادت اور روزے کی معمولی سی مشقت نہ سہہ سکنے والا نظریہ عشق و سخت کوشی کیونکہ پیش کرتا۔

شبنم شکیل نے بھی 'اضطراب' میں اپنی ذات کی تکمیل کے ساتھ اس کی کوتاہیوں کی تلافی بھی کی ہے اس نے عورت کو ایک پورے منظر نامے میں دیکھا ہے۔

اس کے ہاں رومان' محبت' ہجر و وصال اور ماورائے ہجر و وصال سبھی کچھ موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان تمام تجربوں سے اس نے اک دانش بھی کشید کی ہے ہمارے ہاں بہت کم لوگ اس حقیقت کا احساس رکھتے ہیں کہ جس تجربے کو محبت کا نام دیا جاتا ہے اس میں ایک دوسرے کی نشو و نما بنیادی جز و ہے۔ شبنم نے عورت کے اس احساس کو بڑی باریک بینی سے پکڑا ہے عظیم پیڑ وہ نہیں جو اپنے سائے میں کسی اور کو پنپنے نہ دے۔ عظیم پیڑ وہ ہے جو دوسرے کے لیے اور روشنی کا راستہ چھوڑ کر بڑے تحمل سے کھڑا رہتا ہے۔

کچھ گھنے پیڑوں کے سائے میں اُگے پودے ہیں ہم
اپنے بڑھنے کی تمنا ایک دھوکا اک سراب

اس کی نظم ''موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانے والی'' ایک عورت کی ناقابل تسخیر روح کی داستان ہے اور نظم ''ورثہ'' ایک مصنوعی معاشرہ کی ہجو ہے جس میں اس

نے ایک بیٹی کے حوالے سے پورے معاشرتی ڈھانچے پر وار کیا ہے وہ کسی نظریئے کی علم بردار نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ نظریہ تخلیق کار کو بڑی آسانیاں فراہم کرتا ہے اسے دربدری خاک بسری سے نجات دلاتا ہے اور پھر آدمی ناک کی سیدھ میں لکھتا چلا جاتا ہے شبنم کے پاس ایسا کوئی ازم نہیں وہ صرف محبت' احترامِ آدمیت اور وقارِ انسانی کی پیامبر ہے اس لیے وہ صرف عورتوں کی شاعرہ نہیں اس نے عورت کے حوالے سے زندگی کو دیکھا ضرور ہے (کہ ہر شخص اپنے حوالے سے ہی عمر بسر کرتا ہے) مگر اس کا فن جنس بندی سے ماورا ہے۔ وہ دنیا کے ہر مظلوم انسان کی ہمدم مگر نعرہ بازی سے کام لینا اس کے مزاج کے خلاف ہے۔

شبنم کے ہاں زندگی کی شدید محبت نظر آتی ہے وہ اس کے ایک ایک لمحے کو قیمتی سمجھتی ہے اس کے تحت الشعور میں کہیں یہ احساس موجود ہے کہ زندگی ایک امانت ہے جس کے ایک ایک لمحے کا حساب ہم پر واجب ہے۔

جدا ہوں زندگی کی لہر سے میں
بندھی ہے ناؤ بہتے پانیوں میں

کنارے پر پہنچ کر خوف آیا
کہ اب تک ہم تھے کن طغیانیوں میں

شبنم کے اسلوب میں روایت کے ساتھ ساتھ انفرادی رنگ بھی رچے بسے نظر آتے ہیں اس کے ہاں روایتی امیج بہت کم ہیں۔ اپنے تخلیقی تجربے کے لیے اس نے عورت کی روزمرہ زندگی سے لفظی تصویروں اور سمبلز کا انتخاب کیا ہے موت کے کنوئیں والی نظم اس کی مثال ہے غزل میں اس نے گھریلو زندگی اور قریب ترین اشیاءٔ کو استعارے کی صورت دی ہے مگر ان میں کھردرے پن کا احساس نہیں ہوتا خاص طور پر اس کے ہاں الفاظ کے تضاد یا صنعتِ تضاد کہہ لیجئے بڑے بے ساختہ انداز میں استعمال ہوئی ہے۔

ایک بھی گہنا پاس نہیں تھا جب وہ چہرہ کندن تھا
سونا تن پہ تب پہنا جب چاندی اتری بالوں میں

غزل سے نظم کی طرف سفر' اس کے فنی ارتقاء کا ایک اور پڑاؤ ہے آنکھ منتظر ہے کہ

اب شبنم اس حیرت کدے کے کون سے گوشے بے نقاب کرتی ہے کہ دریافت اور بازیافت ہی تخلیقِ فن کا منصب ہے۔

اپنی مقبول نظم ورثہ میں شبنم گھریلو راحت وسکون اور عائلی زندگی کی کامیابی کے لیے اپنی بیٹی کو اپنی شخصیت کی نشو ونما اور اپنی صلاحیتوں کی تکمیل کے تمام خوابوں سے دست بردار ہونے کی نصیحت کرتی ہے اور ایک عملی زمانہ ساز عورت بننے کا راستہ دکھاتی ہے کیونکہ روحانی آرائش عورت کو صرف لہو رلواتے ہیں اور کچھ نہیں۔

ورثہ

بہت آسان سی راتیں بہت آسان سے دن ہیں
نہ بے کل دن میں رہتی ہوں نہ شب کی نیند اُڑتی ہے
نہایت چین سے آرام سے اپنی گزرتی ہے
کہ اب دامن میں گنجائش نہیں انگار جذبوں کی
مقرر راستے پر کاروانِ زیست چلتا ہے
مخالف یا موافق ہو ہوا راحت نہیں دیتی
برس کر ابر کھل جائے پر اب روزن نہیں کھلتا
شگفتِ گل پہ بھی زنجیرِ پا حرکت نہیں کرتی
گلوں کو توڑ کر گلدان میں ایسے سجاتی ہوں
کہ جیسے فرض ہو کوئی جسے انجام دینا ہے
نہیں ہے کوئی بھی مطلب مجھے مہتاب راتوں سے
ستارے جو سخن کرتے ہیں ان باتوں سے کیا لینا
بھرا ہو یا کہ خالی آسماں معنی نہیں رکھتا
مجھے بے سُود باتوں سے نہیں اب کوئی دلچسپی
کتابیں پاس ہیں لیکن انہیں میں پڑھ نہیں سکتی
وہ اک ترتیب سے رکھی بھلی معلوم ہوتی ہیں

کہاں ہیں وہ جو میرے پاس تصویریں پرانی تھیں
تھے کچھ خط بھی جنہیں میں نے بہت پہلے جلا ڈالا

۲

نئے اب قاعدے قانون دنیا نے سکھائے ہیں
''ثبوتِ طبع ناقص ہے بلند آواز میں ہنسنا''
''پرندے چہچہاتے ہیں تو کتنا شور اُٹھتا ہے''
''گزرنا حد سے اُلفت میں کبھی اچھا نہیں ہوتا''
''اصولوں پر بھی سمجھوتا روا ہوتا ہے دنیا میں''
ہو کوئی فیصلہ جذبات میں آ کر نہیں کرتی
اسی میں خیر ہے شاید اسی میں بہتری میری
مٹا ڈالا ہے اب دل سے وہاں جو نام کندہ تھا
جسے سُن کر کبھی یہ دل دھڑکنا بھول جاتا تھا
نہیں اب میری دنیا میں کچھ ان چیزوں کی جا باقی

۳

یہ سب اچھا سہی لیکن نہ جانے کس لیے پھر بھی
میں اکثر دل ہی دل میں سوچ کر کچھ کانپ اُٹھتی ہوں
کہ اب میری شباہت کی مری نازوں پلی بیٹی
مری سب ترک کردہ سوچ کے بے کار ورثے کو
اکٹھا کر رہی ہے اور جھولی بھرتی جاتی ہے

اسی طرح من کی اصغری خانم میں ماں اپنی بیٹی کو ایک محفوظ کامیاب اور بے خوف زندگی گزارنے کا مشورہ دیتی ہے مگر بیٹی یہ کہہ کر اس کی نصیحت قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے وہ اس کی طرح شکست قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ سو معلوم ہوا کہ شبنم روایتی اور جدید عورت کی درمیانی کڑی کی بات کرتی ہے۔ اگر یہ عورت نہ ہوتی تو آج کی جدید عورت کا وجود ممکن نہ تھا۔ عورت جو ہمیں اپنی نئی نسل کی صورت نظر آ رہی ہے، جو خود

اعتماد ہے۔ ہر معاملے میں اپنے واضح تصورات رکھتی ہے۔ زندگی کو مرد کے ساتھ برابر کی سطح پر گزارنے کی متمنی ہے۔ سب سے بڑھ کے اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔

دیکھو بیٹی!

ایک سیدھی اور سادہ زندگی کرنا بسر
جس میں کوئی خوف ہو ہر گز نہ ہو کوئی خطر

جس میں کوئی کشمکش اور کوئی دوراہا نہ ہو
تم نے شاید اس طرح سوچا نہ ہو' چاہا نہ ہو

میں مگر موجود ہوں سب کچھ بتانے کے لیے
ایک سیدھا راستہ تم کو دکھانے کے لیے
چاہتی ہو کاٹنا گر خیر سے اپنا سفر
آج سے میری نصیحت کو رکھو پیشِ نظر

جس نے رستہ اک الگ اپنے لیے چاہا یہاں
اس کے حصے میں یہاں آئیں فقط رسوائیاں

کوئی سودا سر میں رکھنے میں ہے عافیت کہاں
اس جگہ خوابوں کی اُڑ جاتی ہیں اکثر دھجیاں

دیکھو خوابوں کے نگر میں تم نہیں رہنا کبھی
میں نے سمجھایا نہیں تھا' یہ نہیں کہنا کبھی

مصلحت کا راستہ آسان ہے مشکل نہیں
ایسے جینا جیسے سینے میں تمہارے دل نہیں

دل کی مانو گی اگر، پچھتاؤ گی تم ایک دن
اپنی حالت پر بہت شرماؤ گی تم ایک دن

دل کے ہاتھوں ٹھوکریں کھاتی پھریں دل والیاں
چوڑیاں ہاتھوں میں ہیں، نے کان میں ہیں بالیاں

مجھ کو دیکھو، آج تک دل کی کبھی مانی نہیں
کچھ بھی ہوں پر یہ تو مانو گی کہ دیوانی نہیں

مصلحت کی بات لیکن کوئی بھی ٹالی نہیں
میرے ضبطِ دل کی قائل کون گھر والی نہیں

میری ماں کا تجربہ سب کام میرے آ گیا
دنیوی آسائشوں کا راز میں نے پا لیا

کس قدر سکھ اب مجھے گھر اور گھر داری میں ہے
اور تحفظ بھی بہت اس چار دیواری میں ہے

آج دنیا کی نظر میں قابلِ عزت ہوں میں
کیا کہا تم نے کہ "اک ہاری ہوئی عورت ہوں میں؟"

مبادا یہ سمجھ لیا جائے کہ شبنم کی نگاہ صرف عورت اور اس کے مسائل ہی کی جانب ہے۔ اس کے ہاں نہ تو آفاقی جذبات واحساسات کا فقدان ہے نہ ہی اپنے عہد کے مسائل سے چشم پوشی۔ وہ خود بیں اور جہاں بین بھی ہے۔ ماحول کے جبر واستبداد اور خلقِ خدا کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی مفسر ہے۔

جس سے مل سکتا ہے مظلوم کو انصاف یہاں
اس گواہی میں بھی تاخیر کیے جاتے ہیں

کسی سے کس طرح انصاف مانگنے جاؤں
عدالتیں تو بہت ہیں عدیل کوئی نہیں

رزقِ زمیں بنا تو عزیزِ جہاں ہوا
فن کار جس کو روئے زمیں پر اماں نہ تھی
سچا تھا تو لہجے پہ رہا اپنے وہ قائم
رُخ بدلا ہوا کا تو سخنور نہیں بدلا

بدلتی دیکھیں وفاداریاں بھی وقت کے ساتھ
وفا جہاں کے لیے ایک کاروبار رہی

اب یہ دیکھیں کہ مجموعی طور پر شبنم نے اردو شاعری میں عورت کی نفسیات کے حوالے سے کیا اختراعات اور اضافے کیے۔ گو اس کے سامنے ادا جعفری اور زہرا نگاہ کی مثالیں موجود تھیں جن میں صیغہ تانیث بھی استعمال ہوا اور عورت کے منفرد تجربات بھی، جن میں محبت، عائلی زندگی کے نشیب وفراز، مامتا سبھی شامل ہیں۔ شبنم کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے ایک مخصوص رکھ رکھاؤ والی گھریلو مگر پختہ شعور وآگہی اور عصری مسائل پر گہری نظر رکھنے

والی عورت کے حوالے سے اپنی روزمرہ زندگی کے تجربات وواقعات کو شاعری کا موضوع بنا دیا۔ اس کی انفرادیت جہاں موضوعات میں نمایاں ہے وہیں طرزِ ادا میں بھی متوجہ کرتی ہے۔ عورت کی زبان میں شاعری کی کوئی اچھی روایت کلاسیکی شاعری میں نظر نہیں آتی۔ کیسے نظر آتی کہ تب عورت بھی صیغہ مذکر میں بات کرتی تھی۔ شبنم نے تانیثیت کو فن کارانہ اعتبار بخشا۔ اس کے لہجے میں نسوانیت کی کھنک بھی ہے اور دردمندی بھی۔ کہیں کہیں قوسِ قزح کے رنگ بھی کھلتے ہیں اور موسیقی کے سُر بھی اپنا جادو جگاتے ہیں۔

غزل (۱)	آج سہاگن روپ سجا کر
غزل (۲)	چھم چھم کرتی سیج پہ آئی آج سہاگن شام
غزل (۳)	وہ ساجن ہو کے بھی ساجن نہیں ہے

ڈنڈیاں بھی نئی پہنیں چوڑا بھی چڑھایا تھا
وہ گھر ہی نہیں آیا تقدیر کا کرنا ہے

اس نے گھریلو زندگی میں عورت اور مرد کے باہمی عدم اعتماد۔ عورت کی محکومیت۔ بے اختیاری۔ آزادیٔ فکر کی موت اور مصلحت پسندی اور جھوٹ پر مبنی شب و روز۔ ماضی سے دستبرداری اور مستقبل کے خوابوں پر پابندی۔ گھر کی کمزور بنیادوں اور مسلسل خدشات میں زندگی گزارنے کے تجربے کو شعری زبان عطا کی۔ ان موضوعات کو ادبی اعتبار عطا کر کے کبھی کبھی اس کے ہاں خودرحمی کے رجحانات ضرور نظر آتے ہیں۔ جس سے اس فنی ضبط پر چوٹ پڑتی ہے جو عظیم فن کا جزوِ اول ہے۔

عصری حسیّت بھی شبنم کے کلام کا اہم جزو ہے۔ اس کے اشعار انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں کی خبر دیتے ہیں۔ ماحول کی گھٹن۔ حالات کی تلخی۔ اور جبر واستبداد کا چلن۔ عام انسان کی بے قدری اور تحقیر۔ زر پرستی۔ مطلب پرستی اور طالع آزمائی کے رجحانات۔ اظہار پر کڑی پابندیاں۔ یہ سب تجربات ایک تلخ معاشرے اور سیاسی چیرہ دستی

کی خبر دیتے ہیں۔

زمیں کی دھول سے ان کو اٹھانا لازم ہے
سفید پوش ہیں گو خوں میں ہیں نہائے ہوئے

یہاں ان کی ایک غزل کے کچھ شعر دیکھیے

سب وا ہیں دریچے تو ہوا کیوں نہیں آتی
چپ کیوں ہیں پرندوں کی صدا کیوں نہیں آتی

گل کھلنے کا موسم ہے تو پھر کیوں نہیں کھلتے
خاموش ہیں کیوں پیڑ صبا کیوں نہیں آتی
سنتے ہیں کہ منظر ہے بدلنے کو چمن کا
پھر اس کی گواہی کی ندا کیوں نہیں آتی

کیوں ایک سے لگتے ہیں یہاں اب سبھی موسم
خوشبو کسی موسم سے جدا کیوں نہیں آتی

شبنم نے اظہار کے لیے سادہ زبان اور اپنے آس پاس کی زندگی سے امیجری کا انتخاب کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار بہت جلد ذہن میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس کی امیجری میں ایک خاص نسوانی حسیّت ہے جو اردو شاعری کو نہ صرف شبنم بلکہ تمام شاعرات کا بہت بڑا عطیہ ہے۔

ادھورا ہے ہر اک سپنا ہمارا
کبھی جھولے کبھی ساون نہیں ہے

ان دو مصرعوں میں صدیوں کی تہذیب اور عورت کی روح بسی ہے۔

جُدا ہوں زندگی کی لہر سے میں
بندھی ہے ناؤ بہتے پانیوں میں

آزاد قیدی کی داستان اس سے بہتر کیا بیان ہوگی۔

شاہدہ حسن

سن ستر کی دہائی کے بعد ابھرنے والی شاعرات میں ایک منفرد آواز شاہدہ حسن کی ہے۔اب تک شاعری کے دو مجموعے آ چکے ہیں۔"ایک تارا ہے سرہانے میرے" اور "یہاں کچھ پھول رکھے تھے" غزل، نظم، نثری نظم سب میں اظہار کیا ہے۔شاہدہ کا نمایاں ترین وصف اس کا ایک خود آ گاہ اور عصری حسیت سے مالا مال نسائی شخصیت پن ہے۔وسیع ذہن اور آفاقی شعور اسے ایک اہم شاعرہ بناتے ہیں۔ پہلا مجموعہ ایک تارا ہے سرہانے میرے 1995 اور دوسرا یہاں کچھ پھول رکھے تھے۔2002ء میں منظر عام پر آیا۔شاہدہ نے کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا اور درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہیں۔کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

مغربی شعر و ادب کے وسیع و عمیق مطالعے کے ساتھ ساتھ اردو کی شعری روایت کے انجذاب نے شاہدہ کی شعری دنیا کو ایک مخصوص رنگ سے آراستہ کیا ہے جس کی نمایاں خصوصیت تخلیقی مسرت کائنات اور انسان کے باہمی رشتے کی سرشاری اور انسانی برادری کے نا قابل شکست رابطے ہیں۔اس دور میں جبکہ عام طور پر نسائی شعری لہجے میں کچھ ایک برہمی اور تھوڑی سی تلخی اور بغاوت کے آثار نمایاں ہیں۔شاہدہ نے زندگی میں محبت، حسن اور حسن کی جلوہ گری کو موضوع بنایا ہے۔شاید اس کا سرچشمہ اس کا بھرپور، پرمسرت بچپن ہے۔جو محبت اور مشفق ہستیوں کے فیوض و برکات سے لبالب بھرا ہے۔یہ ایک بہت بڑی نفسیاتی حقیقت ہے کہ تخلیقی فن کار کی شخصیت زیادہ تر اس کے بچپن اور ابتدائی عمر کے تجربات سے نمو پاتی ہے۔بچپن میں محبت کی فراوانی یا فقدان دونوں ہی اس پر ان مٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔اس کے باطن پر جو ایک بے نام افسردگی اور ہر دم مضطرب رکھنے

والا ذوقِ جستجو، دردمندی کا مسلسل جھٹپٹا محیط ہو جاتا ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی تخلیقی تحریک ہے۔ بہت زیادہ شفیق اور محبت کرنے والے زندگی میں آ کر چلے جائیں تو وہ بھی ایک مستقل موسمِ ہجر کو ہمارے لیے لازم کر جاتے ہیں۔ شاہدہ نے اپنے پہلے مجموعے میں بچپن کے حالات اور دنیائے شعر سے اپنا تعلق استوار ہونے کی جو روداد لکھی ہے اس سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ بے حد محبت کرنے والے، انتہائی سچے اور صاحبِ ذوق لوگوں کے درمیان رہی جنہوں نے غیر شعوری طور پر اس میں لفظ کے حسن اور قدر و قیمت کا احساس جگا دیا۔ پھر اس کی تعلیم و تربیت اور ذہنی پختگی نے باطنی اور خارجی دنیا کے تضادات اس پر وا کر دیئے۔ یہیں سے ایک تخلیق کار کا کرب شروع ہوتا ہے۔ جب وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ ان دو دنیاؤں میں سے کسی ایک سے بھی دست کش نہیں ہو سکتا، انسان دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتا ہے اور شاید ان میں مفاہمت اور یگانگت کا رستہ بھی تلاش کرتا ہے۔

شاہدہ کا تمام فنی سفر خواب اور حقیقت کو قریب تر لانے کا سفر ہے۔ وہ خواب کو انسانیت کا سب سے بڑا اشرف سمجھتی ہے۔ خواب جس کی تعبیر محبت کے سوا کچھ اور نہیں۔ وہ محبت حاصل کرنا ہی نہیں بلکہ دوسروں میں بانٹنا بھی چاہتی ہے۔ تاکہ دنیا انسان کے لیے ایک بہتر مسکن بن سکے۔

اس نے زندگی کے روزمرہ اور عام مناظر میں حسن و خیر کی جلوہ گری دیکھی ہے۔ اسی لیے اس کی شاعری کبھی تو معصوم اور خوبصورت رنگوں، روشنیوں کا مونتاژ نظر آتی ہے اور کبھی ایسی گہری دردمندی کی زیریں لہر جو تمام انسانوں کو بلاتفریق مذہب و ملت ایک ہی لڑی میں پرو دیتی ہے۔ یہ تجربہ خواب نما ہی سہی۔ انسانی روح کی معراج ہے۔ ایک تارا ہے سرہانے میرے کے پیش لفظ میں شاہدہ لکھتی ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ میں جس عہد میں پیدا ہوئی وہ عجب تضادات کا عہد ہے۔ بیک وقت خواب دیکھنے کا عہد بھی اور خواب کی سائنسی اور نفسیاتی توجیہات کو سمجھنے کا عہد بھی۔ ذات کی تنہائیوں میں اتر کر اپنے احساسات کی رنگا رنگی کو منکشف کرنے کا عہد بھی ان پھیلے اور ہر طور وسیع ہوتے انسانی تعلقات اور ان کے بے شمار دائروں میں مسلسل ناچنے کا عہد بھی۔ رشتوں ناتوں سے گندھی زندگی کی دلداریاں کرنے کا عہد بھی اور پھر انہی

رشتوں اور ناتوں کو بے معنویت کی سرحد پر پہنچ کر دم توڑتا دیکھنے کا عہد بھی ۔۔۔۔ میں نے اپنی عصا کے طور پر جس جذبے کو بطورِ خاص چن لیا تھا اسے عرفِ عام میں ''محبت'' کہتے ہیں۔ اس جذبے کو اس کی تمام تر تہہ داریوں کے ساتھ ایک تلوار کی مانند اپنے ہاتھوں میں تھامے رہتی ہوں اسی تلوار سے مجھے اپنی ہر جنگ لڑنی ہے''

اسی لئے شاہدہ کے ہاں بغاوت کی تلخی' تخریبی بلند آہنگی اور نوکیلی شہرتوں کی بجائے نرم احتجاج' تنقید و تبصرے ثابت قدمی اور اعتماد جو اسے دیگر شاعرات سے ممتاز کرتا ہے۔

پہلا مجموعہ ''ایک تارا ہے سرہانے میرے'' دراصل شاہدہ حسن کے تلاش ذات کا مرحلہ ہے۔ اس میں ایک نوعمر لڑکی کے نازک احساسات اور رومانی کرب اور دنیا اور لوگوں کے ساتھ بیکراں محبت اور ہر ساعت کے گزراں ہونے کی سلگتی دل گرفتگی ہے۔ وہ ابھی تک زندگی اور اپنے عہد کے بارے میں کوئی واضح وژن تلاش نہیں کرسکی۔ اس دور میں اس کی اہم ترین صفت الفاظ کا نہایت فن کارانہ استعمال اور منفرد امیجری ہے جس میں روایت سے زیادہ مغربی اسلوب شعری کے اثرات نظر آتے ہیں۔ محسوس تجریدیت پر مبنی استعارے اس کے اشعار کو تازہ جہت عطا کرتے ہیں۔

میں بھی رُت کی جھولی سے	خواب اٹھاؤں جھولی بھر
بند کواڑ میں جا سوئی	خوشبو باندھ کے اپنے پر
دکھ کی تتلی بیٹھی ہے	راتوں کو پھلواری پر
کتنے اچھے لگتے ہیں	دل کو میٹھے میٹھے ڈر

ان اشعار میں تخلیق کی نسائی جہت خود بول رہی ہے۔ ہم نہ بھی مانتے ہوں تو یہ اشعار دُور سے پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک عورت کا وژن ہے۔ ہستی کی روحانی اور مابعد الطبیعاتی جہت کو روشن اور زندہ رکھنا تخلیق فن کا ایک ثمر ہے۔ اس کے لیے شاخ نہالِ غم کا ہرا رکھنا بہت ضروری ہے۔

مشورہ

خواب میں مت کھو دینا
جتنے بھی دکھ تم کو اپنے
اچھے لگتے ہوں
مٹی میں بو دینا!

نوعمر لڑکی کے خواب اور مستقبل کے حسین تصورات ہماری شاعرات کا موضوع رہے ہیں۔ شاہدہ نے کس منفرد انداز میں ایک لڑکی کے معصوم جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

اداسی اور سرخوشی کا امتزاج

ان سبز گھنے اشجار تلے
سناٹوں کے انبار تلے
یہ پھول کسے مہکائیں گے
کس سمت یہ رستے جائیں گے
کس شاخ کی شیتل باہوں
لچکے گا یہ تارہ سا تن
اس خواب کی پیاسی مٹی پر
آباد رکھوں گی کس کا گھر
کس صبح شگوفہ وا ہوگا
کب؟ کون دن اپنا ہوگا

اور پھر ایک پختہ خود آگاہ عورت کی محبت کو یہ اعتماد ملتا ہے۔

میں نے جب بھی کبھی جانے کی اجازت چاہی
اس نے بڑھ کے مرا اسبابِ سفر کھول دیا

وقت کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کی ایک ایسی عورت کی تصویر ابھرتی ہے جو گھر کے ادارے کی امین ہے۔ اور یہ ادارہ مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے۔ اس کے افراد کے درمیان اعتماد اور محبت کا رشتہ ہے۔ شاہدہ کی شاعری میں ایک محبت کرنے والے دل و جان

کے رفیق، شوہر کا خاکہ نظر آتا ہے۔ جس کی محبت اور وفا پر پورا پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسے گھر کا نقشہ ہے جس میں عورت اور مرد کے مابین انا کی کوئی جنگ جاری نہیں جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے نہیں بلکہ باہمی یگانگت سے زندگی کی گاڑی کو کھینچنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کے بچے بہتر انسان بن سکیں۔ یہ جوڑا دنیا کو ایک ایسی جدید بنانا چاہتا ہے جہاں آئندہ نسل امن و عافیت اور عزت و توقیر کی زندگی بسر کر سکے۔ اس راستے میں بہت سی دشواریاں بھی آتی ہیں مگر وہ بھی باہمی اعتماد کے طفیل کٹ جاتی ہیں۔

در و دیوار پہ سبزہ
اک اک کر کے
میلے کپڑوں جیسے دن
دُھلتے جاتے ہیں یادوں کے پانی سے
بارش ہوتی رہتی ہے
گھر کی دیواروں کے بیچ
اک بے نام محبت
اُگتی رہتی ہے

اس طرح شاہدہ کی شاعری میں ''گھر'' ایک کنج عافیت ہے رزم گاہ نہیں۔ نہ ہی کوئی آمرانہ سلطنت کہ جہاں لوگ حاکم محکوم کے رشتے میں سانس لیتے ہیں۔ اس طرح اپنی ہستی کی بنیاد مستحکم کرنے کے بعد شاہدہ کی نظر اس آنگن سے باہر چاروں اطراف دور دور تک اٹھتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ اس کا اپنا سائبان بھی اس وقت تک آندھیوں کی زد میں ہے جب تک کہ اس کی پوری بستی بدامنی، خود غرضی، لالچ، نفرت اور جبر تشدد کے طوفانوں میں گھری ہے۔ اس بستی کے ہر بچے میں اسے اپنے بچے اور ہر عورت میں اسے اپنا وجود بکھرا نظر آتا ہے۔ اور شہر آشوب اس کی شاعری کا مستقل جزو بن جاتا ہے۔

لہو کی شب بھی مری تھی یہ صبحِ خوں بھی مری
میں اپنے شہر کے سب منظروں میں شامل ہوں

عروس البلاد کراچی کی رونقیں لٹنے کا غم انسانی اقدار کی پامالی کشت و خون کی

عملداری، ذاتی حوالوں سے اٹھ کر پوری دنیا کے مناظر تک محیط ہو جاتے ہیں۔

بستیوں میں شام پہنچی دیر سے
دھوپ میں سارے مکاں مرجھا گئے

شاہدہ گھر کے بعد بستی کے استعارے تک سفر کرتی ہے۔ اس کے ہاں بارش کے انتظار میں، دھوپ میں جھلستی ویران بستیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہ بستیاں جنھیں سرسبز و شاداب، مسرتوں سے لبریز، شگفتہ بختیوں سے مہکتے ہونا چاہیے۔ خود اپنے ہی خون سے رنگی نفرتوں کی آگ میں سلگتی نظر آتی ہیں۔ شاہدہ ہر دکھتے دل پر محبت کا مرہم رکھنا چاہتی ہے۔

فاصلوں کا سمٹنا اور دنیا کا ایک عالمی بستی میں ڈھل جانا، عصرِ حاضر کا مخصوص سناریو ہے۔ یہ عجب ہجرتوں کا عہد ہے کہ جس میں ہجرتیں بھی دراصل اپنا مفہوم و مقصود کھو کر بے توقیر ہو چکی ہیں۔ اس لیے کہ یہ کسی اعلیٰ و ارفع مقصد اور روحانی و اخلاقی نصب العین کی خاطر عمل میں نہیں آتیں۔ یہ تو ایک ایسا ''رول'' ہے جو کسی خوں آشام درندے کے قدموں کی دھمک جنگلوں میں ڈال دیتی ہے اور وہاں کے تمام جاندار اس کے خوف سے بھاگنے لگتے ہیں۔ چاروں طرف ایک stampede کا عمل دخل جاری ہو جاتا ہے۔ سو جنگل کے باسی جان بچاتے منہ اٹھائے بھاگ نکلتے ہیں۔

ہمارے عہد میں جس کثرت اور تواتر کے ساتھ نقل مکانی اور ترکِ وطن کا عمل جاری ہے اس سے پہلے کہاں تھا۔ اپنی زمین کے ساتھ محبت اور وابستگی بھی ایک جبلی جذبہ ہے۔ ضرورت اور مصلحت کے تحت اپنی جنم بھومی چھوڑنے والے ایک مستقل احساس غریب الوطنی کا شکار رہتے ہیں۔ وطن اور اپنی تہذیب سے دوری، کسی بھی طرح کی خوشحالی اور ترقی کے لیے بہت بڑی قیمت ہے۔ مسافرت کا یہ احساس آدمی کو کہیں بھی قدم جمانے نہیں دیتا۔ شاہدہ حسن کے یہاں مسافرت کا یہ تجربہ ایک مستقل موضوع کی صورت اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حالات کے تحت وہ نقل مکانی کے اس دیگر تجربے سے گزری ہے۔

سفر، راستوں کی تختی دھول۔ جنگل شجر، ستارے۔ رات علامات کا ایک پورا نظام شاہدہ کی سائیکی میں مسافرت اور غریب الوطنی کے تجربے کو ایک مستقل جہت عطا کرتا

ہے۔اسی سلسلے میں ایک مکمل طور پر ہم آہنگ گھرانے اوراس کے افراد کے درمیان وقتی دوری اور فاصلے بھی در آتے ہیں۔

ایسی بھی کیا مسافرت، ایسی بھی کیا تھکن کہ میں
خاک میں سر سے پاؤں تک روز یونہی اٹی ملی

ساتھ ترے نڈھال ہوں دھوپ کی رہ گزار پر
سیج پہ کب بجی رہی، عطر میں کب بسی رہی
راستوں کی اک تھکن اوڑھے ہوئے
ساتھ میرے لوٹ کر گھر آئی شام

منظر کی طرح رنگ بدلتی ہوئی شامیں
یہ پیڑ کے سائے ہیں کہ ڈھلتی ہوئیں شامیں

یخ بستہ کواڑوں میں کہیں جم سی گئی ہیں
اک دکھ کی کسی لو سے پگھلتی ہوئی شامیں

سات سمندر کی دوری سے ایک نظم:

اپنے فرائض کی سولی پر
تم لٹکے ہو
اپنے خوف کے رستے پر
میں بھاگ رہی ہوں
جدا جدا کچھ کام ملے ہیں دونوں کو
جو کرنے ہیں
مجھ کو تیز ہوا کی زد پر
اندیشوں کی چادر اوڑھ کے چلنا ہے

چُلّو بھر خوشبو سے گھر کے

سب رستے مہکانے ہیں

آئندہ ہم جس میں

خوش خوش اپنی صورت دیکھیں گے

وہ شیشے چمکانے ہیں

تم کو

گھر کے پھیلے ہوئے سناٹے سے

اپنی بھوک مٹانی ہے

اپنی پیاس بجھانی ہے

اپنی ہی دستک پر اٹھ کر

اپنے لیے دروازہ خود ہی کھولنا ہے

سارے بدن کی کڑواہٹ اور بیزاری کو

چائے کی پیالی میں خود ہی گھولنا ہے

سات سمندر کی دوری پر

اپنی اپنی مجبوری پر

جدا جدا کچھ کام ملے ہیں

دونوں کو

جو کرنے ہیں

بدحالی۔ حالات کی بے اعتباری' غیر محفوظ ہونے کا احساس۔ آنے والے حادثوں کا خدشہ۔ جہد للبقاء عصر حاضر کی عورت مرد کے ساتھ ساتھ ان تمام ذائقوں سے آشنا ہے۔ وہ ہر ممکن طریقے پر اپنے رفیقِ سفر کا ساتھ دیتی ہے۔ کہ دونوں کا وجود صرف ایک دوسرے سے بامعنی بنتا ہے۔

نئی زمینوں کا خوف

زندگی کا سفر

اک نئے خوف کے
دھند رستوں میں گم
سہمی سہمی سی
اک ان کہی آرزو
ناتمامی کی دہلیز پر
خوف سے خوف تک اک سفر
میں کہاں آ گئی
دائرے میں کہیں
مثلِ پرکار۔۔۔میں
اور نقطے پہ رکھی ہوئی
سرد میری زباں
خوف کا ذائقہ
روز چکھتی ہوئی زندگی
قوس در قوس
کٹتی ہوئی زندگی

اک سفر سے لوٹ کر آئی تو بے مہلت مجھے
زندگی نے اک سفر پر پھر روانہ کر دیا

جاتے جاتے میں نے تجھ تک کاٹ دی اک زندگی
آتے آتے تو نے مجھ تک اک زمانہ کر دیا

اصل چہرہ میں نے اپنا رکھ لیا تیرے لیے
دوسروں کے سامنے اک اور چہرہ کر دیا

ایک مکاں زمیں بغیر' ایک زمیں مکاں بغیر
بس کوئی بے گھری سی ہے جیسے کہ گھر کے ساتھ ساتھ

عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات' حادثات جس طرح ہرانسان کی زندگی کو متاثر کر رہے ہیں اس کا بڑا واضح تصور شاہدہ حسن کے ہاں موجود ہے۔ وہ مواصلاتی ٹیکنالوجی کے دور کی نمائندہ عورت ہے جو ذہنی طور پر نہایت حساس ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دردمند دل بھی رکھتی ہے اور بڑے سے بڑے حالات میں بھی اعلیٰ انسانی اقدار پر اپنا ایمان زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ کراچی، عراق' امریکہ' افغانستان حادثات و واقعات سبھی کے سائے اس کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اور اس سیاسی انتشار اور خوں آشامی کے زیرِ سایہ وہ دنیا کے ہر معاشرے میں عورت کے مقام پر بھی گہری نظر رکھتی ہے۔

اپنی نظم خواتین کے عالمی دن پر وہ خود کو دورِ حاضر کی خود اعتماد روشن خیال عورت کے روپ میں دیکھتی ہے۔ جو زندگی کے کسی بھی محاذ پر مرد سے پیچھے نہیں ہے۔ مگر اپنی کامیابی اس کے دل سے ماضی کی عورت کی اس افسردہ اور مجبور زندگی کا غم کم نہیں کر سکتی جو اس کی ماں نے بسر کی۔ وہ ترقی خوشحالی کی مثالی سرزمین' دنیائے اول میں بھی عورت کا مقدر اس توقیر اور محبت سے خالی پاتی ہے۔ جس کی وہ مستحق ہے۔ وہاں بھی وہ ہزار آزادی پر بھی ان دیکھی زنجیروں میں اسیر ہے۔

یہ بنی نوع انسان پر اترنے والی اداسی اور تنہائی کے کرب کا عہد ہے جو دین ہے اس مادہ پرستی کی جس نے انسان کو چیزوں سے محبت اور انسانوں سے دور ہونا سکھایا ہے چیزوں کی ہوس نے دنیا کی ہر خوبصورتی کو پامال کر کے رکھ دیا ہے کہ ان کے ملبے میں محبت نے دم توڑ دیا ہے۔

بہت بھیڑ ہے
بہت ہی بھیڑ ہے چاروں طرف

یوں لگ رہا ہے
جیسے سب ذی روح
گھر سے بھاگ نکلے ہوں
خریداروں کی آوازوں سے ہر بازار
جنگل بن گیا ہے
تھیٹروں کی سیڑھیوں پر
پہلے شو کے ختم ہوتے ہی اُمڈتے لوگ
اگلے شو کے شوقینوں کو
دھکے دے کے آگے بڑھ رہے ہیں
اسپتالوں اور شفا خانوں کی لمبی راہ داری میں
بچھی کرسیوں پر
سسکیاں بیٹھی ہوئی ہیں
ویگنوں کے اور بسوں کی کھڑکیوں سے
اک انبوہ اُمڈا آ رہا ہے
ریلوے اسٹیشنوں کی کھڑکیوں سے
سر ہی سر لپٹے ہوئے ہیں
جلسہ گاہوں اور جلوسوں کی طرف
خلقت رواں ہے
دفتروں میں
افسروں سے ملنے والوں کی قطاریں
گیٹ سے باہر
سڑک تک آ چکی ہیں
ساحلوں پر غوطہ خوروں کا بڑا
مجمع لگا ہے

اور اس انبوہ کے
قدموں تلے
ہر ہر جگہ
اک خوبصورت چیز
روندی
جا رہی
ہے!

اس طرح آج کے چمکتے دمکتے ہجوم میں ویران دلوں کے خالی پٹ اداسیوں کی آندھیوں میں بجتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انسان کا مقدر تاریکی اور تنہائی کے سوا کچھ نہیں اس لیے کہ اس نے محبت سے منہ موڑ لیا ہے۔ اور اسی حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ شاہدہ منفی رویوں کی اس جدید دنیا میں سانس لیتے ہوئے بھی مثبت تصورات اور عقائد کا علم تھامنے پر خفت محسوس نہیں کرتی۔ فی زمانہ حب الوطنی، دینی عقائد کی پاسداری بنیاد پرستی کا شاخسانہ گردانی جاتی ہے۔ ہم دوسروں کے عقائد و تصورات کو Romantiaze کرنے میں فخر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ شرمندہ ہونے کے عادی ہو چکے ہیں۔ شاہدہ کے ہاں ایسی نفسیاتی رکاوٹ نظر نہیں آتی۔

بحثیت مجموعی شاہدہ حسن دور حاضر کی وہ ذہین شاعرہ ہے جس نے مغربی شعری طرز احساس و فکر سے یوں کسب فیض کیا ہے کہ اس کے خیال اور اسلوب دونوں میں حیران کن شگفتگی اور معنی خیزی نظر آتی ہے۔ اس کی شاعری میں عہد جدید کی عورت کا وہ کردار ابھرتا ہے جس میں وہ عملی زندگی کے مسائل کا سامنا کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے لیے ایک بہتر مستقبل کا خواب دیکھ رہی ہے۔

تحریر و تحقیق۔ خالدہ حسین

فاطمہ حسن

کراچی ہی کی مردم خیز سرزمین نے دورِ حاضر کی ایک اور ہونہار شاعرہ کو جنم دیا۔ اسّی کی دہائی میں منظرِ عام پر آنے والی فاطمہ حسن اپنے لہجے کے بھولپن اور سیدھے سادے سبھاؤ کے باعث بہت جلد سب کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ بنگال اور کراچی کی گرم مرطوب آب و ہوا نے اس شاعرہ کی یوں آبیاری کی کہ اس کے لہو میں تپش، لہجہ میں دھیرج اور مزاج میں گداز پیدا کر دیا۔ شاعری کے دو مجموعے بہتے ہوئے پھول 1977 اور دوسرا دستک سے در کا فاصلہ 1993ء میں شائع ہوا۔ دونوں کے درمیان ارتقاء کا ایک نہایت واضح سفر ہے۔

فاطمہ حسن نے غزل۔ پابند و آزاد نظم۔ نثری نظم ہائیکو غرض ہر صنف شاعری میں اظہار کیا ہے۔ ایک نوخیز لڑکی کی رومانی محبت سے۔ لے کر سنجیدہ عورت کے احساس رفاقت تک، محبت کے تمام مرحلے اسکا موضوع رہے ہیں۔ اپنے پہلے مجموعہ بہتے ہوئے پھول کے مصداق اس کے شعر مدھم نغمگی اور ملائم جذبوں، دھیمی افسردگی کے مظہر ہیں۔ فاطمہ کا اصل جوہر نظم میں کھلتا ہے۔ بہت مختصر چھوٹے چھوٹے مصرعوں کی نظمیں، جن میں ایمائیت معنی کی اک دنیا سمو دیتی ہے۔ فاطمہ ایک ماہر مصور کی طرح چند واضح سٹروکس کے ساتھ ایسے خطوط بناتی ہے کہ ایک منفرد وژن ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اس کی نظمیں دیکھئے۔

روشنی

جانے کل کیا من میں آئی\
میں نے اس سے پوچھا\
بولو___ روشنی کیا ہے\
میری آنکھیں موند کے بولا\
اب تو سب کچھ سمجھ گئی ہو

چیزیں اپنے تضاد سے پہچانی جاتی ہیں۔اتنی پیچیدہ فکر کو چند سادہ الفاظ میں بیان کر دینا بہت بڑا فن ہے۔ روشنی کی اس سے بڑھ کر کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ کہ وہ اندھیرے کا متضاد ہے۔اور متضاد چیزیں بظاہر لا انتہا فاصلوں پر ہونے کے باوجود معنوی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں بلکہ ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہیں۔اسی طرح زندگی کے تضادات ہیں۔

ایک اور نظم

''دیئے''

وہ چراغ آج بھی

اس بالکونی پر جل رہے ہوں گے

یا بانس کے جنگلوں

پٹ سن کے پودوں

جھیل میں اتری ہوئی لڑکیوں میں

مجھے ڈھونڈنے کو نکل آئے ہیں

ماضی ایک نیم افسردہ خواب بن کر اس کی شاعری میں ابھرتا ہے مگر موجودہ اور آنے والے زمانوں کے ساتھ بھی گہرا رشتہ رکھتی ہے۔ سکھی سہیلیوں اور روحانی محبت کے دھنک رنگ جزیروں سے فاطمہ بہت جلد نکل آتی ہے۔اب اس کے سامنے سنگین حقائق ہیں اور وہ اپنے انداز میں ان کا سامنا کرتی ہے۔ زندگی اس کے نزدیک ایک مسلسل سفر ہے۔کبھی تنہا اور کبھی وقتی طور پر کسی ہم سفر کے ساتھ مگر مسلسل چلتے رہنا ہی ابدی حقیقت ہے۔عورت بھی اپنے مستقبل اور مضبوط گھر کی تلاش میں بڑے کٹھن سفر طے کرتی ہے۔

اور کیا شکل بے مکانی کی

جب سفر ہی میں زندگانی کی

سفر کا ساتھ ہے یہ منزلوں کا ساتھ نہیں

گزر ہی جائیں گے لمحے حساب رہنے دو

ہر چند اسے اطمینان ہے کہ اس نے اچھی زندگی کے حصول کے لیے اپنی سی

جدو جہد کر دیکھی ہے۔ پھر بھی دستک اور در کا فاصلہ اسے بڑا صبر آزما نظر آتا ہے۔

ہوا چلے گی تو خوشبو مری بھی پھیلے گی
میں چھوڑ آئی ہوں پیڑوں پہ اپنے ہات کے رنگ

دستک سے در کا فاصلہ ہے اعتماد کا
پر لوٹ جانے کو یہی تاخیر بہت ہے

ہر عورت کی طرح وہ بھی ایک مکان کی نہیں 'گھر' کی تمنائی ہے اور گھر

ایک مکان اور بستر سے
اور برتن سے
کیا گھر بنتا ہے
گھر بنتا ہے تم سے
تم جو ہنستے رہتے ہو
ہنستا ہے گھر بھی
روٹھو گے جو تم
تو روٹھے گی ہر چیز
چیزوں میں ہو جاؤں گی تبدیل
بستر اور برتن کی طرح
بستر یا برتن سے
کیا گھر بنتا ہے
گھر بنتا ہے تم سے

فاطمہ حسن کی دنیا محبت' خیر خواہی اور تعمیری جذبوں کی دنیا ہے۔ وہ صرف اپنا گھر ہی سلامت اور رستا بستا نہیں دیکھنا چاہتی بلکہ اس پورے شہر کو آباد دیکھنا چاہتی ہے جہاں یہ گھر ہے۔ اس پاس کے اداس گھر اسے سکھ کا سانس نہیں لینے دیتے۔

اُمڈ آیا ہے شور اوروں کے گھر سے
دریچے کھول کے پچھتا رہی ہوں

اجتماعی سطح پر زندگی کی پامالی سیاسی چیرہ دستی اور جبر وتشدد کا وہ شدید احساس رکھتی ہے۔

اسی کے حکم سے بستی لٹی ہے
اسی کے نام کا جھنڈا گڑا ہے
شاید ہو کچھ امید مسیحا کے نام سے
آئے کوئی کہ شہر میں پھیلا ہوا ہے درد

عہد حاضر، مسلسل سفر اور ہجرتوں اور نقل مکانی کا عہد ہے۔

سمجھ رہے تھے مسافر قیام کو منزل
خبر نہیں تھی کہ آگے بھی ایک ہجرت ہے

انسانی اقدار کی پامالی آدمی کے لہو کی ارزانی اور ظلم وستم کی عملداری اس کو مضطرب رکھتی ہے۔ اس کی نظم ''وہ جو سوتے ہیں'' اس کی بہترین مثال ہے۔

ہر طرف اندھیرا ہے
آگ یوں تو جلتی ہے
آسمان کے نیچے
آگ جو جلاتی ہے
خواب اور امیدوں کو
آگ جو مٹاتی ہے
سب نشاں محبت کے
پیڑ ہو کہ صحرا ہو
دشت ہو کہ دریا ہو
سب کو چاٹ جاتی ہے
ان کو بھی جلاتی ہے
آگ جو لگاتے ہیں!

ایک اور نظم

غلط ہے کتنا

غلط ہے کتنا جو ہو چکا ہے

غلط ہے کتنا جو ہو رہا ہے

مگر بتائے یہ کون مجھ کو

کہ گرد میرے ہیں جتنے چہرے

وہ جھوٹ کی گرد میں اٹے ہیں

یہ شعبدہ گر کہ جن کے قول و عمل میں پایا

تضاد اتنا کہ آنکھ ان کے وجود کو بھی

ایک شعبدہ ہی سمجھ رہی ہے

ناانصافی پر مبنی اس معاشرے میں عورت مرد کی تخصیص نہیں۔ سبھی اس کی بے رحمی کی زد پر ہیں۔ عورت تو دوہری مظلوم کہ آج تک اسکو ایک مکمل انسان تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔

آ گہی آ گہی

اک سوال

میں بھلا کون ہوں

کیا ہے مرا جواز

یاد رکھنا ہے کیا

بھول جانا ہے کیا

کون بتلائے گا

کس سے مانگوں جواب

اپنی سوچوں میں یونہی اُلجھتی رہوں

پیچھے دیکھوں کہ آگے ہی بڑھتی رہوں

دھندلی راہوں میں کھوئی رہوں کب تلک

ہے کہاں روشنی؟

فاطمہ حسن تحریکِ نسواں کی ایک سرگرم رکن ہے اور ڈاکٹریٹ کے لیے اس نے ادب میں نسائی تحریک ہی کو ریسرچ کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ ایک اچھی کہانی کار بھی ہے اور نسائی مسائل اس کی کہانیوں میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔

دنیا میں پھیلتی ہوئی تباہی اور ایک مخدوش مستقبل کی پرچھائیوں کے باوجود فاطمہ حسن ایک باحوصلہ، امید انگیز تخلیق کار ہے۔

اعتبار

اس دیئے کو جلنے دو
اس دیئے کی روشنی
سب کا اعتبار ہے
اس دیئے کی روشنی
گھر نہیں جلائے گی
جس جگہ اندھیرا ہے
اس جگہ تو جلنے دو

تحریر و تحقیق۔ خالدہ حسین

نسرین انجم بھٹی

"____ پس موردِ الزام ہونا ان کے نزدیک کچھ اور ہے اور ہمارے نزدیک کچھ اور' اور یہی فرض ہمیں زندہ رکھے ہوئے بھی ہے۔ ہمارے زندہ رہنے کے لیے محبت کا اظہار اور ان کے زندہ رہنے کے لیے نفرت کا اخراج ضروری ہے۔ ہم کھجور کے درخت اپنی پھانسیوں اور سدا بہار کے درخت اپنی سولیوں کے لیے کاشت کرتے ہیں۔ عورتیں مرد بچے' ہم سب ویسی ایک تیسری اور چوتھی دنیا صرف بچوں کے اضافے سے نہیں بناتے اپنے ہاتھوں' اپنے دلوں اپنے ارادوں' اپنی مجبوریوں اور محبتوں سے بھی بناتے ہیں۔ تشدد کا شکار اور تشدد کی پیداوار میں سے ایک 'ہیں' نسرین انجم بھٹی نے یہ نظمیں لکھیں اور ایک کتاب بنائی اور اس کا پیش لفظ لکھا' کاغذ پر' آپ سب دوستوں اور دشمنوں کے لیے "شکریہ" نسرین انجم بھٹی کا "بن باس" (۱۹۹۴ء) کا پیش لفظ اس تلخی کا مظہر ہے جس نے بن باس کی نظموں کے لیے روشنائی کا کام کیا۔ میں نے جتنی شاعرات کا مطالعہ کیا نسرین انجم بھٹی ان کے مقابلے میں سب سے زیادہ تلخ محسوس ہوتی ہے گویا اس نے قلم کے بجائے کیکٹس سے لکھا ہو۔ نظم "ڈونگھے پینڈے" ملاحظہ کیجیے۔

مری زندگی میرے جوتوں کا جوڑا
جنہیں پہن کر ____ پا پیادہ
مجھے کاٹنا ہیں کئی اونچے نیچے کٹھن راستے

بے سکون کڑی منزلیں

ڈونگھے پینڈے

اور ساتھ ہی نظم ''قربت''

ناکامی سی ناکامی ہے

چاروں اور اندھیرا ہے

لحہ لحہ بوجھل ایسے سرکا جاتا ہے

جیسے کوئی صد پایہ ہو

مرا اپنا بھی سایہ ہو

جہاں تک عورت' اس کی ذات و وجود اور اس کے صنفی تقاضوں کا تعلق ہے تو نسرین انجم کو ان کا شدت سے احساس ہے اور اس ضمن میں رقم طراز ہے۔

''... عورت کو میں نے طبقہ کہا صنف نہیں۔ کیونکہ صنف ہونے میں اس کا اپنا کوئی شعوری دخل نہیں طبقہ ہونے میں مردوں کا اس کا اپنا اور پورے نظام کا دخل ہے۔ اس طبقے کے پسماندہ ہونے کا دکھ میری شاعری کا دکھ ہے بلکہ در پردہ دکھ یہ ہے کہ افرادی طور پر مردوں سے زیادہ ہونے کے باوجود جو اکیلی اور بے اختیار ہے۔ معاشرہ کا جبر اسے جینے نہیں دیتا۔ اس کے اندر کا صبر اسے مرنے نہیں دیتا۔ اگر چہ اس کی طاقت ہی سے یہ معاشرے قائم ہیں۔ وہ ہر جگہ بالاتر ہے۔ محبت میں بھی شفقت میں بھی۔ اس معاشرے میں عورت کتنی بھی آزاد ہو معاشرے کی دیکھی ان دیکھی قدرت کی یرغمال ہے میں بھی اسی معاشرے کی دین ہوں۔

نسرین انجم کی تقریباً ساری شاعری اسی احساس کی ترجمان ہے دیکھئے نظم ''آخر آخر'' کا آخری بند۔

''بہت سی عورتوں کی طرح

جاہل' خودغرض اور ایک سی

بہت سی عورتوں کی طرح
سنگِ میل---- جامد مگر دہکتی ہوئی
ایک نظم بنتی ہے تو ساری دنیا سمیٹی جاتی ہے
سورج تو میرے بیٹے کا نام ہے اور چاند ابھی پیدا نہیں ہوا۔
ایک عورت نے کہا
عورت کا میکہ سب سے خوبصورت اور سب سے عزیز ہوتا ہے ایک اور عورت نے کہا
مجھے پھولوں سے گوندھ کر اس کے لیے روٹی پکا دو کہ پھر وہ مجھے کبھی نہ بھول سکے
آنسوؤں کے ڈھیر میں سے مجھے اٹھا لے۔ میں صرف ایک بوند ہوں
ایک اور عورت نے کہا اور کسی مرد نے نہیں سنا
اور یہ سطریں بھی ملاحظہ کیجئے
''دعائیں گونگی بیٹیاں ہوتی ہیں جن کی زبان صرف ان کی مائیں سمجھتی ہیں۔
اور باپ
تو وہ چٹان ہوتے ہیں جہاں سے گر کر کوئی نہیں بچتا۔
ان کے ساتھ درج ذیل سطریں بھی شامل کر لیں تو عورت کے المیہ کا موزیک تیار ہو جاتا ہے اور نسرین انجم کی شاعری کا بھی!
''موسموں کے منہ میں لکڑی کی زبانیں ہیں میں کس سے اپنا حال پوچھوں؟
قرضے میں میری رات آئی' ادھار میں مرا دن گیا
میری کوکھ میں ''نہیں'' کا لفظ گرا اور دوپہر دور تک سفید ہوتی چلی گئی
یہ بستی میری ہے یا میری نہیں' چیونٹیوں کی قطار سے پوچھنا جو میرا بانجھ بدن میلوں تک لیے جا رہی ہیں----
میری ماں نے مجھے چیونٹیوں کے منہ میں دیکھا تو بچانے دوڑی چیونٹیوں کے ساتھ میں بھی اس کے پاؤں تلے آ گئی
ہائے! میں نے کس کس کو کیسے کیسے دکھ دیئے

''بن باس'' میں اس انداز اور اسلوب کی نظموں کی کمی نہیں کہ بن باس کا مجموعی تاثر جذبہ' سوچ' احساس کی وحدت ہے جس کی بنا پر بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اشعار الفاظ کے محدب شیشے میں تبدیل ہو گئے ہیں یوں کہ الفاظ تمازت دیتے محسوس ہوتے ہیں۔

نسرین انجم نے احتجاج کے اسلوب میں جو شاعری کی اس کی تلخی کو خوشنما تشبیہوں جھلملاتے استعاروں سے کیموفلاج کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دوٹوک لہجہ میں براہِ راست بات کرتے ہوئے تلخ کو تلخ ہی بنا کر اپنے قاری کے کام و دہن میں تلخی بھر دیتی ہے۔ وہ تلخی کو شوگر کوٹڈ کرنے کے قابل نہیں۔ نسرین نے اس مقصد کے لیے نثری نظم سے وابستہ تخلیقی امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہی نہیں بلکہ وہ حسبِ ضرورت پنجابی اور انگریزی الفاظ سے بھی کام لیتی ہے۔ یہ چند مثالیں پیش ہیں۔

''لخ لعنت! مجھے الف کا مطلب تک نہیں آیا''

نظم ''بشارت''

slow poisioning تو نہیں کر رہے

''نظم اندازہ''

''آنسوؤں کے جھولے میں ہمارے چہرے dislocate ہو گئے ہیں۔

(نظم آپے رانجھا ہوئی)

سائیانائنڈ۔۔۔نظم نام)

بخیے ادھیڑ کر میرا pattern نہ دیکھئے۔

بس کسی رشتے کو folenon board پر explain کر ڈالوں۔

کوئی sleeping beauty جاگ جائے گی۔ (نظم ہم لڑکیاں)

میں تیرے لیے سانسوں کی سیڑھیاں اتر کر آئی اور تو نے کہا

I love you

Please don't say it again

کیونکہ ہر عورت اس کا مختلف مطلب لیتی ہے۔ (نظم مقدر)
اس کا diet chart بناتے ہوئے میں نے اپنے غریب دنوں کو یاد کیا۔ (نظم وہ اور میں)
یہ صرف چند مثالیں ہیں۔
یہاں کسی کی عملداری نہیں کہ یہ خطہ تخلیق ہے۔ لہٰذا یہاں شاعرہ کے الفاظ کا سکہ چلتا ہے۔ باطن بین (interovert) نسرین انجم نے شعوری طور پر اپنے لیے تخلیق کی صورت میں جس ''بن باس'' کا انتخاب کیا وہ غیر مرئی ذہنی کیفیات سے مشروط ہونے کے ساتھ ساتھ بصورت تخلیق شاعرہ کو اظہار کی توانائی عطا کرتا ہے ایسی توانائی جس سے مردوں اور ان کی ساختہ قدغنوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔
''بن باس'' اس مجموعہ کی آخری نظم ہے۔ اس کی چند آخری سطریں دیکھیے۔

باس نتی! من پیر کی نیاز دلا
جنگلی بیروں پر' سانپ کے پھن پر اور اپنی آزادی پر اپنی باس سے جنگل کو جنگل بنا دے۔۔۔۔۔ بے شرم' بے پناہ۔
اور بے مقصود۔ پہلے جیسا۔
دکھ کی ناک نہیں لیکن وہ سونگھ لیتا ہے اپنا شکار
ہرے بھرے دل اور گیروا آنکھیں
رہی! میں تو پریم دیوانی
باز آئی لہروں سے بن کی اجلی باس
دھوئیں اور خوف اور بے عزتی سے نچڑی ہوئی
بچے جن کر اور بے جنے بھی کہاں کہاں چھوڑ کر آئی بن کی باس
کہ جنگل تک پہنچتے پہنچتے!
گز بھر کی زبان
اور من من بھر کے پاؤں
بھائیں صاف کرنے والوں کے کیچڑ سر پر لادے
باز نہ آئی مرے من کی باس

باز آئی مرے سرخ سنہرے سبز رسیلے جنگل کی خوشبو
میں جنگل آپ جنگل باز آئی میرے بن کی باس
باز آئی بن باس متی
بیچ آئی سب ساون سورج سیپ چنگیر
اجڑی نچڑی باز آئی
میرے رب کی بیٹی
باز آئی مرے بن کی باس

ماہِ نو لاہور جنوری 2004 میں مطبوعہ مذاکرہ ''روشن خیال معاشرہ کی تشکیل میں ادب کا کردار'' میں گفتگو کرتے ہوئے نسرین انجم نے جہاں معاصر ادبی صورت حال پر اس کا اظہار کیا وہاں یہ بھی کہا ''ایک انحطاط پذیر معاشرہ میں ایک بڑھتے ہوئے معاشرہ میں جہاں ایک ادیب کی سوچ اور اس کی زندگی اسی الجھن میں کٹتی ہے کہ کیا کہا جائے۔ کیا نہ کہا جائے۔ کیا سوچا جائے اور کیا نہ سوچا جائے۔ اس میں اس کا ذاتی مفاد ہو گھر والوں کا مفاد ہو۔ اکیلے کا مفاد ہو۔ جس کے لیے وہ لکھ رہا ہے تو وہ تو تمام کے تمام خوف نظر آتے ہیں۔ کہیں مولوی صاحب کا خوف ہے پھر والدین کا خوف ہے کہیں برسرِ اقتدار لوگوں کا خوف ہے۔ اس طرح سے جگہ جگہ خوف ہیں۔ کہیں یہ کہ نوکری خطرہ میں ہے۔ کہیں یہ کہ ہر چیز خطرے میں ہے۔ تو یہ جو ڈولتی سی فضا ہے جس میں ادیب ایک دوہری شخصیت کے طور پر جی رہا ہے۔ ہمارے ہاں خاتون اکثر لکھنے بیٹھتی ہے تو وہ۔۔۔۔۔ کیا لکھوں کیا نہ لکھوں کی کیفیت میں مبتلا نظر آتی ہے۔

مگر نسرین انجم نے جسے To Be or Not to be کا مسئلہ نہ رہا اس نے جو چاہا لکھا۔ جس لہجہ میں چاہا لکھا اور جس اسلوب میں چاہا لکھا۔

نسرین انجم بھٹی نے خاصی طویل تخلیقی زندگی میں بہت زیادہ نہ لکھا مگر یہ اس کوتاہ قلم شاعرہ نے جو لکھا وہ جذبہ کی شدت' اسلوب کی تپش اور احساسات کے کامیاب اظہار کی وجہ سے قابل توجہ ہے تمام شاعرات میں نسرین انجم کم کلامی کے باوجود بھی اسی بنا پر نمایاں

ہے کہ اس نے اظہار کے لیے غزل پر اعتبار نہ کیا بلکہ نثری نظم کو اپنایا جو وسعت کے ساتھ ساتھ دو ٹوک لہجہ میں بات کرنے کے لیے بھی موزوں ہے۔ ہماری شاعرات نے تخلیقی اظہار کے لیے غزل کو بھی کامیابی سے استعمال کیا ہے اس میں پابند نظم آزاد اور نثری نظم کہنے والی شاعرات بھی ہیں مگر غزل کی صنف سے وابستہ فنی تقاضوں اور اسلوب کی مخصوص جمالیات کی بنا پر غزل میں رمز و ایما کے کنائے بروئے کار لائے جاتے ہیں اس لیے اس میں blunt ہو کر بات نہیں کی جاتی بلکہ نثری نظم اس مقصد کے لیے بہترین آلہ ثابت ہوتی ہے۔ اور یہی کچھ نسرین انجم بھٹی نے بھی کیا۔

”میں نے اپنی سولی اپنے کندھے پر نہیں اٹھائی
اپنے سینے سے لگالی ہے
میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا نا۔۔۔۔۔؟ (نیل)

یاسمین حمید

یاسمین حمید کی شاعری شعوری عمل نہیں بلکہ قلبی وادرات ہے۔ اس بات کا اندازہ اس کے پہلے مجموعہ کلام ''پسِ آئینہ'' ہی سے ہو جاتا ہے۔ عکس کے پیچھے ایک اور عکس کی کھوج ہی دراصل اس کی شاعری کی ایک سمت ہے۔ جسے وہ زندگی کی رنگا رنگی سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ یاسمین کے محسوسات زندگی کی ہر روش کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ اس نے جب بھی دریا کا حال لکھا ہے تو دریا میں اتر کر دیکھا ہے صرف کنارے پر کھڑے ہو کر لہروں کی کہانی نہیں سنائی۔ اس کتاب میں وقت' آئینہ' سمندر' قفس' سفر اور خواب جیسے استعارے زندگی کے اس طلسم کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو ابتدائے آفرینش ہی سے اس میں رکھ دیا گیا تھا۔ دھیمے لہجے کی یہ شاعرہ سادہ سے انداز میں اپنے شعروں میں معنی کی بہت سی پرتیں رکھ دیتی ہے۔ اس کا احساس شیشے کی طرح ہے۔ صاف شفاف اور اپنے اندر ایک معصومیت لیے ہوئے۔ ''پسِ آئینہ'' پیش آئینہ بھی ہے جس میں مناظر کے ساتھ زمانے بھی منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اپنی شاعری میں یہ شاعرہ عرفانِ ذات چاہتی ہے۔ وہ باطن کی دنیا آشکار کرنا چاہتی ہے۔ باطن کی طرف سفر کرتے ہوئے بھی وہ ہر مقام سے یوں ہی بے نیازانہ نہیں گزر جاتی ہے۔ بلکہ ایسی غضب کی آنکھ رکھتی ہوئی گزرتی ہے کہ ہر منظر اس کی آنکھ کے کیمرے میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ مگر ذات کے اس سفر میں وہ اگلے ہی لمحے یہ کہہ رہی ہوتی ہے کہ

ذرا سی دیر کو منظر بہت مکمل تھا
پھر اُس بعد مرے راستے میں جنگل تھا

بکھر گیا تو اک عالم کو وہ دکھائی دیا
ابھی تلک جو ستارہ نظر سے اوجھل تھا

یاسمین حمید کی شاعری دراصل اس کی ذات ہی کی سچائی ہے۔ وہ درونِ ذات کی شکست وریخت سے اپنی شعری فضا بناتی ہے۔ اس میں کبھی کبھی برونِ ذات کا سناٹا بھی در آتا ہے جس کی آواز کہیں کہیں اس کے شعروں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ ایسا سناٹا کہ بعض اوقات وہ تنہائی میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ وہ جاگنے والوں میں کیوں اپنا نام لکھا بیٹھی ہے۔ یاسمین کی شاعری زندگی کی جاگتی آنکھوں سے دیکھنے کا عمل ہے مگر اس کا کیا جائے کہ بعض اوقات زندگی درزی کی قینچی کی طرح پاس ہی پڑی ہوتی ہے اور ہم اسے ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں۔ ان شعروں میں یاسمین حمید کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہے۔

کنارے پر کھڑی ہوں اور کنارے ڈھونڈتی ہوں
سحر کی روشنی میں چاند تارے ڈھونڈتی ہوں
کھڑی میں آخری سیڑھی پہ اوپر دیکھتی ہوں
فلک کی آنکھ میں تازہ اشارے ڈھونڈتی ہوں

اس کی شاعری میں سمندر جیسی کشادگی، صحرا جیسی وسعت اور جنگل جیسی اداسی جگہ جگہ ملتی ہے۔ گویا اس کے شعر لفظوں اور آوازوں کے جنگل کی طرح ہیں جو ہر لمحہ ہمیں اپنی سمت بلاتے ہیں۔ اور ایسے میں اگر شاعرہ کے اختیار میں وقت کا اشارہ آ جائے تو وہ یوں گویا ہوتی ہے۔

اختیار میں اپنے وقت کا اشارہ ہو
ایک ہاتھ میں رستہ ایک میں ستارا ہو

یوں نہ ہو کہ آوازیں راستے میں کھو جائیں
اس سمے جواب آئے جس سمے پکارا ہو

مگر اگلے ہی لمحے وہ یہ بھی گلہ کرتی نظر آتی ہے کہ:

حرف مرے کیوں روئے روئے صرف اداسی لکھتے ہیں

آج مجھے کیوں سورج بھی بے نور کنایہ لگتا ہے

اوراس کے ساتھ ہی یاسمین حمید کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:

مرا چہرہ ہے برسوں کی کہانی

بہت کچھ دیکھتی ہوں آئینہ میں

کیا یہ اشعار محض انفرادی معانی کے حامل ویسے ہی ''اچھے'' اشعار ہیں جیسے کسی بھی معیاری غزل میں مل جاتے ہیں یا ان میں ایسا نفسی کنایہ بھی موجود ہے کہ انہیں شاعرہ کی تخلیقی شخصیت کی تفہیم کے لیے بھی کارآمد قرار دیا جاسکتا ہے۔

میں نے جب یاسمین حمید کے فن کا مطالعہ کیا تو پہلے مجموعۂ کلام ''پس آئینہ'' کی مانند تازہ مجموعہ ''حصارِ بے در و دیوار'' میں بھی ایسے مواد کی کمی محسوس نہ ہوئی جس کی روشنی میں ہماری یاسمین حمید یعنی بیوی، ماں، خاتون خانہ اور پرنسپل سے تو شاید ملاقات نہ ہو ہاں ہم یاسمین سے ضرور متعارف ہوسکتے ہیں۔ وہ یاسمین جوامورِ زیست میں شریک بھی ہے اوراس سے گریزپا بھی۔ جو خارج سے ہم کلامی کے ساتھ ساتھ (اپنی ذات سے) خود کلامی کی خوگر بھی ہے، اس کا دستِ ہنر جب شعر کی تخلیق سے یدِ بیضا میں تبدیل ہوجاتا ہے تو اس وقت وہ خاموشی سے بایاں ہاتھ اپنے پرس میں ڈال کر کچھ اور بھی تلاش کرنے لگتی ہے۔

''پس آئینہ'' کے مقابلے میں موجودہ مجموعہ کی یاسمین میں خوداعتمادی زیادہ ہے جس کے نتیجے میں اسلوب گرفت میں رہتا ہے۔ اور مٹھی میں سے پھسلتے ریت کے ذرات کی مانند الفاظ معانی سے سرکتے نہیں جاتے۔ اسی طرح یاسمین کے پاس جذبات تو ہیں مگر وہ جذباتیت نہیں جس کے باعث بعض شاعرات کے اشعار جلیبی کا گاڑھا شیرا بن جاتے ہیں۔ ان کے برعکس یاسمین تخلیقی عمل کے ''حصار بے در و دیوار'' میں چاند کی بڑھیا کی مانند شعر کے چرخے پر لودیتے احساسات کی پونیاں کاتتی جاتی ہے۔ شاید موجودہ یاسمین کو آپ بڑھیا کے روپ میں دیکھنا پسند نہ کریں خواہ وہ چاند ہی کیوں نہ ہو مگر میں کیا کروں کہ اپنی معصوم نگاہی اور خوش اطواری کے باوجود اپنی شاعری میں تو یاسمین مجھے چاند کی بڑھیا ہی محسوس ہوتی ہے۔ نہ وہ ٹین ایجرز کے کچے پکے ان سپنوں کی شاعرہ ہے نہ اس کی شاعری اٹھتی جوانی کی انگڑائی ہے۔ اور نہ ہی اس کے ہاں وہ خروش ملتا ہے جو لہو کے سرخ خلیات

کے دھمال سے جنم لیتا ہے۔ یاسمین کی شاعری کے مجموعی تاثر کو بجلی کی چکا چوند سے نہیں بلکہ دیئے کی مدہم لو کی مثال سے سمجھایا جاسکتا ہے، دیئے کی وہ لرزتی اور لجائی لجائی سی لو جو تاریکی کے وسیع دائرے میں روشنی کی امین ہوتی ہے یوں کہ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے وجود کا احساس کراتی رہتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت یاسمین کی بھی ہے جس کے بقول:

وہ دیا کیا دیا ہے جو جلتا نہیں
راستے کا قرینہ بدلتا نہیں

اس دیئے کی لو کو یاسمین نے آہنگ ذات سے یوں ہم آہنگ کرلیا:

مجھے بے مائیگی کا دکھ نہیں تھا
اندھیرے میں دیا جلنے سے پہلے

تخلیق کار کی کیلنڈر عمر کچھ اور ہوتی ہے اور تخلیقی عمر کچھ اور۔ اور ان دونوں میں بالعموم ہم آہنگی نہیں ملتی، کبھی یوں ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل کی ایک ہی جست شاعر کو ستاروں سے بھی پرے لے جاتی ہے اور تخلیق کے زماں میں وہ ایک ہی سانس میں وقت کا طویل فاصلہ طے کرلیتا ہے۔ جبکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات شاعر ابتدائی تجربات کے بچپن ہی سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور بلاشبہ بدقسمت ہے وہ ادیب جو تخلیقی اعتبار سے مرحوم تو ہو چکا ہے مگر ابھی تک موت کی اطلاع اس تک نہیں پہنچی۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے یاسمین کو ''وہ'' کیوں نہیں مانا جو بظاہر ''وہ'' نظر آتی ہے۔ تو سیدھی سی وجہ یہی ہے کہ بلحاظ تخلیقی عمر وہ کیلنڈر عمر سے کہیں آگے کا سفر طے کر چکی ہے۔ یہ سفر ہے ذات کے داخلی خلا میں۔۔۔۔ تھکے جذبات، نڈھال آرزوئیں۔ مکھلائی تمنائیں، نارسائی کے احساس سے گرانبار۔ منطقہ ذات کے چاند کی بڑھیا! فرق صرف یہ ہے کہ جس طرح آتش ذات ہی میں بھسم ہو کر ققنس نیا جنم پاتا ہے اسی طرح ناآسودہ وجود کی راکھ سے ہی تخلیق کی چنگاری پھوٹ کر جسم کی پھلواری کو شاداب کر جاتی ہے۔ تخلیقی عمل کے فیض سے کیکٹس، گلاب میں تبدیل ہو جاتے ہیں یوں دیکھیں تو یاسمین کا ''حصارِ بے درودیوار'' سے فرار کشت آرزو میں تخلیق کے پھول کھلانے کے عمل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور دیکھئے یاسمین نے کیسے کیسے پھول کھلائے ہیں۔

موسمِ خشک میں خوشبو کا تصور تو رہے
طاق میں پھول کی تصویر سجائے رکھنا

کیسے پت جھڑ کے ہاتھ آئے گی
شاخِ گل جو شجر کے اندر ہے

جس نے پھول چنے ہیں میرے صحرا سے
میری آنکھوں کو اپنی بینائی دے

جس طرح کردار ہے لازم کہانی کے لیے
شرط ہے پھولوں کا ہونا باغبانی کی لیے

گل کھلانے کے لیے بیتاب ہو مٹی مری
ذات کی ویرانیوں کو پھر وہی انداز دو
مٹی کی نمی شاخِ ثمر دار کے اندر
خالق کا لہو جس طرح شہکار کے اندر

خشک مٹی سے نہ ہے تیز ہواؤں سے گلہ
یہاں پھولوں نے ہی پھولوں پہ کیا پتھراؤ

گل سرِ شاخ کھل گیا پھر سے
جھک گیا تھا جو سر اٹھا پھر سے

اگرچہ کشتِ آرزو کی رعایت سے پھولوں جیسے یہ اشعار یقیناً شعورِ انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ لیکن اس انداز و اسلوب کے خوشبو دیتے اشعار کی یاسمین کے یہاں کمی نہیں، یہ جو اسے شہرت مل گئی تو یہ بلا وجہ نہیں، اس لیے کہ یاسمین پی آر کے فن سے نا آشنا ہے، نہ اسے جرائد میں چھپنے کا شوق ہے نہ شاعروں میں جا کر خود نمائی کی خواہش۔

یاسمین کے کلام کی جو معنویت بحیثیت مجموعی دامنِ دل کھینچتی ہے وہ اس کا مخصوص طرزِ احساس ہے جس سے وہ افراد، اشیا اور موضوعات کا مشاہدہ اور پھر مطالعہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرزِ احساس نسوانی ہی ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ مگر یاسمین کی تخلیقی شخصیت کے نرم پہلوؤں سے یہ یوں جلا پاتا ہے کہ محض مردانہ اور زنانہ سے ماورا ہو کر خالص شاعرانہ بن جاتا ہے۔ اسی طرزِ احساس نے یاسمین کی نگاہ کو وہ مخصوص زاویہ مہیا کیا جس میں وہ اردگرد پھیلی دنیا اور زندگی کو دیکھتی، سمجھتی اور پرکھتی ہے اس ضمن میں وہ محض عورت بن کر شعر کو جذبات کی ابلتی ہنڈیا نہیں بنا دیتی بلکہ پختہ فکری کا ثبوت دیتے ہوئے یوں کلام کرتی ہے:

کیسے دریا ہو جو سیراب نہیں کر سکتے
دشت کو جادۂ مہتاب نہیں کر سکتے

———

اک اجالے کے قفس میں بیٹھ کر
میں نے لکھی ہے کہانی رات پر

———

تلملایا کوئی مجھ کو ہار کر
میں ہوئی حیران اپنی مات پر

یاسمین کا ایک معنی خیز شعر ہے:

میں اسے حرف میں محبوس نہیں کر سکتی
جس تخیل سے مری ذات میں ہے پھیلاؤ

یہ ایسی تخلیق الجھن ہے جس سے ہر تخلیق کار آگاہ ہے۔ یہ الجھن کبھی آشوب احساس سے جنم لیتی ہے تو کبھی آشوبِ آگہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ گہری کیفیت اور شدت ادراک اور اظہار و ابلاغ کے بُعد کے باعث تخلیقی سطح پر یہ tobe or not tobe جیسا delimma بھی جنم دے سکتی ہے۔ تخلیق کار کی انفرادیت کا اظہار لفظ' جذبہ اور معنی کی مکمل وحدت سے مشروط ہوتا ہے یوں کہ بقول یاسمین:

حدِ امکاں کی صورت ہی نہ ہو پھر
میں جب حرفوں میں حرفِ ذات لکھوں

مگر یہ سب اتنا سہل بھی نہیں جتنا کہ "آمد" جیسی اصطلاحات سے بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ متنوع لاشعوری احساسات نے شعور کی چھلنی سے چھن کر لفظ کا روپ پانا ہوتا ہے۔ تخلیق کار کی نفسیات کے نقطہ نظر سے جہاں یہ معنی خیز ہے کہ کسی بات کا اظہار ہو رہا ہے وہاں یہ امر اس لیے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ کس کس بات کا اظہار نہ ہو پایا۔ اظہار اور اخفاء کی دو انتہاؤں کے درمیان یاسمین بھی بعض اوقات اسی تخلیقی الجھن میں گرفتار نظر آتی ہے۔

کنجِ تنہائی میں کھلتا ہے تخلیل میرا
اور میں خوش ہوں کہ یہ گل پھر سے نکھرنے کو ہے

چھوڑ دوں یا اسے اندوہِ قفس میں رکھوں
ایک امید کا طائر جو مرے جال میں ہے

میں نے ملبے کو ہٹا کر دیکھا
ایک اک خواب مرا زندہ ہے

بحیثیت شاعرہ یاسمین نے اپنے لیے جو آدرش اپنایا اس کی اساس لفظ اور جذبہ کی وحدت کی تشکیل پر استوار ہے اس لیے جلد ہی وہ اس تخلیقی الجھن کے دائرہ سے باہر آ جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اس کے پاس بعض الفاظ کا ذخیرہ ہے جس سے وہ اپنی غزل کے اسلوب کو پُر ذائقہ بنانے میں کامیاب رہتی ہے۔ اگر یاسمین کا اسلوب مفرس نہیں مگر اس کے باوجود بعض اوقات ترکیب تراشی میں اس نے حسن سلیقہ کا ثبوت دیا ہے چند تراکیب دیکھئے۔ دامِ رہ گزر (ص:۱۶) کاروانِ بے دلی (ص:۲۵) ثباتِ تشنگی (ص:۲۶) اعتبارِ وقت (ص:۳۵) معیارِ ظرف (ص:۳۷) قفسِ آزاد (ص:۴۵) اندوہِ قفس (ص:۸۴) لوحِ ناہموار (ص:۱۱۱)۔۔۔۔ان تراکیب کے پر معنی صوتی تاثر کے بارے میں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے بعض تراکیب۔۔۔۔ جیسے "لوحِ ناہموار" تو شعری مجموعوں کے نام بھی بن سکتے ہیں۔

یاسمین کے اسلوب میں جو خاص طرح کی کوملتا ملتی ہے اسے پیکرِ محسوس میں اگر دیکھنا ہو تو پلکوں کی چھاؤں میں جھکی جھکی آنکھوں والی اس دوشیزہ کو تصور میں لایئے جو گالوں کی سرخی سے لب گویا کا کام لیتی ہے۔

کئی نقطے پسِ ابلاغ ہوں گے
بہت کچھ چھپ گیا ہے دائرے میں

جس طرح بولتے ہونٹوں کے مقابلے میں بولتی آنکھیں اچھی لگتی ہیں اور بولتی آنکھوں کے مقابلے میں کچھ کہتا ہوا پیشانی کا عرق انفعال۔ اسی طرح یاسمین نے بھی اپنے اسلوب میں کچھ کنائے رکھے ہیں ہر چند کہ ایک شعر میں اس نے سورج کو بے نور کنایہ قرار دیا تھا مگر خود اس نے اپنے اسلوب کے ذائقہ کا زیادہ تر اظہار کنایوں پر ہی رکھا ہے۔ ایسے کنایے جو استعارہ کی تہہ داری اور علامت کی توانائی کے حامل نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں سمندر سرفہرست ہے اور بلاشبہ اسے یاسمین کا پسندیدہ کنایہ قرار دیا جا سکتا ہے اس کے بعد شجر/پیڑ ہے اور پھر سورج، بارش، پتھر، برف، صحرا، بشر، کفر، دیا/چراغ اور خوشبو وغیرہ ہیں

اگر چہ یہ تمام الفاظ جدید شاعری کی ٹکسال کے سکے ہیں مگر لفظ کے محض الفاظ اور تخلیقی استعمال میں بہت فرق ہوتا ہے اور یاسمین نے اس فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ طوالت کی بنا پر تمام کنایوں کی مثالوں سے احتراز کرتے ہوئے اس امر پر ضرور زور دوں گا کہ سمندر سے یاسمین کو لغوی دلچسپی ہے چنانچہ سمندر، ساحل اور لہر کے تلازمات سے یاسمین نے کوئی دو درجن کے قریب معنی خیز اشعار کے موتی اجالے ہیں ایسے اشعار جن میں سمندر بعض اوقات کنایہ، استعارہ اور علامت سے بڑھ کر زندہ پیکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے ایسے اشعار جنہیں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا یاسمین کے لیے سمندر نے اچھی خاصی fixation (یا پھر obsession) کی صورت اختیار کر لی ہو۔ سمندر کے اشعار سے میرا جی کی ایک خوبصورت مگر پیچیدہ نظم ''سمندر کا بلاوا'' یاد آتی ہے ہر چند کہ عفیفہ کا طرز احساس میرا جی کے بالکل برعکس ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ سمندر سے یاسمین کی گہری وابستگی کہیں نفسیاتی معانی نہ رکھتی ہو۔ بہر حال چند مثالیں پیش ہیں:

سمندر سے مرا رشتہ بہت گہرا ہے لیکن
کبھی پتھر کے ٹیلوں کی روش بھی آزماؤں

سمندر سے تو خالی ہاتھ لوٹے
کسی کے سیپ سے موتی چنیں کیا

ہم سمندر کی تواضع کیلئے
ایستادہ ہیں کناروں کی طرح

ناؤ کا فرش ہے مرا مسکن
اور سمندر کی پاسبانی ہے

———

جہاں دریا سمندر ہو رہا ہے
وہاں اس کے کنارے مختلف ہیں

———

ہم سمندر سے نمٹ آئے ہیں
زد پہ اب پیاس کے، اک صحرا ہے

———

یہ کیسا اوج اس کی لہر میں ہے
سمندر کا قرینہ نہر میں ہے

———

حقدار ہے وہ گہرے سمندر کی دید کا
دریا نما اداؤں کے جو ناز اٹھا سکے
سمندر ڈھونڈتا دریا کا پانی
زمیں پر حسن بوتا جا رہا ہے

ہم ابتدا میں نفسیات کی بات کر چکے ہیں تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ بعض امور کی حد تک تو ''حصارِ بے در و دیوار'' شاعرہ کی جذباتی سرگزشت میں تبدیل ہو جاتی ہے تاہم اسے شاعری کا مجموعہ ہی سمجھا جائے کہیں ہسٹری نہیں۔ اکثر حساس فن کاروں کی مانند یاسمین بھی خود سے فرار حاصل نہیں کر سکی اس نقطہ نظر سے یہ مجموعہ خاصہ دلچسپ ہے کہ ہمیں بہت کچھ بتا جاتا ہے۔ اب یاسمین حمید کی زندگی کی جمالیات سے آراستہ ایک غزل اور کچھ

دوسرے شعر دیکھئے:

نہ جواب ہوں کسی بات کا نہ سوال ہوں
فقط ایک حیرتِ مستقل کی مثال ہوں
میں وہ کیف ہوں جسے انتظار کی خو ملی
سرِ وقت ساعتِ دید ہوں نہ وصال ہوں
ہوں سراغ نقطۂ درمیاں کی کلید کا
نہ عروج کی کوئی حد ابھی نہ زوال ہوں
سرِ دشت نقشِ سراب کی رہی منتظر
جسے تابِ درد ہے وہ نگاہِ کمال ہوں

مجھے فکر کے کسی آئینے میں ملو کبھی
کہ جو جسم و جاں سے ہے ماورا وہ جمال ہوں
ذات کی ٹوٹ پھوٹ کا منظر
رشک آفات ناگہانی ہے

میں نے ناکردہ گناہوں کو نہ تسلیم کیا
بس یہی جُرم مرے نامہ اعمال میں ہے

مرے وجود میں ایسا بھی ایک صحرا ہے
اٹی ہوئی مرے چہرے پہ جس کی دھول نہیں

اپنی پیاس کی گہرائی کا بھید سمجھ کر
اپنی ہی آنکھوں میں دریا ڈھونڈ لیا ہے

جن ارادوں کا دفینہ رہِ پامال میں ہے
ذکر ان کا بھی ضروری مرے احوال میں ہے

پسِ آئینہ اور حصارِ بے درودیوار سے جب وہ آدھا دن اور آدھی رات تک آتی ہے۔ تو زندگی کے قرینے بڑی حد تک بدل چکے ہوتے ہیں۔ اب وہ زیادہ گہرائی میں جا کر چیزوں کو دیکھتی اور پرکھتی ہے۔ اب اس کی خواہشوں' خوابوں اور سچائیوں میں ایک اور وضع کی طرح داری ہے۔

جو ٹتا جا رہا ہے پھر وہی منظر بنانا ہے
مجھے احساس کی دیوار میں اک در بنانا ہے
کنارِ دشت اک کشتی ہے اور پتوار ہاتھوں میں
سو اب دریا مجھے اس دشت کے اندر بنانا ہے

اور آگے ''فنا بھی ایک سراب'' ہے مگر اس میں بھی تعمیر کی وہی حسرت ہے جو ''آدھا دن اور آدھی رات'' کے سفر میں تھی۔ یہاں تک آتے آتے اس میں اپنی سچائی کو محسوس کرنے اور پھر اسے بیان کرنے کا جو سلیقہ اور حوصلہ آیا ہے۔ اس کی مثال کم کم ہی ملتی ہے۔ یاسمین حمید کی ایک نظم ''ہمیں سچ بولنا ہے'' دیکھئے جو شاید زندگی کا آخری سچ بھی ہو سکتا ہے

ہمیں سچ بولنا ہے
اپنی خاطر
اور پھر سچائی کی تنسیخ کرنی ہے
سنبھلنے کے لیے
پتھر سے بھاری سچ کو
اپنے سرد ہاتھوں میں جلا کر موم کرنا ہے
پگھلتے موم کو آسودگی کا نام دینا ہے
اسی آسودگی پر ایک زندہ شہر کی بنیاد رکھنی ہے
اور آنکھیں بند کر کے شہر کو تعمیر کرنا ہے

''فنا بھی ایک سراب'' میں ایک لو دیتی اداسی ہے۔ جس کی روشنی میں ہم گزشتہ کا

اندوختہ بھی دیکھ سکتے ہیں اور آنے والے دنوں کے خوابوں کی تعبیریں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ یاسمین حمید نے زندگی کے دریچوں سے کائنات کے ایسے ایسے منظر دکھائے ہیں جو پُر اسرار ہونے کے ساتھ ساتھ پر کیف بھی ہیں۔ یہ شاعرہ اپنی ذات میں بلا کا عصری شعور رکھتی ہے اس کا وژن مضبوط اور مشاہدہ قوی تر ہے اور پھر یہ کہ وہ اظہارِ بیان میں ایسی سچائی کی حامل ہے جو یونہی نہیں آجایا کرتی اس کے لیے زندگیاں اور عمریں درکار ہوا کرتی ہیں۔ زندگی جتنا بڑا موضوع ہے فنا اس سے بھی بڑا استعارہ ہے۔ یہ بابِ حیرت اک اور بابِ حیرت کی طرف کھلتا ہے۔ یاسمین حمید نے حیرت کے اس سفر میں ہست و عدم کے حوالے سے اپنی چھوٹی سی سچائی کو یوں بیان کیا ہے۔ نظم ہے اک اور دن گزر گیا۔

سانس کا دھواں تمام کھڑکیوں پہ جم گیا
پھر ایک شہر گم ہوا
تماشا گاہِ روز و شب میں صرف میں ہوں
اور سنگ و خشت کا حصار ہے
لہولہان واہموں کی آہٹیں ہیں
چھپکلی سی رینگتی
سخن طراز عورتوں کا غول سرسرا رہا ہے
میری سمت بڑھ رہا ہے
درد کی تپش سے دل کے روزنوں پہ لہلہاتی شاخِ گل جھلس گئی
کسی کی معترض نگاہ اعتبار کی حدوں پہ رک گئی
اور آج بھی یہی ہوا کہ
کہ عہد نامۂ وفا کی سطرِ خاص
کاغذی تعلقات کے حساب میں لکھی گئی
کتابِ دل کا ایک اک ورق گواہ ہے
کتاب بے پڑھی ہی رہ گئی
صریرِ خامۂ سیاہ نے صدا بلند کی

تو سوچتی سماعتوں کا دائرہ سمٹ گیا
کسی کا نام دوسرے کے نام سے جدا ہوا
اور انتظار نے دلوں کی سرزمیں پہ اک لکیر کھینچ دی
ہواؤں نے سخن کیا
تو گھر کے سارے لوگ روشنی بجھا کے سو گئے
اک اور دن گزر گیا!

تحریر و تحقیق۔ ڈاکٹر سلیم اختر

منصورہ احمد

''طلوع'' منصورہ احمد کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعرہ اپنی ذات کی تلاش میں ہے۔اس سفر میں وہ کئی نادیدہ رستے بھی دیکھ آئی ہے جو زندگی سے شروع ہوکر واپس زندگی کی طرف آتے ہیں۔اس کی نظمیں ایک حیرت سرا تعمیر کرتی ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس حیرت سرا کے دروازے کھولتی چلی جاتی ہیں۔کبھی کبھی سب دروازے کھلنے پر بھی معنی کا کوئی نہ کوئی دروازہ بند رہتا ہے۔غزل میں کومل جذبوں کی عکاسی کرتی ہے۔ بیان کی سادگی اور تازگی شعروں میں ہر جگہ اپنا عکس دکھاتی ہے۔ ''طلوع'' آغازِ صبح کی شاعری ہے جس کا سفر شب کی طرف نہیں بلکہ اگلی صبح کی طرف ہے۔ بغیر کسی شبے کے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی نظم میں زیادہ توانائی کے ساتھ سامنے آئی ہے۔ ''اپنے بابا کے لیے'' لکھی گئی نظم میں اپنائیت بھری مقدس فضا پڑھنے والے کو دیر تک مسحور کیسے رکھتی ہے۔''سیمیا'' خوابوں اور عذابوں بھرے رستے کا سفر ہے''جلسۂ عام'' میں تاریخ اپنے پورے منظر نامے کے ساتھ جھلک رہی ہے۔''شاہِ والا'' میں دربار سے وابستہ کارپردازانِ شاہ کے جبر کی طرف اشارے ہیں۔

منصورہ احمد کی نظموں میں درد کی جو ہلکی ہلکی کسک ہے وہ تادیر قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔اس تاریخی تمثال نگاری میں بھی اس کا لہجہ نیا اور توانا رہا ہے۔ہمیں حیرت ہے کہ اس نے خاروں بھرا یہ راستہ کیسے چنا ہے۔اور اس میں وہ سرخرو بھی ہوئی ہے۔غزل میں اس نے روایت سے رشتہ جوڑا ہے اور نظم میں عصری آگہی کے ساتھ نئے رنگوں کی آمیزش نے ایک نیا کینوس دیا ہے۔کہیں کہیں اس کا دکھ پڑھنے والے کا دکھ بن گیا ہے اور کہیں وہ اپنی ذات کے انکشاف میں لفظوں کی اوٹ میں چلی گئی ہے۔طلوع کی شاعری

دراصل ہے ہی انکشافِ ذات کی شاعری اس شعری عمل میں اس نے جو علامتیں وضع کی ہیں وہ مکمل ابلاغ رکھتی ہیں اور زندگی کے بہت ہی قریب ہیں۔ جذبوں کے اظہار میں بھی اس نے سیدھا اور سچا انداز اپنایا ہے۔ تہذیبوں اور رویوں کا اظہار کرتے وقت بھی اس نے زندہ اور غیر مبہم علامتوں کا سہارا لیا ہے۔ یہ اپنے عصر کی ایسی شاعرہ ہے جس کی شاعری میں خود اس کا اپنا لہجہ بولتا نظر آتا ہے۔ اس لہجے نے اس کتاب کی نظموں اور غزلوں کو گویا ایک قسم کی گویائی عطا کر دی ہے۔ ہر لہجہ تروتازہ بھی ہے اور پُر تاثیر بھی۔ ''طلوع'' میں ایسا آفتاب طلوع ہوا ہے جس سے امکانات کے کئی روشن در کھل سکتے ہیں۔ رشید حسن خان لکھتے ہیں:

> ''شاعرات کے سلسلے میں جس چیز کو ''کچی عمر کی شاعری'' کہا جاتا ہے منصورہ کی شاعری اس سے محفوظ رہی ہے، یہ بڑی خوبی کی بات ہے اور ایسا کم ہوتا ہے اس میں شاید اس بات کو بھی دخل ہے کہ شخصی احساسات اور ذاتی کرب کے ساتھ سیاسی موضوعات کے ہلکے گہرے عکس بھی شروع ہی سے نگاہوں میں بسے رہے ہیں۔ اور شاعری میں تاثیر تہہ داری اور وسعتِ فکر و خیال کے اجزا شامل رہے ہیں۔ اس زمانے میں جبکہ نئی بات کہنے کے پھیر میں بہت سے لوگ گرفتار ہیں اور اکھڑے اکھڑے لہجہ میں شعر کہنے کو باشعور ہونے کی پہچان فرض کر لیا گیا' منصورہ کی نظموں کا یہ مجموعہ سچ مچ اپنی الگ پہچان بنائے گا۔''

اگر منصورہ کی شاعری کسی طور پر منفی وجود ذات واعصاب ہے تو ایسا نہیں۔ وہ ذات کے حوالے سے بھی بات کرتی ہے مگر کمال یہ ہے کہ منصورہ ان کا اسی اسلوب میں تذکرہ کرتی ہے کہ انہیں ذات کے پیدا کردہ ہیجانات سے بلند کر کے تخلیقی ترفع سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ بچپن میں سبھی بھائی بہنوں کی چٹیا کھینچتے' گڑیاں توڑتے' پلیٹ میں سے بوٹی اچک لیتے پیسے چھین لیتے اور گال نوچ لیتے ہیں کہ بہنیں ہوتی ہی اسی لیے ہیں۔ منصورہ بھی اس تجربے سے گزری مگر جب ماضی کی بازیافت کرتی ہے تو نظم ''میں گڑیوں

سے نہیں کھیلی،، جیسی نظم تخلیق کر لیتی ہے۔

میں گڑیوں سے نہیں کھیلی
میرے بھائی میری گڑیوں کی ٹانگیں اور بازو توڑ دیتے تھے
میرے آنگن میں اک سورج کا گھر تھا
یہاں سارے کھلونے اور غبارے بھک سے اُڑ جاتے
سنا ہے سب کا اک بچپن تو ہوتا ہے
مرا بچپن کہاں ہے؟
تو پھر یہ کون ہے جو ہر گھڑی مجھ سے
مری ٹوٹی ہوئی گڑیاں
کھلونوں اور غبارے مانگتا ہے
سنا ہے زندگی کا آغاز بھی بچپن سے ہوتا ہے
تو میری زندگی آغاز کب ہوگی؟

عام سے موضوع پر یہ سادہ نظم ذاتی تجربے سے ماورا ہو کر سب لڑکیوں /عورتوں/بوڑھوں کی ترجمان بن جاتی ہے۔ پاکستان کی وہ لاتعداد لڑکیاں اور عورتیں جو عمر بھر ہرج مرج کھینچتی زیست کر جاتی ہیں مگر ان کی زندگی آغاز نہیں ہوتی منصورہ کی شاعری کی اسی خصوصیت کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی کہ وہ محض ذات کے حصار میں مقید رہنے کے برعکس ذات کو اجتماعی روپ دے کر اگر ایک طرف اپنا کیتھارس کرتی ہے تو دوسری جانب پوری صنف کی ترجمان بھی بن جاتی ہے۔اس کے ساتھ ہی ملاحظ کیجئے چار سطروں کی نظم ''مرے مالک''

''مرے مالک!
تجھے تو علم ہی ہوگا
جو بچپن سے بڑھاپے میں چلے جاتے ہیں
ان سب کی جوانی کون جیتا ہے؟

منصورہ نے ''اثاثے'' میں اپنے والد مرحوم کی محبت اور شفقت کو بڑی محبت سے

یاد کیا ہے اسی تناظر میں دیکھئے نظم ''سن تو لکھی بابل مورے'' یہ نظم جو محض سنہری بچپن کے ناسٹلجیا میں تبدیل ہو کر محض ایک جذباتی نظم میں تبدیل ہو جاتی ہے، منصورہ کا تخلیقی وژن ہے سہانے بچپن کی عام سطح سے بلند ہو کر زندگی کی تلخیوں کے آئینے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نظم کا آخری بند پیش ہے:

اپنے ہونے اور نہ ہونے کے دوراہوں پر چلنا تھا
لیکن یہ سامان سفر کا
دنیا کے سب بازاروں میں
ڈھونڈ ڈھونڈ کے خالی ہاتھوں لوٹ آئی ہوں
تم سے ایک گلہ کرنا ہے
تم تو دنیا سے واقف تھے
پھر مجھ کو ان جگمگ کرتی دو آنکھوں کی
ٹھنڈی میٹھی گود کی
اور خوابوں کی نگری تک لے جانے والی اس ناؤ کی
اتنی عادت کیوں ڈالی تھی
خواب سراب کے اس دھوکے پر
آج میں تم سے روٹھ نہ جاؤں

اس نظم کے ساتھ ہی نظم ''میں مجرم ہوں'' کا مطالعہ کرنے پر بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچی ہے:

بابل میرے! میں مجرم ہوں
تم سے میرے سارے وعدے جھوٹے نکلے

اور اس کے بعد منصورہ نے وہ وعدے گنوائے ہیں جو نبھائے نہ جا سکے۔۔۔'' میں نے تم سے عہد کیا تھا، سچ بولوں گی'' ۔۔۔۔ ''سب سے پیاری چیز اٹھانے کو بھی نیچے نہیں جھکوں گی'' ۔۔۔۔ مگر وہ ''آدرشوں کی زمین پر قدم جما'' کر راہِ زیست طے نہ کر سکی۔ کہ عہد منافقت میں وعدہ نبھانا ناممکن ہوتا ہے۔۔۔ عبارت سبق کی کی جاتی ہے اور افسوس

حاصل کا! اور یہی عالم ہماری شاعری کا بھی ہے۔

لیکن بابل! پاؤں تلے کی بے نم مٹی تو پیاسی ہے
اور میری آنکھوں میں آنسو سوکھ گئے ہیں
رستے مجھ سے آگے نکل کر بھاگ رہے ہیں
اب میرے پاؤں تھکنے لگے ہیں
آؤ! ان بنجر آنکھوں پر بوسہ دے کر تجھے سلا دوں!

آخری مصرع صحیح معنوں میں بیٹی کے احساسات کا مظہر ہے کہ وہ خاوند' بچوں' ساس باس کسی سے بھی روٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتی صرف بابل سے روٹھ سکتی ہے کہ اس کے منانے میں پیار بھی ہوتا ہے اور لاڈ بھی!

منصورہ کے لیے ''بابل'' سے بابا تک کا سفر شاید ایک جذباتی جست کے مترادف ہو گا بابل نے شفقت اور تحفظ دیا جبکہ بابا نے تخلیقی توانائی کے لیے نہ صرف راستہ دکھایا بلکہ تخلیقی اعتماد بھی بخشا۔ محترم احمد ندیم قاسمی پر منصورہ کی پانچ نظمیں روایتی انداز میں بیٹی کی محبت کے اظہار سے بڑھ کر تخلیق کا ترفع حاصل کر لیتی ہیں ملاحظہ کیجئے نظم ''بابا سے ایک سوال'' یہ سوال بیٹی کا باپ سے کم اور اپنے عمر کے تضادات سے زیادہ ہے۔ ہم جس طرح سے تضاد در تضاد زندگی بسر کر رہے ہیں ہمارے آج کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے او راس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ اکثریت کو ان تضادات کا احساس بھی نہیں ہے مگر منصورہ کہ تخلیق کار کی آنکھیں رکھتی ہے وہ اپنے بابا سے سوال کرتی ہے۔

''یہ کیسے سرد چہروں سے بھرے شہروں میں
جینے کی سزا سونپی گئی ہم کو
یہ کیسے رات جیسے دن ملے ہیں سانس لینے کو
جہاں سینے میں نیزے کی انی چلتی ہے
تو ہم سوچ لیتے ہیں
ابھی زندہ ہیں جیتے ہیں
یہ کیسے شہر ہیں جو جاگتی آنکھوں سے سوتے ہیں

یہاں تو سب کی عمریں

گدلے گدلے پانیوں کی سبز کائی میں گندھی ہیں

کہاں کی منزلیں ہیں اور کہاں کے راستے ہیں

ہمارے معاشرے میں ذاتی تشخص کے پنپنے کے برعکس عورت کو نہ ہونے' بے وجود اور بے ذات ہونے کا احساس کرایا جاتا ہے کبھی ریت رواج کے نام پر کبھی خاندان اور ناک کی دلیل سے تو کبھی ویسے ہی بلا وجہ۔

مرد وجودِ زن کو بحیثیت مرد تسلیم کرنے کے برعکس رشتوں کے حوالے سے اس کی شناخت کرتا ہے۔ ماں ہے تو پاؤں کے نیچے جنت ہے۔ بیوی ہے تو پاؤں کی جوتی ہے اس لیے ہماری عورت بے وزنی کے عالم میں رہتی ہے حتیٰ کہ گھر اور اولاد کو حاصلِ زیست سمجھتی ہے۔ بالآخر وہ بھی اس کے نہیں ثابت ہوتے بلا شبہ عورت خسارے میں ہے اور یہی المیہ منصورہ کا بھی ہے، نظم "گواہی" میں اس نے جو سوال کیا دراصل وہ ہر عورت کا سوال ہے۔

"میں کس سے اپنے ہونے کی گواہی لوں!

مری سب آشنا آنکھیں مری تکذیب کرتی ہیں

مرے سب آشنا لہجے تہی لفظوں سے بوجھل ہیں

اب ان ناموں کی ساری تختیوں پر کچھ ادھورے حرف باقی ہیں

مجھے کچھ زخم خوردہ ساعتوں کے پار اترنا ہے

میں کس سے راستہ پوچھوں؟

گلی میں ہر قدم پر اجنبی چہروں کے لشکر ہیں

میں کس سے اپنے ہونے کی گواہی لوں۔۔۔!

گواہی دے نہیں سکتے۔۔۔ نہ دو

لیکن مرا اک کام تو کر دو

مری پہچان میں الجھے ہوئے مکڑی کے سب جالے مجھے دے دو

کوئی تو ہو جو مجھ کو میرے ہونے کی گواہی دے ____ !

اور اس کے ساتھ ہی "پتوں کے گرنے کا موسم" کی آخری سطریں:

رسمی پرسش
باسی لہجے
موسم کی تلخی کے قصے
جس میں گھٹتی ان سانسوں سے
دردِ رفاقت کیسے بانٹیں
رشتے اور انساں مرجائیں تو بوجھل ہو جاتے ہیں
کوئی ہے جوان کندھوں سے لاشوں کے انبار ہٹائے؟
کوئی ہے۔۔۔؟

اوران نظموں کے ساتھ پیوست کرلیں احمد ندیم قاسمی کی یہ رائے۔

''بہت گہرے وجدان کے بغیر ایسے سوالات تک پہنچنا ممکن نہیں' اس کی شاعری تو وجدان کی ایسی رعنائیوں سے لبریز سوالوں سے بھری پڑی ہے۔اس کا عصری شعور اتنا گہرا ہے کہ کبھی کبھی تو اس کے مصرعوں میں صدیاں دستک دیتی سنائی دیتی ہیں کہ ایک زندگی میں اتنی دور تک سوچ لینا ممکن نظر نہیں آتا۔وہ اپنے عہد کے آشوب کی مورخ بھی ہے اور مصور بھی!''

عہدِ آشوب کی اسی مصوری کے چند زندہ مرقعے پیش ہیں صرف غزلوں سے:

کس قدر دشوار ہے ان اجنبی شہروں میں رہنا
گھر کی چوکھٹ ڈھونڈنے میں ہجرتوں کے درد سہنا
اک بھنور میں گھومتی ہے سانس کی کشتی ازل سے
اپنی فطرت بھی کہاں تھی پانیوں کے ساتھ بہنا
اس نئے دور میں بچوں پہ یہ کیا وقت پڑا
آگ میں جھونک گیا اِن کے غبارے کوئی
سورج سے معیار چنے' پھر ان کی آگ میں جل جائے
کرنوں کو پرولے سانسوں میں تو آ پہنچیں کالی راتیں
میں سلطاں کے درِ دولت پہ اک دستک تو دے لوں
مگر اس ہاتھ کو ذوقِ گدائی کون دے گا

کل عدالت لگائیں گے بچے
محتسب آج کس گمان میں ہے

شہر کا شہر رہ گزر پر ہے
کوئی آسیب ہر مکان میں ہے

عجب افتاد ٹوٹی ہے زمیں پر
سمندر راستوں کو کھا گیا ہے
لب پہ توحید تو دل میں لیے بت خانہ پھروں
سب کے ہمراہ چلوں سب سے جداگانہ پھروں

نظر آیا نہ خزاں سے کوئی اکتایا ہوا
میں تو ہاتھوں میں لیے پھول کا نذرانہ پھروں

ان پھولوں کو محض پھول نہ سمجھئے کہ یہ منصورہ کی شاعری کے پھول ہیں۔ ایسے پھول جن کی نشوونما میں ذات وصفات نے مٹی پانی کا کام کیا مگر جن کی خوشبو شاعرہ کے باطن تک محدود نہیں رہی بلکہ ان پھولوں سے وہ خزاں زدہ انسانوں کے مردہ مسام بیدار کر کے انہیں تخلیق سے معطر کرنا چاہتی ہے مگر خزاں دیس کے زرد پتوں جیسے باسی ان پھولوں سے خوشبو کا اکتساب کرنے کے اہل بھی نہیں رہے کہ ان کی مردہ روحیں حسِ لطیف سے عاری ہو چکی ہیں۔ خزاں دیس کی دائمی خزاں رُت میں منصورہ شاعری کی صورت میں جسدِ گل لئے کھڑی ہے۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر

یہ المیہ ہر دور کے ذی شعور شاعر کا رہا ہے اور یہی المیہ منصورہ کا بھی ہے۔

مگر پھر بھی ہمارے لفظ کہتے ہیں
کہ ہم اک دوسرے کی روشنی ہیں

اور قوت ہیں
ہمارے لفظ کب تکذیب کی سولی سے اتریں گے (''لفظ و معنی'')
اور ساتھ ہی یہ نظم بھی دیکھئے ''نظمیں رستہ بھول گئی ہیں''
نظمیں رستہ بھول گئی ہیں

جیسے چڑیا
بھولے سے کمرے میں آ کر
اور باہر کی راہ نہ پا کر
چونچ کو شیشوں سے ٹکرائے
تخلیق کو پھول کہیں یا چڑیا ___ شاعر کا بنیادی المیہ یہ ہے کہ اس کی شاعری صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔ اگرچہ منصورہ کی نظموں میں بعض اوقات ''لا حاصلی'' کا کرب ملتا ہے لیکن وہ سوشل کمٹمنٹ کی حامل شاعرہ ہونے کے باعث ''حاصل'' اور ''لا حاصل'' کی کشمکش میں زیادہ تر نہیں الجھتی۔ شاعر معاشرہ سے جو سوالات دریافت کرتا ہے اسے ان کے جوابات ملنے کی توقع نہیں ہوتی (ہونی بھی نہیں چاہیے) کہ یہ جوابات حکمرانوں اور سیاستدانوں نے دینے ہوتے ہیں شاعر کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے سوالات سے معاشرہ میں آگہی کی حیات بخش رو کو موجزن رکھے ___ اور یہی کام منصورہ احمد بھی کر رہی ہے۔ اُس نے مجموعے کا نام ''طلوع'' رکھ کر ہی ناامیدی کی گرد جھٹک دی ہے۔

تحریر و تحقیق۔ ڈاکٹر سلیم اختر

ثمینہ راجہ

ثمینہ راجہ نے غزل کو نہ صرف وسیلۂ اظہار بنایا ہے بلکہ اس کی روایتی حیثیت کو بھی بحال رکھا ہے اور اس کی توقیر میں اضافہ بھی کیا ہے۔ لیکن نظم کے ساتھ بھی ثمینہ راجہ کی والہانہ وابستگی اس کے مزاج کے ساتھ گہری مطابقت رکھتی ہے۔ اس کی نظم جذباتی حسیت کے ساتھ ساتھ فکری در بھی وا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نظم ایک مقام پر آ کر غزل سے الگ راستے پر چلنے لگتی ہے۔ جدائی اُس کی نظم کا ایک بڑا استعارہ ہے۔

اب تک کے آٹھ شعری مجموعوں میں اس نے زندگی اور اس کی حیرتوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ گویا اسے مکمل ادراک ہے کہ ہم جن مرغزاروں اور آبشاروں کی سرزمین سے ہجرت کر کے آئے ہیں وہاں کبھی واپس نہیں جانا۔ ہمارا سفر بس اتنا ہے کہ ایک خوابناک تصور کے دو کناروں کے بیچ اپنی ذات کی ناؤ کو مسلسل مسافرت میں رکھنا ہے۔ اس کے نزدیک ہجرت ایک خطے سے دوسرے خطے کی جانب کوچ کا نام نہیں یہ تو جاوداں جمود سے انکار کا ایک نام ہے۔

وہ اپنی کتاب باغِ شب میں لکھتی ہیں کہ:

''شاعر بھی سب آدمیوں جیسا ایک آدمی ہی ہوتا ہے لیکن شاید اس کا خمیر تھوڑا سا مختلف ہوتا ہے شاید اس کے اجزائے ترکیبی میں ایک عنصر کم ہوتا ہے یا ایک عنصر زیادہ، کیونکہ اس کے اندر کبھی کبھی ایک لہر سی اٹھتی ہے۔ ایک ہوا سی چلتی ہے، ایک باغ سا کھلتا ہے۔ راتوں کو جب ساری دنیا گہری نیند میں ہوتی ہے وہ چونک کر جاگ اٹھتا ہے۔ اسے زمین اور آسمان کے درمیان پھیلی خاموشی میں ایک دھمک سنائی دینے لگتی ہے،

جیسے دل کے ساتھ ساتھ پوری کائنات دھڑک رہی ہو اور اس کے اندر عجیب سرسراہٹ ہونے لگتی ہے۔ پھیلنے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ، نس نس میں، پور پور میں، پھر بہت گہری تاریکی میں۔ آسمان کے پوشیدہ منور گوشوں سے۔ شاعری اس کے دل پر اترتی ہے اور اس کے باطن میں ایک باغ کھل اٹھتا ہے۔ خوابوں کا، یادوں کا، زخموں کا، شاعری کا باغ!''

اور ثمینہ راجہ کے باطن میں جب شاعری کا باغ مہکا تو اس نے اس تخلیقی تجربے کو باطن میں دفن کر دینے کے برعکس اپنے قارئین کو بھی اس میں شریک کیا۔ شاعر (یا کوئی بھی تخلیقی فن کار جب اپنے داخلی تجربہ اور وجدان میں قارئین کو شریک کر لیتا ہے تو گویا (بالواسطہ طور پر ہی سہی) وہ اپنی سوشل کمٹمنٹ پوری کر دیتا ہے۔

ہمارے یبوست زدہ معاشرے میں عورت کو بحیثیت فرد، مکمل اکائی میں، مساوی رفیق تسلیم کرنے کے برعکس مختلف رشتوں، حصوں بلکہ شعبوں میں تقسیم کر کے ایک طرح کا ڈیپارٹمنٹل سٹور بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ من بھاتے حصے سے غرض رکھتے ہوئے بقیہ سے لاتعلق یا لاعلم یا لاغرض رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن عورت ماں، بہن، بیٹی، بیوی کے خانوں میں منقسم ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ بیک وقت تمام کردار بطریق احسن ادا کرتے ہوئے زندگی کے سٹیج پر کامیاب اداکاری کرتی رہے۔
لہٰذا اگر ثمینہ راجہ یہ کہے

اور اپنی خوشی سے جل رہی ہوں

تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے کیونکہ اس کے ساتھ اس امر پر بھی زور دیتی ہے۔

اب اپنی اکائی چاہتی ہوں
میں تجھ سے جدائی چاہتی ہوں

''باغِ شب'' میں اس کا لہجہ قدرے مختلف ہے یہاں وہ زندگی کو اور حوالوں سے بھی دیکھتی ہے۔ جہاں صبح ایک نئے اُجالے کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

رُکی ہوئی ہوں وہیں اور نئے سویرے کو
طلوع ہوتے ہوئے باغِ شب سے دیکھتی ہوں

یہاں اس کی سوچ کی کھڑکی ایک خوبصورت باغ کی طرف کھلنا چاہتی ہے یہ شب کا باغ ہے۔ بھیدوں بھرا باغ جہاں ستارے سرگوشیاں کرتے اور پھول باہم کلام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ شب کے روزن سے اسی باغ کے منظر دیکھتی ہے اور کہتی ہے:

جاگیں گے کسی روز تو اس خوابِ طرب سے
ہم پھول ہی چنتے رہے باغیچۂ شب سے
اب موسمِ جاں سے بھی یقیں اٹھنے لگا ہے
دیکھا ہے تجھے رنگ بدلتے ہوئے جب سے
شاید کہ موجِ عشق جنوں خیز ہے ابھی
دل میں لہو کی تال بہت تیز ہے ابھی

یہ آج کی حساس عورت کا سیلف پورٹریٹ!

اُڑنے کا جنوں تھا اور فلک تک
اس شوقِ محال میں بسر کی

طالب کوئی میری نفی کا تھا
اور شرط یہ موت سے کڑی تھی
اک پل کی خوشی کے واسطے عمر
رنج و مہ و سال میں بسر کی

ماضی کے مقابلہ میں آج کی شاعرہ تخلیقی سطح پر اپنی ذات، وجود، شخصیت، جسم، اعصاب اور ان سب کے تقاضوں کا بیشتر اسلوب میں ابلاغ کر رہی ہے۔ معاصر شاعرات کی مانند ثمینہ راجہ بھی اپنے غم، دکھ، کرب، تنہائی، اداسی، یاس پریشانی، محرومی اور ان سب کی پیدا کردہ شعری حسیت میں قارئین کو بھی شریک کر رہی ہے۔ راز دار دوست (یا پھر سہیلی) سمجھتے ہوئے ثمینہ نے جب شاعری کو سیلف پورٹریٹ میں تبدیل کیا تو ذات کے نہاں

خانوں میں مصور رنگوں کے استعمال میں فراخدلی سے کام لیا۔ کہ بقول اس کے:

اترے تھے کبھی مرے بدن پر
کچھ رنگ سپہرِ نیلمیں سے

ملاحظہ کیجئے یہ غزل

اک حسرت آب ہو گئی ہوں
میں خود ہی سراب ہو گئی ہوں
لکھی ہوں اک اجنبی زباں میں
ہونے کو کتاب ہو گئی ہوں
اک خواب میں جی رہی تھی اب تک
سو خواب ہی خواب ہو گئی ہوں

تھا کتنا سجا ہوا یہ چہرہ
اور کیسی خراب ہو گئی ہوں
گوہر تھی کبھی دلِ صدف میں
اب نقش بر آب ہو گئی ہوں
کرتی تھی سوال زندگی سے
اب اپنا جواب ہو گئی ہوں
تُو بیٹھ کنارِ عشق میں تو
سوہنی کا چناب ہو گئی ہوں

اب توڑ لیا چمن سے رشتہ
جنگل کا گلاب ہو گئی ہوں

''اور وصال'' کی یہ غزل لاحاصلی کے جس کرب کی مظہر ہے، عورت اس سے ناآشنا نہیں۔ غیر شاعرہ یا شاعرہ، ثمینہ راجہ یا اور شاعرات۔ جہاں تک ثمینہ راجہ کی تخلیق

صلاحیتوں کا تعلق ہے تو وہ خاصی فعال نظر آتی ہے۔ اب تک ان کے ۹ شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ:

کرتے ہیں ذرا سی خود کلامی
امکان غزل کے دیکھتے ہیں

ثمینہ کے شعری سفر کے یہ سنگِ میل ہیں۔۔۔۔ ''ہویدا'' (غزلیں/ نظمیں ۱۹۹۵ء) ''شہرِ سبا'' (نظمیں/غزلیں ۱۹۹۷ء) ''خوابنائے'' (نثری نظمیں ۱۹۹۸ء) اور وصال' (غزلیں ۱۹۹۸ء) ''باغِ شب'' (غزلیں ۱۹۹۹ء) ''باز دید'' (نظمیں ۲۰۰۰ء) 'ہفت آسمان'' (غزلیں/ نظمیں ۲۰۰۱ء) ''پری خانہ'' (غزلیں ۲۰۰۲ء)۔

ثمینہ راجہ کی شاعری کا زیادہ تر مطالعہ ''اور وصال'' کی غزلوں پر مبنی ہے۔ ایک تو یہ کہ ذاتی طور پر مجھے یہ غزلیں بہت اچھی لگیں لیکن ذاتی پسند سے قطع نظر مطالعہ، ثمینہ کی تنقیدی اساس بھی۔ اس مجموعہ سے اس نوع کے شخصی/ شعری مطالعہ کے ضمن میں نفسیاتی امر پیش نگاہ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ کسی شاعر/ شاعرہ کی شاعری کا تخلیقی مآخذ ایک ہی شخصیت' ذہن اور اعصاب ہوتے ہیں لیکن طرزِ احساس کے باعث یا میڈیم کی تبدیلی اسلوب تبدیل کر دیتی ہے۔ لہٰذا ایک ہی تخلیقی عمل کی پرازم میں سے تخلیق کی شعاع سات رنگوں میں ظہور پا سکتی ہے۔ چنانچہ ہم مرکزیت کے باوجود بھی ہر رنگ سچا' جاذبِ نظر اور منفرد ثابت ہوسکتا ہے اور یہی معاملہ اور وصال کی غزلوں کا ہے۔ اس مجموعے کی اضافی خوبی تمام غزلوں کی یکساں بحر ہے۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ناصر کاظمی کی ''پہلی بارش'' کے بعد غالباً اس اسلوب کا یہ دوسرا مجموعہ کلام ہے لہٰذا اس بنا پر بھی قابلِ توجہ ہے۔

بحر' قافیہ' ردیف کی پابندیاں دروں بیں غزل کے لیے اچھی ہیں یا بری؟ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس امر پر یقیناً داد دوں گا کہ بحر کی یکسانیت قاری کے اعصاب پر واحد تاثر مرتسم کرنے کے باعث بنتی ہے جبکہ شاعر ایک ہی بحر میں غزل خوانی سے جو نفسی فوائد حاصل کرتا ہے اعصابی لحاظ سے قاری بھی ان میں شریک ہوسکتا ہے۔

ثمینہ کی ''اور وصال'' کی چھیاسٹھ غزلوں میں پیوست غزل یا پھر منتشر نظم کا

ذائقہ بھی ملتا ہے۔ بحر کی یکسانیت کثرت میں وحدت کا باعث بنتے ہوئے ''اور وصال'' کو کل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ایسے میں ثمینہ کا یہ دعویٰ محض تعلّی نہیں رہتا۔

لپٹا ہے وجود شاعری میں
اور صاحبِ حال ہو گئی ہوں
بس ایک خیال کی نمو سے
ہو جائیں گے میرے حرف و فن سبز

ثمینہ راجہ نے لکھا ہے:

''شاعری دریافت کا عمل تو ہے مگر بہت شعوری عمل نہیں۔ جب ایک بحر میں یہ غزلیں پہلے پہل شائع ہوئیں تو احباب نے ان کو ایک فنی تجربہ قرار دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۹۵ اور ۹۶ پورے دو سال کے دوران یہ بحر مجھ پر بری طرح طاری رہی۔ سو میں نے یہ تمام غزلیں اور زیادہ تر نظمیں بھی اسی بحر میں لکھیں۔ یہ ایک غیر شعوری اور بے اختیار عمل تھا جبکہ ہیئت کا تجربہ شاید ایک شعوری عمل ہوتا ہے۔

زندگی کا کوئی تجربہ جب شعر میں ڈھلتا ہے تو وہ تجربہ ہوتے ہوئے بھی تجربہ نہیں رہتا۔ یعنی مرئی نہیں رہتا غیر مرئی ہو جاتا ہے۔ جیسے حقیقت میں صحرا عبور کرنا یا دریا پار کرنا یا جنگل سے گزرنا یا محبت کرنا یا مر جانا بھی تجربہ ہے اور خواب میں صحرا عبور کرنا۔ دریا پار کرنا' جنگل سے گزرنا' محبت کرنا اور مر جانا بھی تجربہ ہے۔ پھر بھی دونوں میں واضح فرق ہے سو زندگی اگر حقیقت کا تجربہ ہے تو شاعری خواب کا'' (فلیپ اور وصال) خواب جب تخلیقی عمل کے سانچہ میں ڈھلے تو ایسے اشعار کا پیکر پاتا ہے۔

یوں خواب و خیال میں رہی میں
خود خواب و خیال ہو گئی ہوں
یہ وصل ہے یا میں خواب میں ہوں
ہے خواب کہ وصل کی گھڑی ہے
اک خواب میں جی رہی تھی اب تک
سو خواب ہی خواب ہو گئی ہوں

یہ اشعار ایک ہی خواب کے منتشر اجزا سمجھے جا سکتے ہیں اور کیسا خواب۔
پھر خواب کوئی نیا نیا دے!
اے رات! مرا دیا جلا دے۔
ایسا خواب رُت جگے جس کا مقدر ہوں۔

اک پل کو نہ رات سو سکی میں
اس خواب کی آس میں رہی میں
نیندوں میں جب آگ لگ گئی تھی
افسوس کہ خواب جل رہا تھا

ان اشعار کو ذہن میں رکھ کر ثمینہ راجہ کی بات سنئے:

''خواب کے اسرار نے انسان کو جسم سے ہٹ کر روح کے بارے میں سوچنے پر آمادہ کیا اور شاعری کے اسرار نے اسے کبھی دیوتاؤں کی رضا (ہومر) اور کبھی پیغمبری کا جزو (مولانا روم) بنا دیا۔ میں نہیں جانتی جو میں لکھ رہی ہوں یہ فن ہے یا نہیں۔ تجربہ ہے یا نہیں۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ وہ میں بتا رہی ہوں جو زندگی نے مجھے سکھایا ہے اور وہ بتا رہی ہوں جو شاعری نے میرے کان میں پھونکا ہے'' (اور وصال)

اس اقتباس کے ساتھ یہ شعر ملا لیں تو بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔

الہام وحی کہ شاعری ہے
اس دل پہ جو آج اُتر رہی ہے

میں نہیں جانتا کہ ۹۵۔۱۹۹۶ء میں وہ کن احساسات کے زیر اثر جذباتی تموج سے دوچار رہی۔ (نفسیاتی نقاد کے لیے ایسی معلومات مقالے کے لیے خام مواد فراہم کرتی ہیں) تاہم اظہار کے لیے صرف ایک ہی بحر کا انتخاب یقیناً توجہ طلب ہے۔ شعر کی صورت میں جذبات واحساسات تخلیق کا ترفع تو حاصل لیتے ہیں مگر یک مرکز ہو کر محدب شیشہ کی

صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ بت باطن کی آنچ سے الفاظ لودے اٹھتے ہیں۔ تخلیقی عمل کا شعلہ، ققنس کی مانند جلاتا، بھسم کرتا اور فنا کرتا ہے پھر تخلیق کی صورت میں نیا جنم دیتا ہے۔

ققنس تو نہیں ہوں پھر بھی طے ہے
میں اپنی ہی آگ سے جلوں گی

اور یہی وہ آتش فشاں ہے جو تخلیق کار کو یدِ بیضا عطا کرتی ہے۔ ثمینہ کا خوب صورت شعر دیکھئے

تخلیق کی آگ ہے نفس میں
اس ہاتھ سے شعلہ پھوٹتا ہے

ثمینہ راجہ کی شاعری کا مرکز ذات/وجود ہے چنانچہ ''اور وصال'' کے علاوہ دیگر شعری مجموعوں میں بھی انداز اور اسلوب بدل بدل کر اسی کی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ترجمانی کی گئی ہے۔

افسانہ تو ہے وہی پرانا
لفظوں میں نئے سنا رہی ہوں

اظہارِ ذات یا اثباتِ وجود کے سلسلہ میں قابل توجہ یہ ہے کہ ثمینہ نے صفات کے بجائے احساسات کے حوالہ سے اظہارِ ذات کیا۔ جو اس لحاظ سے آسان نہیں (بالخصوص شاعرہ کے لیے) کہ اس میں دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ مزید خطرہ یہ ہے کہ اپنے ہی جذبات و احساسات کے زیر اثر شاعرات (بلکہ شاعر بھی) خاصی بلکہ بعض اوقات تو ضرورت سے زیادہ ہی ہیجانیت کا شکار ہو کر شاعری کو کیس ہسٹری میں تبدیل کرا دیتے ہیں۔ یوں شاعری جذبات کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ یا خود کو المیہ کی ہیروئن (مرد کی صورت میں ٹریجک ہیرو) کے روپ میں پیش کرنے کی سعی میں مریضانہ خودرحمی، خودترسی اور خودفریبی کی اسیر ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا میر تقی میر نہ ہوتے ہوئے بھی دل پر خوں کی اک گلابی سے عمر بھر شرابی سی رہتی ہیں۔ مگر اس ضمن میں ثمینہ راجہ کا رویہ مثبت ہے۔ وہ جذبات کے مرقد پر غم گساری نہیں کرتی۔ نہ ہی بال کھولے، نین بھرے، آہ و زاری کرتی ہے پکی عورت

نہیں پختہ طبع شاعرہ ہے سو وہ شعر سے کتھارسس کا کام لینے کے باوجود بھی دل پر خوں کی گلابی کے نشہ میں غرق ہونے سے بچ جاتی ہے۔ اس نے بے حسی (Apathy) کو سیفٹی والو میں تبدیل کرلیا ہے۔

کچھ رنج نہ کوئی بے قراری
دل پر ہے عجب سکوت طاری
ویران ہوں زندگی کی مانند
ہنگاموں سے دور جی رہی ہوں

کس موڑ پہ ہوں تھمی ہوئی میں
پتھر کی طرح جمی ہوئی میں

اک حرفِ غلط ہوئی ہوں جس میں
ہستی کی کتاب دیکھتی ہوں

چنگاری دبی ہو کوئی شاید
ویسے تو میں راکھ ہو چکی ہوں

اشعار سے شاعرہ کا جو سیلف پورٹریٹ بنتا ہے اس میں طرح طرح کے رنگوں کے استعمال کے باوجود شبیہہ کے خدوخال تبدیل نہیں ہوتے اداسی، اضمحلال، ناتمامی اور ناکامی پر مبنی تاثرات شعر کے روپ میں یہ اسلوب پیدا کرتے ہیں۔

باہر تو لگا ہے سنگِ مرمر
میں دفن مگر سیاہ میں ہوں

کس بات سے دل دکھا ہوا ہے
آنسو کے بغیر رو رہی ہوں

جیسے تھی میں ریت پر کوئی نقش
یوں موج نے بڑھ کے آ مٹایا

وہ ایک ہوائے تازہ میں تھا
میں خوابِ قدیم میں گڑی تھی

وہ خود کو خدا سمجھ رہا تھا
میں اپنے حضور میں کھڑی تھی

ماتھے پہ مرے لگائے انگلی
کالک میں ڈبو کے اپنے دل کی

اب ترک بھی کر چکا تو کیا غم
میں تیری مراد تو رہی ہوں
اوراس کی وجہ:
میں خود کو بہت ہی چاہتی ہوں،
عادت ہے ذرا عجیب میری

ثمینہ کی غزلوں میں اگرچہ بدن کو مرکزی حیثیت تو حاصل نہیں مگر پھر بھی بدن کو زیادہ خاص موضوع بناتے ہوئے اس سے نفسی تلازمات پیدا کیے ہیں۔ثمینہ اسے ہنگامہ و آشوب کا مرکز تو قرار نہیں دیتی تاہم مدھم لہجہ اور سرگوشی کے اسلوب میں بات کرتی ہے۔

ان اشعار میں آگ کا تلازمہ قابلِ غور ہے۔''اور وصال'' کا مطالعہ کسی حزنیہ وادی کے سفر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔بقول میر تقی میر:

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

سوثمینہ راجہ کے بقول:

کچھ اشک ہیں چند مصرعۂ تر
اور ساری بیاض گل رہی ہے

کیا یہ کہنا زیادہ مناسب نہ ہوگا

اور ساری بیاض جل رہی ہے

شاہین مفتی

''اپنے آپ کو روکنا اور تضادات سے محفوظ رکھنا ایک گہرا روحانی تجربہ ہے' اسی طرح کسی ایک ہی راستہ کا انتخاب اور اس پر چلتے رہنے کی استواری شخصی مسرت بھی ہے اور شخصی عذاب بھی' انسانی لایعنیت اپنے عوامل کے نتائج کو کسی کے سپرد نہیں کرتی۔ بلکہ تاسف کی وہ لامحدود حاصلی پیدا کرتی ہے جو فردِ واحد کے احساس ملکیت کی تشکیل کی ناکامی سے بندھی ہوئی ہے۔ میری زندگی میری محبت' میرا خدا میرا امکان' میری دنیا' میری آزادی' میرا وعدہ' میرا جذبہ' میری کامیابی' میری ناکامی میرے نظریات' میرا واقعہ ـــــ اپنے ہونے کی یہ مسلسل تکرار مشاہدے اور تجربے کے کسی ایک مخصوص اسلوب سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے اور اپنے آپ کو ظاہر کر کے اپنا اثبات چاہنے کے وسیع تصور کا اعادہ ہے۔''

(شاہین مفتی ''جدید اردو نظم میں وجودیت'' ص:۷)

''میں زندگی کے اور زندگی میرے تصرف میں ہے۔ کبھی کبھی جب مفعولیت کا دورانیہ طویل تر ہونے لگتا ہے تو وجود کو سنبھالا دینے کے لیے خواہش جاگتی ہے۔ اس لیے میں اپنے وجود کی تجربہ گاہ میں ایک چھوٹا سا دریچہ کھول دیتی ہوں تاکہ باہر کی فضا سے میرا ناتا ٹوٹنے نہ پائے اور اندر کا حبس تنفس کے رشتے کو توڑنے کا اہل نہ ہو سکے۔ جانتی ہوں کہ چھوٹے کمرے میں بڑا روزن زیب نہیں دیتا کہ اس لیے نہ صرف کمرے کا وژن بگڑتا ہے بلکہ اندر کی ساری شمعیں تیز تر آندھیوں کی زد

میں آنے کا اندیشہ بھی ہے تاہم کسی فاعل لمحہ کی تلاش میں ہوں جو صرف میرا ہو۔ جب میں ابلقِ ایام کی راکب ہوں اور اس گزرگاہِ حیات کا ہر ذرہ میرے سفر کی زد پر ہو۔ عزم ہے لیکن یقین نہیں کہ زندگی اپنے حریفوں کو زیادہ سنبھلنے کا موقع نہیں دیتی۔''

وہ دھند تھی کہ کچھ بھی دکھائی نہ دے سکا
آنکھیں بدل گئیں کہیں چہرہ بدل گیا
کچے گھڑے کو جس کی رفاقت پہ ناز تھا
منجدھار میں پہنچ کے وہ دریا بدل گیا
جتنی حکایتیں تھیں وہ رزق ہوا ہوئیں
اک دن کتابِ زیست کا صفحہ بدل گیا

(ماہنامہ کہاوت' لاہور فروری ۲۰۰۴ء سے شاہین مفتی کی تازہ غزل)

شاعرہ' ڈاکٹر' نقاد' پرنسپل۔ شاہین مفتی یہ سب کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ اس تجسس کی بھی حامل ہے جس نے بیک وقت شاعری اور تنقید کی صورت میں اظہار پایا۔ شاعرات کو تو چھوڑیئے ناقدین میں سے بھی ایسے کم کم ہی ملیں گے جنہیں بیک وقت اساطیر و جودیت اور تحلیل نفسی سے علمی دلچسپی ہو۔ شاہین مفتی نے ایم فل کی ڈگری کے لیے ''فیض کی شاعری میں رنگ کی اہمیت (۱۹۹۳ء) جیسے اچھوتے موضوع پر تحقیقی مقالہ قلم بند کیا تو وہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے جدید اردو نظم میں وجودیت (۲۰۰۱ء) جیسے شکل موضوع کا انتخاب کیا اور ان پر مستزاد متعدد ادبی شخصیات پر تجزیاتی مضامین اور متنوع ادبی مسائل پر فکری بصیرت کے حامل مقالات بھی تحریر کیے۔ شاہین مفتی فعال قلم کار ہے جس کا ثبوت معاصر ادبی مجلّات سے مل سکتا ہے۔ وہ بیک وقت ذہن اور دل کی دنیا میں زیست کر رہی ہے۔ کرۂ ذہن سے نقد و تبصرہ حاصل کرتی ہے تو دل کے سیارہ سے شاعری۔ کمال یہ ہے کہ نقد و شعر کے پلڑے یکساں رہے ہیں۔ کہ شاہین کا قلم میزان بن کر پورا تولتا ہے۔ اسے ترجمہ سے بھی شغف ہے چنانچہ افریقی ناول نگار چینوا اچیبے کے ایک ناول کا ''آپ کا خادم'' کے نام سے ترجمہ کر چکی ہے۔

شاعری کے دو مجموعے ''امانت'' ۱۹۸۱ء اور ''مسافت'' ۱۹۹۸ء صرف نظموں پر مشتمل ہیں گویا اس کے مزاج کو نظم سے نسبتاً زیادہ مناسبت ہے لیکن گذشتہ چند برس سے مختلف ادبی جرائد میں اس کی جو غزلیں طبع ہو رہی ہیں وہ بھی لائقِ اعتنا ہیں ماہنامہ ''بیاض'' لاہور کے چند شماروں میں مطبوعہ غزلیات سے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جھپٹ پڑا ہے جو تجھ پر گروہِ تشنہ لباں
تجھے بھی پیاس کا کچھ تجربہ تو ہونا تھا
حدودِ وقت سے آگے بھی ایک منزل تھی
سفر نصیب کو اک دن جدا تو ہونا تھا
حصار کھینچ کے بیٹھے ہیں تیرے نام کا ہم
کتابِ زیست کا اک حاشیہ تو ہونا تھا

(فروری ۲۰۰۳)

اک گلِ تازہ کی حسرت میں کہاں تک پہنچے
خاک میں لپٹے ہوئے خوں میں نہائے ہوئے لوگ
آسماں ٹوٹ پڑے گا تو کدھر جائیں گے
آسمانوں سے یہ سب آس لگائے ہوئے لوگ

طوافِ دلبری میں سرخ رو ہے
لہو میں ڈوبنا دل کا وضو ہے
رہے گا اور کتنے دن چمن میں
پرندہ خوشنما ہے خوش گلو ہے
بہانہ بن گیا دستِ ہنر کا
ذرا سا دل میں جو کارِ رفو ہے
یہ جانتے ہیں کوئی منانے نہ آئے گا
پھر کس لیے کسی سے خفا ہو گئے ہیں ہم
اپنا ہی نام لگنے لگا ہے نیا نیا

کس کی زباں سے آج ادا ہو گئے ہیں ہم
ایک الجھن ہے کہ پل بھر نہیں رکنے دیتی
جانے کیا کون سے رستے میں گنوا بیٹھے ہیں
اب تو لگتا ہے مرے گھر پہ نظر ہے ان کی
اپنے حصے کی جو سب شمعیں بجھا بیٹھے ہیں
(نومبر۲۰۰۳ء)

دو چار دن میں دیکھئے کیا کیا بدل گیا
لوٹے تو اپنے شہر کا نقشہ بدل گیا
وہ دھند تھی کہ کچھ بھی دکھائی نہ دے سکا
آنکھیں بدل گئیں کہیں چہرہ بدل گیا
ہنس کر ہمیں سنا تھا پھر زیرِ لب کہا تھا
اک حرفِ کم نوا کو دوہرا کے کیا کریں گے
یہ کہہ کے روند دیں گے یہ زائرات بستی
اک نقشِ پا کو رہ سے اٹھوا کر کریں گے

''تسطیر'' (راولپنڈی اکتوبر ۲۰۰۱ء مارچ ۲۰۰۳ء) میں مطبوعہ چار غزلوں سے ان اشعار کو بھی دیکھئے۔

اس نے پر نوچ کر کہا ہم سے
تم کو اتنی اُڑان کافی ہے
تیری چوکھٹ سے اٹھنے والوں کو
بندگی کا نشان کافی ہے
اب کے بیگانگی کے موسم میں
دل سا اک راز دان کافی ہے
اب سبھی منظروں میں شامل ہے
آئنہ آئنوں میں شامل ہے

اک نہ اک دن سراغ پالیں گے
راستہ راستوں میں شامل ہے
موجِ خوں کاٹ کے گزری ہے کہیں تیغِ ستم
میرا یہ خواب تو سچا نہیں ہونے والا
جس کو سائے کی رفاقت بھی میسر نہ ہوئی
کوئی مجھ جیسا بھی تنہا نہیں ہونے ولا
ہم نے پانی میں ملا دی ہے لہو کی خوشبو
اب یہ دریا کبھی صحرا نہیں ہونے والا

جراید میں مطبوعہ غزلیں پیش کرنے کا مقصد اس امر کا احساس کرنا تھا کہ شاہین مفتی جس سہولت سے نظمیں کہہ لیتی ہے اسی آسانی سے غزل گو بھی ہو سکتی ہے۔اور ہر دو اصناف میں معیار کی برقراری اضافی صفت ہے۔ میں غزل شماری تو نہ کر سکا لیکن نظمیں معقول مقدار میں ہیں۔ امانت میں 76 اور مسافت میں 96 یعنی ان دو شعری مجموعوں کی حد تک صرف 172 نظمیں۔ربع صدی کی تخلیقی زندگی کے لحاظ سے یہ تعداد بہت زیادہ ہے لیکن شاہین زود گو نہیں بلکہ اس کا قاری ہونے کے ناتے میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ جتنی جلدی وہ تنقید لکھ لیتی ہے اس رفتار سے شاعری نہیں کی اور یہی رویہ بہتر بھی ہے۔شاہین مفتی نے ''مسافت'' میں میری نظمیں کا عنوان دے کر جو پیش لفظ قلم بند کیا اس کا آغاز یوں کیا۔

''شاعری ایسی بہت سی باتوں کا انکشاف ہے جو قابل دریافت رسائی سے ذرا آگے ہیں' جو صحیفوں میں درج نہیں لیکن ان کے غیر متعین اشارے کسی نئے عالمِ امکان کا پتہ دیتے ہیں زندگی اور شاعری میں معنویت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب فرد اپنے افکار اور افعال کی ذمہ داری کلی طور پر قبول کرتا ہے۔فکری انتشار کے استعارے کو مضبوط کرنا سماجی رویوں کی جڑیں تلاش کرنا اور الفاظ کا از خود اپنے جذباتی تلازموں کے کھوج میں نکلنا ایک طویل باطنی سفر ہے۔۔۔ علامت کی سطح پر سفر

کرتے ہوئے کسی نہ کسی داخلی بات کی ضرورت پیش آتی ہے جو ہماری
سمت کا تعین کر سکے، یہی داخلی بادبان شاعر کے ذاتی رویے اور اسلوب کا
تعارف ہے''

شاہین مفتی نے ''افکار اور اعمال کی ذمہ داری'' کلی طور پر قبول کرنے کی جو بات کی تو یہ رویہ وجودی دانشوروں سے مخصوص ہے۔ شاہین اردو نظم میں وجودی اثرات کا مطالعہ کر چکی ہے۔ اس لیے ابھی یہ بات کر سکتی تھی اسی اقتباس کی روشنی میں تو خود شاہین مفتی کو ایک ''ذمہ دار'' یعنی وجودی شاعرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ دیکھئے نظم ''رابطوں کی دنیا میں'' وہ لفظ کا سماجی کردار کس خوبی سے اجاگر کر رہی ہے۔

''رابطوں کی دنیا میں

لفظ ہی وہ رستہ ہے
حرف اور معنی کی
ریشمیں طنابوں پر
ہاتھ جب پھسلتے ہیں
ساتھ چھوٹ جاتا ہے
دور جا نکلتے ہیں (مسافت)

شاہین مفتی کی زیادہ تر نظمیں مختصر بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ مختصر ترین ہوتی ہیں چار پانچ مصرعوں میں بات سمیٹ لینے کا ہنر جانتی ہے۔ اختصار الفاظ کے ہر عمل استعمال سے مشروط ہے۔ جب دس پندرہ الفاظ میں بات کی تکمیل مقصود ہو تو پھر ایک ایک لفظ پر معنی ہونا چاہیے ورنہ بات نہ ہی بنے گی اور قاری کو خام کاری پر مبنی تشنگی کا احساس ہوگا۔ شاہین اپنے قاری کو تشنہ نہیں رہنے دیتی یہ الگ بات ہے کہ وہ اور شرابور بھی نہیں کرتی امانت کی چند ایسی ہی نظمیں بطور مثال پیش ہیں۔

''بازگشت''
وہ جا بھی چکا

لیکن

اب تک

اس دل کی سونی گلیوں میں

اک چاپ سنائی دیتی ہے

''سفر میری قسمت میں ہے''

زندگی کے سفر میں

کسی موڑ پر

تھک کے میں رک بھی جاؤں اگر

میرے پیروں کا تل

اجنبی گردشوں کو بلا لائے گا

''عذاب رُت''

بارشوں کے موسم میں

ایک بے نمو خواہش

کھڑکیوں سے لگ کر

جانے کیسے لمحے کا

انتظار کرتی ہے

جو کبھی نہیں آتا

''مفاہمت''

ہم کہ عریاں بہت ہیں

تماشا نہ بن

اپنی ضد چھوڑ دے

میں تجھے اوڑھ لوں

تو مجھے اوڑھ لے

اگر ''امانت'' کی نظموں میں سمٹنے کا رجحان قوی نظر آتا ہے تو ''مسافت'' میں

پھیلنے کا۔ ''امانت'' میں جیسے وہ اپنی سائیکی کو ایکسپوز کر رہی تھی۔ لہٰذا کسی قدر جھجک محسوس کرتی ہے مگر ''مسافت'' میں وہ زیادہ پُر اعتماد معلوم ہوتی ہے۔ تذبذب کے اظہار میں بھی اور پیرایہ اظہار کے لحاظ سے بھی۔ ملاحظہ کیجئے نظم ''میں پھر اک نظم کہنا چاہتی ہوں''

تمہاری یاد کے دریا میں رہنا چاہتی ہوں
کسی گزرے ہوئے موسم میں رہنا چاہتی ہوں
اسی دکھ کو نئی شدت سے سہنا چاہتی ہوں
میں پھر اک نظم کہنا چاہتی ہوں

دردو غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا۔ جیسے احساس کی حامل یہ نظم ''مسافت'' کی واحد نظم نہیں بلکہ اس انداز کی متعدد نظمیں مل جاتی ہیں۔ اس ضمن میں ''سال کی آخری نظم'' ''روشنی کی ایک نظم''، ''ایک بے عنوان سی نظم''، ''اجالے کی ایک نظم'' اور سلامتی کی ایک نظم دامنِ دل کھینچتی ہیں۔ ان نظموں میں شاہین نے لفظ اور اس سے وابستہ اظہار کی نفسی تسکین اور پھر اس سے وابستہ احساسات کے تلازموں کو سمجھنے اور سمجھانے کی بات کی ہے۔ کشیدِ خواب میں اب کچھ بھی نہیں ''میں اور کہتی ہے۔

نہ کسی حرف کی بیدادگری
نہ کسی ہاتھ کے سائے کا جنون
نہ کسی چشمِ فسوں ساز کا احسان کوئی
نہ کسی ساعت خوش رنگ کی آہٹ کا یقین
کیسۂ خواب میں اب کچھ بھی نہیں
دل درماندہ سے لپٹی ہوئی تنہائی لیے
ایک صحرائے انا ہے جس میں
چلتے رہنے کی سزا پائی ہے

اور اس کے بعد ''خواب اور خواہش کے درمیان'' کی آخری سطریں:

ایک راستہ ہے

جہاں پر رات اتری ہے پرانے رُت جگوں کی اوڑھنی لے کر

فلک کے ہاتھ میں بھی ایک کشکولِ بصارت ہے

مسلسل جاگتی رُت میں

تمہارا منتظر روزِ قیامت ہے

پلٹ آؤ ـــــ سوا نیزے پہ سورج ہے

ان دونوں اقتباسات کو پیوست کر کے ان کا بطور ایک نظم مطالعہ کریں تو شاہین کی سوچ کی complexity کا کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"کنارے تو نہیں ہیں ہم

مگر اک بحرِ خاموشی

ہمارے بیچ بہتا ہے

کبھی جب اجنبی جھونکے

وجودِ بحر کو چھو کر گزرتے ہیں

تو لگتا ہے

کسی نے گفتگو کی ہے

مگر ہم جان لیتے ہیں

ہواؤں میں تکلم کے کوئی معنی نہیں ہوتے

یہ بس گرداب بنتی ہیں

اور اس میں ڈوب جاتی ہیں"

(کنارے تو نہیں ہیں ہم" مسافت)

شاہین نے ستّی کو وجود کا استعارہ بنایا تو یہ نظم لکھی

ریت پہ پاؤں رکھتی ہوں

تو دل جلتا ہے
صحرا بن کر کہتا ہے
جتنی دور بھر جائے گی
میں اور سورج
دونوں تیرے ساتھ رہیں گے

غالباً یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ ہر شاعرہ کی شاعری اس کی ذہنی آپ بیتی بھی ہوتی ہے۔ کبھی اتنا ہوتا ہے کہ بعض شاعرات کے ہاں شاعری بالعموم آپ بیتی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کل کلام نہ سہی مگر اس کا متعدد بہ حصہ۔۔۔۔ اور دیکھا جائے تو یہی ان کی شاعری کا دلچسپ حصہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں شاعری آئینہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسا آئینہ جسے شاعرہ الفاظ کیفیات علامات اور امیجز سے صرف اپنے لیے تخلیق کرتی ہے۔ پھر اس آئینہ کے سامنے بنتی سنورتی ہے۔ اٹھلاتی ہے سورنگ رچاتی ہے اور کبھی کبھی تو اس آئینہ کو من کا درپن جان کر اس سے نفسی تعلیق کر کے اپنا کتھارسس بھی کر لیتی ہے اور شاہین مفتی کے ہاں بھی آئینہ سازی کے اس عمل کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے تو اس کی نظمیں غزلیں شیشہ گری میں تبدیل ہو جاتی ہیں اس امر کے باوجود کہ فیض کے بقول شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں! ملاحظہ کیجئے شاہین مفتی کی ''اپنے لیے ایک نظم'' اور اسی پر یہ مضمون ختم کیا جا سکتا ہے۔

وہ دکھ جو دل کے اندر ہے
کہیں ہوتے ہوتے ہونٹوں تک
اس کی نہ رسائی ہو جائے
اور ہنسی پرائی ہو جائے
وہ اندھا لمحہ آنے تک
اُس لمحے میں بس لینے دے
مجھے تھوڑا سا ہنس لینے دے

''امانت'' سے ''مسافت'' اور پھر ''پانی پہ قدم'' تک آتے آتے شاہین مفتی نے ایک ریگ زار عبور کیا ہے۔زندگی کے ان ناہموار راستوں کو دیکھا ہے جو خوابوں اور سرابوں سے باہر حقیقت کی منظر نگاری کرتے ہیں۔اس راستے میں اس کے ''پانی پہ قدم'' بھی پڑے ہیں۔اس تجربے کا اظہار انہوں نے غزل کی صورت میں کیا ہے۔اس طرح نظم سے شاعری کا آغاز کرنے والی یہ شاعرہ اب غزل میں بھی اپنا آپ منوانا چاہتی ہے۔

تحریر و تحقیق۔ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر جاوید اقبال

دانشور

ریٹائرڈ جج سپریم کورٹ آف پاکستان

۶۱۔ مین گلبرگ۔ لاہور

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟۔

جواب: (۱) حدود قوانین کا خاتمہ۔ (۲) تعلیم کی ضرورت (۳) غیرت کے نام پر قتل کا مسئلہ (۴) جاہل معاشرہ میں ایسی رسوم کا خاتمہ جن کے ذریعہ عورت کی سودا بازی ہوتی ہے۔ (۵) مرضی کی شادی کی اجازت (۶) حقوق کی برابری کی ضرورت۔

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: میں نے بحیثیت جج اپنے فیصلوں میں بھی جس حد تک ممکن ہو سکتا ہے قانون کی حدود میں رہتے ہوئے ان کے حقوق کا تحفظ کیا ہے۔ علاوہ اس کے اپنی تحریروں میں بھی اس بات کا خیال رکھا ہے۔

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے مجموعی طور پر ہمارے معاشرے پر کوئی اثرات مرتب کیے ہیں؟

جواب: نہیں۔ بالکل نہیں۔

سوال ۴: آپ کے خیال میں خواتین کی زندگی کا کون سا ایسا شعبہ ہے جس میں ان کی شاعری کے حوالے سے شعور بیدار ہوا اور آگاہی پیدا ہوئی یعنی سماجی، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی کس اعتبار سے؟

جواب: اس شاعری سے شعور کی بیداری یا آ گا ہی تو شاید صرف ثقافتی اعتبار سے پیدا ہوگی۔ اس کا سماجی اقتصادی' سیاسی اعتبار سے کوئی اثر نہیں ہوا۔

سوال۵: کیا ہمارے تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی کم نہیں؟ آپ کی کیا رائے ہے

جواب: تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی ہے ہی نہیں۔ اس لیے ہونی چاہیے۔

سوال۶: ہماری نوجوان نسل خاص طور پر طالبات پر یہ شاعری کیا اثرات مرتب کر سکتی ہے؟

جوب: اس کے متعلق کچھ کہہ سکنا ممکن نہیں۔ فی الحال میری نظر میں خواتین کی شاعری کا طالبات پر کوئی خصوصی اثر مرتب نہیں ہوا۔

سوال۷: ہمارے معاشرے میں خواتین کا کون سا طبقہ شاعری سے زیادہ اثر لیتا ہے' یا پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے؟

جواب: انگریزی میڈیم اسکولوں میں خواتین کا طبقہ شاعری سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ اردو میں دلچسپی کم ہو رہی ہے۔

سوال۸: آپ کی رائے وہ کونسی شاعرات ہیں جنہوں نے خواتین کے مسائل کی صحیح طور پر عکاسی کی ہے؟

جواب: شاعرات عموماً غزل کی طرف زیادہ توجہ دیتی ہیں۔ یہ صنف جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ روایتی غزل کے ذریعہ خواتین کے مسائل کی عکاسی ممکن نہیں۔ اس کے لیے نظم یا مثنوی کی راہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال۹: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب: میرے خیال میں ابھی تک خواتین کی شاعری نے اس ضمن میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کیا۔

سوال۱۰: آپ کے خیال میں شاعرات کی نثری نظم زیادہ مؤثر ہے یا پابند؟ غزل پر بھی اپنی رائے دیجیے۔

جواب: میری رائے میں نثری نظم یا غزل پابند ہو یا غیر پابند عورت کے حقوق کے بارے میں شعور پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کے لیے پابند نظم یا مثنوی کا رستہ اختیار کرنا چاہیے۔

سوال ۱۱: شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ موثر ثابت ہو رہا ہے لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا پر؟ (ریڈیو ٹی۔ وی وغیرہ)

جواب: صرف لکھے ہوئے لفظ کی صورت میں۔

سوال ۱۲: کیا مشاعرے اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب: نہیں۔ مشاعروں نے آج تک کبھی ایسے مسائل نہیں سلجھائے۔ یہ تو صرف ایک ادبی محفل بپا کر کے کسی نہ کسی قسم کے تعیش کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

سوال ۱۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو کس حد تک؟

جواب: میری رائے میں بالکل نہیں کیا۔

سوال ۱۴: women's lib کی اصطلاح سے آپ کے ذہن میں کیا تصور ابھرتا ہے؟ کیا خواتین نے اپنی شاعری میں اس تحریک کے مقاصد کو اچھی طرح سے پیش کیا ہے؟

جواب: بالکل نہیں۔ مری نگاہ میں آزادیٔ نسواں سے مراد یہی ہے کہ عورت مرد کے ساتھ حقوق میں برابری حاصل کرنے کی خاطر تگ و دو کرے۔

سوال ۱۵: کونسی شاعرات کے ہاں اس women's lib سے متعلق موضوعات کو سلیقے اور توازن سے پیش کیا گیا ہے؟

جواب: میری اس سلسلہ میں واقفیت بہت کم ہے۔ ہوسکتا ہے کشور ناہید، پروین شاکر اور شبنم شکیل کی شاعری نے اس ضمن میں کردار ادا کیا ہو۔ لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال ۱۶: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خواتین کی شاعری ہمارے قانون دانوں کے ذہن پر مثبت طور پر اثر انداز ہوسکتی ہے؟

جواب: بالکل نہیں۔ شاعری کا تعلق قانون سے نہیں ہے بلکہ قانون کے بالکل برعکس چیز ہے۔

سراج الحق

سینئر صوبائی وزیر۔ حکومتِ سرحد

انٹرویور۔ صبا جاوید

سوال ۱: آپ کے نزدیک شاعری کیا ہے؟

جواب: شاعری الفاظ کی تنظیم کا نام ہے کائنات کے قیام میں بھی یہی تنظیم کارفرما ہے اور قیامت نام ہے اس تنظیم اور حسن کے خاتمے کا۔

سوال ۲: آپ شاعری کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیسے کریں گے؟

جواب: وہ شاعری جو معاشرے کے مختلف مسائل کے ساتھ ساتھ جذبات کی ترجمانی بھی کرے پسندیدہ ہوتی ہے میرے خیال میں شاعر وہ خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں کہ اللہ نے انہیں ایسا ذہن عطا کیا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آس پاس جو کچھ دیکھتے ہیں اس کے اظہار کا راستہ بھی رکھتے ہیں۔

سوال ۳: معاشرے کے تغیرات میں شاعر کے رول کے بارے میں بتلایئے؟

جواب: میرے خیال میں معاشرے میں جتنے تغیرات آتے ہیں ان میں شاعر کا بڑا رول ہوتا ہے اور اگر شاعر کو الفاظ کے ساتھ آواز بھی مل جائے تو انسان تو کیا چرند پرند پر بھی اس کا اثر ہوتا ہے۔ شاعری رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود سے بالاتر چیز ہے۔ تکلیف کے لمحات میں انسانی دل و دماغ کو سرور و سکون بخشتی ہے۔

سوال ۴: شاعری کا ہماری معیشت پر کوئی اثر آپ دیکھتے ہیں؟

جواب: جی اقبال کے کلام نے ہمیں غلامی کی زنجیروں سے نکالا اور آزاد قوموں کی صف

میں لا کھڑا کیا۔ اور ہمیں معاشی کمزوری سے نکال کر کامیاب معیشت کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اگر اقبال کو صحیح مقام ملے تو معاشرے کو حرص و ہوس کے جو کینسر لگے ہیں دور ہو جائیں۔

سوال ۵: شاعری کا ہمارے میڈیا پر اثر؟

جواب: اگر میڈیا میں ایسی شاعری جو ہلکی پھلکی اور اصلاحی رنگ رکھتی ہو پیش کی جائے تو قوم کا مزاج بدلا جا سکتا ہے۔

شاعری کے ذریعے جدوجہد کا پیغام بھی دیا جا سکتا ہے لیکن اگر شاعری کا تعلق جدوجہد کی تحریک سے ہٹا دیا جائے تو عشق و محبت کا جو پیغام دیا جاتا ہے وہ انسان کو شکم پروری حسد غرض حرص لالچ کی جانب موڑ دیتا ہے پھر ایسا ہوتا ہے کہ:

''نازک مزاجِ شاہاں تابِ سخن ندارد''

سوال ۶ نئی نسل کو شاعری نے کوئی اعتماد بخشا؟

جواب: دیکھیے جیسے میں جب آٹھویں جماعت میں داخل ہوا تو ہمارے اساتذہ نے ہمیں اسلامی انقلاب اور استحصال سے جنگ جیسے بلند و بالا نصب العین کی طرف مائل کیا اساتذہ بھی ایسے ملے جو شاہین بننے کا درس دیتے تو اُڑان کا جذبہ پیدا ہوا میں وزارت کے باوجود کرائے کے مکان میں رہتا ہوں ایسے ہی میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل بھی اپنے نصاب میں یا نصاب سے ہٹ کر جو شاعری پڑھ رہی ہے اگر وہ بلند و بالا نصب العین سے متعلق ہے تو ان میں ضرور عزم حوصلہ پیدا ہوگا اور میں خیال کرتا ہوں کہ ایسا ہے بھی۔

پروین قادر آغا

سابقہ سیکرٹری وزارتِ ترقی خواتین۔اسلام آباد

انٹرویور۔شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

Answer. No. 1: Women issues that interest me can be divided into two main areas.i.e. of the urban women and of the rural women. The urban women are almost always educated, working and fully exposed to modern means of comunication, and to all forms of media. In the context of our culture and our ideology of a Muslim nation, her ambition and need is now financial and of equality with men in all fields. The issue of the urban women is how to keep a balance. My interest is therefore in this issue as to how she can be updated with the modern trends of the world and yet keep her identity of an eastern, Muslim woman instead of aping a western one. For the rural woman, her issue islack or even complete absence of education. Because of that she does not have any self-confidence and all this reflects on her role as a mother. She is unable to bring up her children in good health and in such a manner that they become useful citizens of society as well as able contributors to their family's income.

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution

ہے؟

Answer. 2: I have served the Government of Pakistan for 38 years, and my effort has been NOT to raise feminine issues in the day-to-day functioning of the office for the reason that if I make my being a woman an issue, it would damage the opportunity of other women to enter in service. As such in this way I have contributed to the area of facilitating the entry of women in government service. Of these 38 years of service, I have served as Federal Secretary, Ministry of Women Development for two and a half years, in which we were able to develop a National Policy for women's empowerment. It was also possible to follow up work on the National Plan of Action, integrate women's issues into Government policy, conduct gender sensitization of officers and of men, develop a code of conduct for the private sector, ensure employment of women in all spheres of activity and so on and so forth.

سوال۳: کیا خواتین کی شاعری نے مجموعی طور پر ہمارے میڈیا (اخبارات۔ ٹی۔ وی۔ ریڈیو۔ فلم) پر کوئی اثرات مرتب کیے ہیں؟

Answer. No. 3: The poetry of women poets has not had any visible effect on the media. In fact there are very few programmes devoted to literature in any form. Only those verses that can be sung or rendered into musical melodies are popular. The sad part is however that the melody is more known by the singer rather than the poet who wrote the verse. For example, even Faiz's poem "Mujh sey pehli si mohabbat mery mahboob na maang" is more known as Nur Jehan's song! This is the fault of the media, as they never bother to announce the name of the poet at any time, whether it is radio or T.V. Again for example, the FM announcers call every melody a "track" and that is all.

As for which media such poetry is popular, it is both the printed word and the electronic media. It has not affected our films much. The printed books have impressed the younger generation the most. They read as well as listen to poetry on the electronic media.

سوال۴: آپ کے خیال میں خواتین کی زندگی کا کون سا ایسا شعبہ ہے جس میں اس شاعری کے حوالے سے شعور بیدار ہوا اور آ گاہی پیدا ہوئی یعنی سماجی، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی کس اعتبار سے؟

Answer. No. 4: The response is in the affirmative. The very fact that there are women poets and that they are now part and parcel of the literary and "mushaira" scene of our culture is indicative of the fact that it was because of their poetry and its good quality that their acceptance has been possible in the general stream of our lives. Half a century ago it was not common for women to be educated and doing creative work like writing poetry and reading it aloud in public was not possible. Over the years our women poets have shown their metal and the social issues they have touched upon have had a positive effect on our society and culture.

افتخار عارف

شاعر۔ دانشور

چیئر مین اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: پاکستان کے مسلم معاشرے میں خواتین کی ایک بڑی اکثریت بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہے۔ زندگی کے مختلف مراحل میں اپنے بارے میں فیصلے کا کوئی حق اُس کو کم ہی حاصل ہوتا ہے۔ کبھی والدین اس کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں، پھر شوہر اور اس کے گھر والے اس کے فیصلوں کا حق چھین لیتے ہیں اور کبھی معاشرتی اور معاشی جبر کے تحت وہ اولاد کے فیصلوں کی پابندی چاہتی ہے۔ روایت اور مذہب کے نام پر برآمد شدہ رسم و رواج کا جبر ان سب پر مسلط ہے۔ دین کے نام پر کبھی عزت کے نام پر، کبھی غیرت کے نام پر ان کو ظلم و زیادتی کا شکار بنایا جاتا ہے اور کبھی دو وقت کی روٹی اور تن پر لگے چیتھڑوں کے لیے اسے ستایا جاتا ہے تو کبھی ممتا کی ذمہ داریوں کا فریب دے کر اُسے بلیک میل کیا جاتا ہے۔ ولادت کے وقت ایام جاہلیت کے عرب معاشرے کی جو تصویر کشی قرآن پاک نے کر رکھی تھی، کم و بیش وہی صورتِ حال آج بھی عورت کی زندگی پر حاوی ہے۔ بیٹے کی ولادت کو رحمت سمجھا جاتا ہے مگر بچی پیدا ہو جائے تو ہر طرف مُردنی چھا جاتی ہے۔ خود مجبور ماں اپنے اندر اس صورتِ حال سے مقابلے کی

قوت نہیں پاتی۔ اُسے تعلیم میں پیچھے رکھا جاتا ہے۔ شادی، جہیز، نوکری، ان سب معاملات میں اس کو فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب مسائل کے حل کے لیے مسائل کی موجودگی کا اعتراف اور اس کی نشاندہی کرنا اور مختلف خواتین سے متعلق مسائل کا احاطہ کرنے والے ادب کو نمایاں کرنا میں نے اپنی ذمہ داری سمجھا۔ پاکستان ٹیلی ویژن میں بحیثیت اسکرپٹ ایڈیٹر میں نے کوشش کی کہ عورتوں کی پاکستانی معاشرے میں صورتِ حال کے مسئلے پر زیادہ سے زیادہ ڈرامے پیش کیے جاسکیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے کراچی سنٹر کے بہت سے ڈرامے اور سیریل اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ جن بھی اداروں میں رہوں، ان کے پلیٹ فارم سے زیادہ سے زیادہ خواتین اور ان کے مسائل کا شعور رکھنے والی خواتین کو نمایاں کیا جائے اور مختلف مرحلوں میں ان کو با اختیار بنایا جائے۔ اکادمی ادبیات پاکستان میں آنے کے بعد میں نے کوشش کی کہ یہاں کی اشاعتوں میں بھی خواتین کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ ان کی یہ نمائندگی میرٹ کی بنیاد پر بھی ہے۔ اور یہ ان کا بنیادی حق بھی ہے۔ چنانچہ اکادمی کے مختلف رسائل و جرائد میں نمائندہ خواتین اہل قلم کو مرد اہلِ قلم کے ساتھ ساتھ جگہ دی گئی بلکہ خواتین کے حوالے سے انگریزی اور اردو دونوں مطبوعات میں نمائندگی دی گئی۔ پاکستانی خواتین کے ادب کو اندرون ملک اور بیرون ملک متعارف کرانے کی غرض سے اکادمی کے ششماہی انگریزی مجلّے "Pakistani Literature" کا خواتین کی تحریروں پر مشتمل خصوصی شمارہ شائع کیا گیا جسے یاسمین حمید اور آصف فرخی نے مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ اکادمی کے سہ ماہی رسالے ''ادبیات'' کا خصوصی شمارہ ''خواتین کا عالمی ادب'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ یہ شمارہ ۹۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان دونوں مطبوعات میں پاکستان میں پاکستان کی تمام زبانوں کی اہلِ قلم خواتین کو نمائندگی دی گئی ہے۔ ابھی ایک اور بڑا کام ڈاکٹر سلطانہ بخش نے کیا۔ انہوں

نے ''پاکستانی اہلِ قلم خواتین'' کے عنوان سے ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں پاکستان کی تمام زبانوں کی ممتاز خواتین اہل قلم کی تحریروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ میں ٹی وی اور ریڈیو پر بھی اور خواتین کے حقوق کی دیگر تنظیموں کے پلیٹ فارم سے بھی واضح اور بین طور پر خواتین کے حقوق کی بات کرتا رہتا ہوں۔

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے مجموعی طور پر ہمارے معاشرے پر کوئی اثرات مرتب کیے ہیں؟

جواب احساس وشعور اور رائے عامہ پر خواتین کی شاعری کے اثرات کو ناپنے کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں مگر ایک سبب یہ ہے کہ شہروں میں بھی اور رفتہ رفتہ ایک محدود پیمانے پر دیہات میں بھی خواتین اپنے مسائل اور حقوق کے بارے میں زیادہ بیدار معلوم ہوتی ہیں۔ شعور وادراک کی اس سطح تک پہنچنے میں اہل قلم خواتین اور خاص طور پر شاعرات کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خواتین میں خواندگی اور تعلیم کی شرح کی صورتِ حال کے دگرگوں ہونے کے باوجود کتابوں، ٹی وی، ریڈیو، اخبارات و جرائد اور تقریبات کے ذریعے شاعرات کی تحریریں خواتین میں ایک محدود پیمانے پر ہی سہی مگر پہنچتی ضرور ہیں۔ ادا جعفری، زہرا نگاہ، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، شبنم شکیل، شاہدہ حسن، یاسمین حمید، منصورہ احمد شاہین مفتی، نسرین انجم بھٹی، عذرا عباس، حمیرا رحمان، سحر امداد، عطیہ داؤد، حسینہ گل، سائرہ خان، ماہ طلعت زاہدی اور بہت سی خواتین کی تحریریں کسی نہ کسی سطح پر عوام تک ضرور پہنچ رہی ہیں۔

سوال ۴: آپ کے خیال میں خواتین کی زندگی کا کون سا ایسا شعبہ ہے جس میں اس شاعری کے حوالے سے شعور بیدار ہوا اور آگاہی پیدا ہوئی یعنی سماجی، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی کس اعتبار سے؟

جواب لکھی ہوئی تحریر کس طرح شعور و آگہی کی منزل میں مؤثر ہوتی ہے۔ اس کو

میکانکی طور پر درجہ بندی یا مادی تقسیم کی بنیاد پر نہیں جانچا جا سکتا۔ ایک ہی نظم مختلف پڑھنے والوں پر مختلف اثرات مرتب کرتی ہے۔ احساس اور شعور کی کون سی سطح کون سا رُخ اختیار کرے گی۔ اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب اپنی صورتِ حال کا شعور پیدا ہوتا ہے تو اس کے اسباب کی طرف بھی نظر جاتی ہے' اس کے عوامل وعناصر کی موجودگی کے ذمہ داروں کی طرف بھی خیال جاتا ہے اور پھر اس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے مستقبل کی طرف جاتے ہوئے راستوں کو تلاش کرنا بھی اس کا ایک حصہ ہے۔

سوال ۵: کیا ہمارے تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی کم نہیں؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب تعلیمی مدارج کے سلسلے میں نصابیات کی ترتیب کرتے وقت بہت سے امور پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ شاعری اور اچھی شاعری کا حصہ دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ مگر جتنا کچھ بھی رہ گیا ہے اس میں بھی خواتین اہلِ قلم کی تحریریں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

سوال ۶: ہمارے معاشرے میں کون سا طبقہ شاعری میں دلچسپی لیتا ہے؟

جواب پاکستانی زبانوں میں اور بالخصوص اُردو میں لکھی جانے والی شاعری عام طور پر متوسط طبقے اور درمیانی طبقے کی خواتین پڑھتی ہیں۔ غریب خواتین کی اکثریت ناخواندہ ہوتی ہے اور وہ شاعری سے مستفید نہیں ہو سکتی۔ متوسط طبقے سے اُوپر کی خواتین اور طبقۂ اشرافیہ پاکستانی زبانوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ فیشن کے طور پر اپنے تہذیبی سرچشموں میں دلچسپی ضرور لیتا ہے مگر ان کو اپنی زندگی کے لیے میزان سمجھ لے' میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوتا۔

سوال ۷: کیا خواتین نے اپنی شاعری میں women lip کی تحریک کے مقاصد کو اچھی طرح پیش کیا ہے؟

جواب ہمارے یہاں feminine, feminist اور female تینوں طرح کی لکھنے والی خواتین بیک وقت موجود ہیں۔ وہ خواتین بھی جو مسلم اور سوشل ناول وغیرہ لکھتی ہیں یا سطحی جذباتی قسم کی رومانوی شاعری کرتی ہیں' وہ بھی موجود ہیں جو مغرب

کی feminist تحریکوں کی ہم سفر میں زیادہ فعال اور عملی طور پر خواتین کے حقوق کی جدو جہد کر رہی ہیں اور اس کو شاعری کے ساتھ ساتھ سیاسی اور قومی زندگی کے رُخ میں یا بنیادی دھارے میں شامل کرنے کی جدو جہد کر رہی ہیں اور وہ خواتین شاعرات بھی کہ جو ایک بالغ نظر صاحبِ شعور فرد کی حیثیت سے خواتین کے بنیادی مسائل کو تخلیقی سطح پر نمایاں اور اجاگر کر رہی ہیں۔

سوال ۸: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب خواتین کی شاعری نے بلا شبہ عورت کے حقوق کی بحالی اور معاشرے میں اُس کے انفرادی تشخص کو اُجاگر کرنے میں بہت مؤثر کردار ادا کیا ہے۔

سوال ۹: آپ کے خیال میں شاعرات کی نثری نظم زیادہ مؤثر ہے یا پابند؟ غزل پر بھی اپنی رائے دیجئے؟

جواب ہمارے ہاں گو کہ نثری نظم ادب میں رواج پا چکی ہے اور بطور صنفِ سخن کے اب اس کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن عام طور پر بھی بحیثیت صنفِ سخن کے نثری نظم کے مقابلے میں غزل کی شاعرات عوامی حلقوں میں اپنے اثر و نفوذ کے اعتبار سے زیادہ مقبول ہیں۔

سوال ۱۰: شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ موثر ثابت ہو رہا ہے لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا پر؟ (ریڈیو، ٹی۔وی وغیرہ)

جواب لکھا ہوا لفظ پرنٹ میڈیا میں زیادہ مؤثر ہے مگر الیکٹرانک میڈیا میں ادب من حیث کُل زیادہ نمایاں نہیں کہا جا سکتا۔

سوال ۱۱: کیا مشاعرے اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب مشاعرہ بڑی حد تک رُو بہ زوال ہے اور اس کی حیثیت دن بدن ایک ورائٹی شو کی ہوتی جا رہی ہے، مگر یہ ضرور ہے کہ اس صورتِ حال میں بھی جب کوئی شاعرہ یا شاعر بیداریٔ شعور یا حقوقِ انسانی کے حوالے سے ادب کے جمالیاتی معیارات

کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ پڑھتا ہے تو وہ یقیناً لوگوں میں معتبر ٹھہرتا ہے۔

سوال ۱۲: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو کس حد تک؟

جواب ہر شاعری کوئی نہ کوئی تاثر ضرور چھوڑتی ہے لیکن کوئی دیرپا اثر میڈیا کے ذریعے پیش ہونے والی خواتین کی شاعری کا پڑا ہو میرے خیال میں ایسا نہیں۔ خواتین شاعرات کی رومانوی مزاج رکھنے والی غزلیں، نظمیں میڈیا میں زیادہ پذیرائی حاصل کرتی ہیں۔

عابد حسن منٹو

دانشور

ایڈووکیٹ سپریم کورٹ

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال۲: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری معاشرے کی سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی جہات پر کس طرح اثر انداز ہوئی۔ کیا وہ اس سلسلے میں کوئی شعور پیدا کر سکی؟

جواب: یہ سوالات ایسے ہیں جیسے کوئی یہ پوچھے کہ کیا شاعری (نہ کہ صرف خواتین کی شاعری) نے ہمارے معاشرے پر کوئی اثرات مرتب کیے ہیں۔ یا پھر کہ کیا فنونِ لطیفہ معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تو اس کا ایک جواب تو اس بیان میں ہے کہ شاعری جزویست از پیغمبری۔ بہر حال شاعری کو پیغمبری سے کوئی نسبت ہو یا نہ ہو، یہ جذبات اور احساسات اور بعض اوقات مجرد خیالات اور نظریات کے فنکارانہ اظہار کا نام ہے۔ اب یہ تو شاعری کے موضوع اور اس کے فنی معیار پر منحصر ہے کہ وہ معاشرے یا اس کے کسی حصے کو متاثر کرتی ہے یا نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر اچھی اور خوبصورت تحریر متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ ہماری اچھی شاعری نے بھی یقیناً معاشرے پر اثرات مرتب کیے ہیں اور اس اچھی شاعری میں خواتین شعراء کا قابلِ قدر حصہ ہے۔

خواتین شعراء کا معاملہ قدرے مختلف بھی ہے۔ پدرسری سماج کی طبقاتی ساخت اور ہمارے ہاں کے فیوڈل اور قبائلی معاشرے نے عورت کو کبھی مکمل انسان تسلیم ہی نہیں کیا۔ عقل، دانش، سیاست، ریاست اور تہذیب و ثقافت عموماً مرد ہی

کے قبضہ میں رہے ہیں اور یہ سلسلہ صدیوں پر محیط ہے۔ ایسے میں خواتین کی جانب سے اٹھنے والی ہر آواز اور سماجی عمل میں ان کی شرکت بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

یوں تو شاعری چاہے مردوں کی ہو چاہے خواتین کی یا کسی تیسری جنس والے کی ہے ہی نازک جذبات واحساسات کے فنی اظہار کا نام' تاہم خواتین کے حوالے سے شاعری کو جو خصوصی اہمیت حاصل ہے وہ ان مسائل اور اس نفسیات کے اظہار کی وجہ سے ہے جو مرد معاشرے کے غیر انسانی رویوں' قوانین اور رواجوں کا نتیجہ ہیں۔ خواتین شعراء نے ان رویوں' رواجوں اور قوانین اور ان سے پیدا ہونے والے بے مروت بلکہ ظلم پر مبنی معاشرے کے خلاف آواز بھی اٹھائی ہے اور سماج کو ایک مختلف سوچ اور نفسیات کی نئی جہتوں اور انسانی رشتوں کے نئے تناظر سے روشناس بھی کروایا ہے۔ وہ باتیں جو پہلے عموماً مرد ہی کی نظر سے دیکھی اور اس کی آواز میں سنی جاتی تھیں۔ اب ایک دوسرے انداز میں دیکھی اور سنی جارہی ہیں۔

خواتین کی شاعری عورت کا self assertion ہے' اس کا اظہار ذات ہے اور خود پر اعتماد یا اس اعتماد کو توڑنے والے عناصر کے خلاف احتجاج ہے۔ یہ سب ایک مکمل سماجی عمل بھی ہے اور یقیناً اس نے معاشرے کو کئی پہلوؤں سے متاثر کیا ہے۔ چنانچہ آج ہمارے معاشرے میں رجعتی قیود کو توڑنے کشادگی اور روشن خیالی کے جتنے بھی امکانات پیدا ہوئے ہیں ان میں خواتین شعرا سمیت خواتین تخلیق کاروں کا بڑا حصہ ہے۔

سوال ۵: کیا ہمارے تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی کم نہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب جس معاشرے میں عورت کو مکمل انسان ماننے ہی میں پس وپیش کی جائے' قانوناً عورت کی گواہی کو نصف شہادت بنانے کی کوشش کی جائے اور جہاں اس کی دیت مرد سے آدھی مقرر کی جائے۔ وہاں تعلیمی نصاب میں خواتین شعراء کو

صحیح نمائندگی کون دے گا۔ یہاں تو جمہوری نظام میں بھی خواتین کی نمائندگی کے معاملے کو متنازعہ بنایا گیا ہے۔

تعلیمی نصاب کی جو چند کتابیں میری نظر سے گزری ہیں وہ اگرچہ ہمارے بعض معروف ادیبوں اور اساتذہ کی مرتب کردہ ہیں تاہم وہ کئی اعتبار سے یک طرفہ انتخاب کا اظہار کرتی ہیں۔ کلاسیکی جدید اور جدید تر شاعری کے درمیان انتخاب کرتے ہوئے توازن قائم نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح کم از کم ان کتابوں میں جو میں نے دیکھی ہیں خواتین شعرا کا کلام سرے سے شامل ہی نہیں ہے۔ زبان و ادب کی تعلیم کے نصاب میں ادبی تحریکات' فنی اور لسانی تجربات کے حوالے سے انتخاب نہ کیا جائے تو طالب علم کو ادب و شعر کے سفر کے احوال سے روشناس ہی نہیں کیا جا سکتا۔ خواتین کا ادب اور خاص طور پر شعری ادب' جہاں عمومی ادبی اور تہذیبی روایات سے جڑا ہوا ہے وہیں اس کا بڑا حصہ منفی روایات کے خلاف بغاوت یا احتجاج یا کم از کم ان روایات کے بارے میں ایک مختلف طرزِ احساس کا اظہار کرتا ہے۔ عورت کا اپنا تشخص ہے اور اس کی مخصوص نفسیات ہے۔ خواتین شعراً کے ہاں ہی ان چیزوں کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس طرح شعر و ادب میں لکھنے والی خواتین ایک مخصوص تحریک یا روش یا انداز کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ خواتین کی یہ شاعری فنی معیارات پر پوری نہیں اُترتی۔ ادا جعفری' زہرہ نگاہ' پروین شاکر' شبنم شکیل' فہمیدہ ریاض' کشور ناہید' یاسمین حمید' منصورہ احمد صرف چند نام ہیں اس لمبی فہرست میں سے جو اچھی شاعری کرنے والی اور نئی sensibility کے مختلف پہلوؤں کا اظہار کرنے والی شاعرات کی مرتب کی جا سکتی ہے۔

سوال ۱۶: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خواتین کی شاعری ہمارے قانون دانوں کے ذہن پر مثبت طور پر اثر انداز ہو سکتی ہے؟

جواب جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ خواتین کی شاعری نے یقیناً معاشرے کے ان حصوں پر جہاں اس کی رسائی ہوئی ہے' اثرات مرتب کیے ہیں۔ قانون دان'

چاہے وہ قانون سازی کرتے ہوں چاہے عدالت اور وکالت کے ذریعے قانون کی تشریح و توضیح کا کام کریں یقیناً معاشرے ہی کے افراد ہیں اور معاشرے کی تہذیبی، ثقافتی اور علمی تحریکات سے متاثر ہوتے ہیں۔ خواتین کی اچھی شاعری یقیناً اس طبقے پر مثبت اثرات پیدا کرسکتی ہے، بلکہ کرتی ہے۔

کشور ناہید

دانشور۔ شاعرہ۔ کالم نگار

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے ایشوز کے لیے آپ نے جو کچھ بھی کام کیا کیا آپ اس سے مطمئن ہیں۔ کیا آپ اپنا اظہار مکمل طور پر کر پائیں؟

جواب: خواتین سے متعلق موضوعات پر کام کرنا ایک الگ مسئلہ ہے۔ خواتین کے مسائل الگ مسئلہ ہے۔

میں نے اب تک ۴۰ برسوں میں جتنا کچھ عورتوں کے موضوعات کو اجاگر کیا۔ اس کا اطمینان بس اتنا ہے کہ ہماری نسل جن موضوعات پر بات نہیں کر سکتی تھی۔ ہمارے دیے ہوئے شعور کے باعث' آج کی نسل نہ صرف بات کرتی ہے بلکہ روایتی رویوں کو چیلنج بھی کرتی ہے اور ان پر بحث بھی کرتی ہے۔

سوال ۲: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری معاشرے کی سماجی اقتصادی تہذیبی سیاسی جہات پر کس طرح اثر انداز ہوئی۔ کیا وہ اس سلسلے میں کوئی شعور بیدار کر سکی ہے؟

جواب: یہ خواتین کی شاعری ہے جس کے باعث ''آزادی نسواں کہ زمرد کا گلوبند'' جیسے سوالات کے نہ صرف جوابات ملے ۔ بلکہ رومانوی شاعری کے ھالے میں شگاف پڑا۔ اب شاعری میں انسانی رشتوں اور سماجی پس منظر میں انسان کی نفسیاتی تبدیلیوں اور رویوں کا ذکر بھی شاعری کا حصہ ہے۔

سوال ۳: میڈیا کے حوالے سے (اخبارات۔ ٹی وی۔ ریڈیو۔ فلم) عورت کا تصور اصغری

خانم یعنی سیاہ وسفید سے آگے بڑھ پایا ہے یا نہیں؟

جواب: میڈیا نے ذہنی آزادی کو ابھی تک موضوع بحث نہیں بنایا۔ عورت اور مرد دو وجود ہیں اور دونوں انسان ہیں۔ میڈیا' رومانویت اور کمرشلائزیشن کے درمیان نا آسودہ اور نامکمل انسان کی شبیہہ ہے۔

سوال۴: عورت کے اشیوز نظم (براہ راست) یا غزل (استعارہ) کس صورت میں بہتر طریق پر اظہار پاتے ہیں۔

جواب: یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ عورت کے ایشوز پر جو کہ انسان کے ایشوز ہیں ان کو پیش کرنے کا ہنر' کس قدر اور کس حد تک جانتے ہیں۔ پہلے خود تو ان ایشوز سے شاعرات اور شاعر آگاہ ہوں۔ پھر پیش کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔

سوال۵: عورت کے اشوز کے اظہار کے لیے شاعری کے جمالیاتی پہلو کو آپ کتنی اہمیت دیتی ہیں۔

جواب: شاعری اور پراپیگنڈہ میں جو فرق ہے وہی فرق سامنے لاتا ہے شاعری کی جمالیاتی حسیات کو۔ عورت کے ایشوز گویا انسان کے ایشوز پر لکھنے سے جمالیات محدود نہیں ہوتی ہے۔

فہمیدہ ریاض
شاعرہ۔ادیبہ۔دانشور

انٹرویور۔شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے issues کے لیے شاعری کے حوالے سے آپ نے جو کچھ بھی کام کیا' کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟ کیا اس کا اظہار مکمل طور پر کر پائی ہیں؟

جواب: نہیں۔انسان اپنے کام سے کبھی مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوتا۔میرے خیال میں اگر حالات اجازت دیتے تو اس سے کہیں زیادہ کام کیا جا سکتا۔اس سے مراد کچھ میرے اپنے حالات بھی ہیں۔اور کبھی سماجی قدغنیں بھی ہیں جن کو آہستہ آہستہ' بتدریج توڑا جا سکتا تھا۔یقیناً میں اپنا مکمل اظہار نہیں کر پائی ہوں۔ میرے شعری مجموعے ''بدن دریدہ'' پر جو ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اس نے مجھے بہت زیادہ محتاط بنا دیا تھا۔کئی برسوں کے بعد میں اس دباؤ سے نکل پائی ہوں۔

سوال ۲: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری معاشرے کی سماجی' اقتصادی' تہذیبی اور سیاسی جہات پر کس طرح اثر انداز ہوئی؟ کیا وہ اس سلسلے میں کوئی شعور بیدار کر سکی ہے؟

جواب: پاکستان کی شاعرات کے کلام کا معاشرے کی مختلف جہات پر کیا اثر پڑا ہے۔یہ طے کرنے کے لیے باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔کسی مرد محقق نے آج تک ایک مثبت رویے کے ساتھ کام نہیں کیا ہے۔اس کے لیے خواتین کو خود آگے بڑھ کر تحقیق کے ذریعے' نتائج جمع اور مرتب کرنے پڑیں گے۔پھر بھی جو بات صاف نظر آ سکتی ہے۔وہ یہ ہے کہ پہلے سے کہیں زیادہ لڑکیاں شاعری کر رہی ہیں اور ان کی شاعری ان کے اظہارِ ذات کا ذریعہ بن رہی ہے۔ماضی میں

عصمت چغتائی جیسی ایک نثر نگار کی تحریروں نے بلا شبہ سماجی رویوں کے بدلنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریریں پڑھنے سے جہاں خواتین میں زندگی کے ہر شعبے میں اپنا کردار ادا کرنے کی اُمنگ اور اعتماد پیدا ہوا ہے وہاں مرد قارئین بھی خواتین کو اپنے برابر رتبہ دینے کے لیے مزید آمادہ ہوئے ہیں۔
یہ بات بہر حال مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ فنون لطیفہ کا اثر معاشرے پر ایک ایسی اندرونی سطح پر ہوتا ہے جو فوراً نظر نہیں آ سکتی لیکن وہ کہیں زیادہ دور رس اور پائیدار ہوتی ہے۔ یہ معاشرے کے دل اور ذہن میں تبدیلی لانے کا عمل ہے۔ یہ فوری طور پر ظاہر ہوتا ہے اور نہ فوری طور پر مٹتا ہے۔

سوال ۳: میڈیا کے حوالے سے (اخبارات۔ ریڈیو۔ ٹی وی۔ فلم) عورت کا تصور اصغری خانم یعنی سیاہ و سفید سے آگے بڑھ پایا ہے یا نہیں؟

جواب: میرے ناچیز خیال میں' میڈیا میں عورت کا تصور ابھی تک صدیوں پرانا ہے۔ بلکہ جہادِ افغانستان کے بعد تو یہ مزید کچھ صدیوں پیچھے چلا گیا ہے۔

سوال ۴: عورت کے issues نظم (براہ راست) یا غزل (استعارہ) کس صورت میں بہتر طریق پر اظہار پاتے ہیں؟

جواب: عورت کا اظہار ذات فنونِ لطیفہ کی کسی بھی صنف میں ہو سکتا ہے۔ یہ ہر شاعرہ کی اپنی ذاتی قابلیت پر منحصر ہے کہ وہ اپنے لیے کون سی صنف کا انتخاب کرتی ہے۔ اگر استعارہ توانا ہو تو بہت کارگر رہتا ہے اور اگر براہِ راست اظہار میں سچائی کی آگ ہو تو وہ بھی مؤثر ہوتی ہے۔

سوال ۵: عورت کے issues کے اظہار کے لیے شاعری کے جمالیاتی پہلو کو آپ کتنی اہمیت دیتی ہیں؟

جواب: میں فن کے جمالیاتی پہلو کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔ بدنصیبی سے عورتوں کی شاعری کو اکثر غلط سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے بعض اوقات شاعرات براہِ راست جمالیاتی پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات کھل کر کہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ دورِ نسائی اظہار کا تقریباً ابتدائی دور ہے۔ اس میں ہمیں خواتین کی لکھی ہوئی ہر تحریر کی قدر کرنی پڑے گی۔ کیونکہ وہ معاشرے کو تبدیل کرنے میں ایک کردار ادا کر رہی ہے۔

آغا ناصر

براڈ کاسٹر / ڈرامہ نگار

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: ویسے تو خواتین کے issues کو مرد اور عورت کے مشترکہ issues سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور نہ الگ کرنا میرے نزدیک مناسب ہے مگر پھر بھی ہمارے معاشرے کے خصوصی حالات کے پیشِ نظر عورتوں کے سماجی اور خانگی مسائل میری نظر میں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: اس ضمن میں میری contribution دو طرح کی ہے۔ ایک تو یہ کہ ایک ادیب اور ڈرامہ نگار کی حیثیت میں میں نے اپنی بہت سی تحریروں میں پاکستانی معاشرے میں خواتین کو درپیش مسائل کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے کئی ڈرامے ایسے ہیں جن کا تعلق براہِ راست ہماری خواتین کے سماجی اور خانگی مسائل سے ہے اور جن میں ''عورت'' کو مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ایک اور قسم کا contribution اس سلسلہ میں جس کو میں زیادہ اہمیت دیتا ہوں اس کا تعلق میری پیشہ وارانہ اور انتظامی ذمہ داریوں سے ہے۔ میں ساری زندگی ریڈیو اور ٹیلی وژن کے اداروں سے منسلک رہا ہوں اور ان اداروں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہتے ہوئے میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ریڈیو

اور ٹیلی وژن کے پروگراموں میں زیادہ سے زیادہ خواتین کی نمائندگی ہو اور زیادہ سے زیادہ women related issues کو مثبت انداز میں پیش کیا جا سکے۔
میں اس بات پر خوش اور مطمئن ہوں کہ میں نے اپنے طور پر اس سلسلہ میں جو کچھ کیا جا سکتا تھا وہ کرنے کی کوشش کی۔

سوال ۳: میڈیا کے حوالے سے عورت کا تصور اصغری خانم یعنی سیاہ و سفید سے آگے بڑھ پایا ہے یا نہیں؟

جواب: میرے خیال میں خواتین کی شاعری میڈیا کو خصوصی طور پر متاثر نہیں کرتی۔ شاید میڈیا شاعری کو ''اچھی'' اور ''بُری'' شاعری کی نظر سے دیکھتی ہے نہ کہ ''خواتین'' اور مردوں'' کی شاعری کی نظر سے۔ میں سمجھتا ہوں شاعرات کے کلام کے لیے (اور مرد شاعروں کے کلام کے لیے بھی) لکھا ہوا لفظ زیادہ موثر ہوتا ہے۔

سوال ۴: آپ کے خیال میں خواتین کی زندگی کا کون سا ایسا شعبہ ہے جس میں اس شاعری کے حوالے سے شعور بیدار ہوا اور آگاہی پیدا ہوئی یعنی سماجی' اقتصادی' سیاسی' تہذیبی' ثقافتی کس اعتبار سے؟

جواب: یقیناً عورت کی ذاتی اور انفرادی حیثیت کے پروجیکشن میں خواتین کی شاعری نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ مگر یہ بات صرف چند شاعرات کی چند نگارشات تک محدود ہے۔

منیزہ ہاشمی
پاکستان ٹیلی وژن

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ا: خواتین کے ایشوز کے لیے آپ نے جو کچھ بھی کام کیا' کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

جواب: I am most satisfied that I have been able to be instrumental in bringing women's issues to the screen of PTV in a positive manner. PTV has taken very bold initiatives in this regard and was the first channel in South East Asia to have set aside specific airtime for its women viewers.

سوال ۲: کیا مجموعی طور پر خواتین کی شاعری معاشرے کی سماجی اقتصادی تہذیبی اور سیاسی جہات پر اثر انداز ہوئی؟ کیا وہ خواتین میں شعور بیدار کر سکی؟

جواب: Poetry in Pakistan is not and cannot be as effective as in countries where the literacy rate is higher. Here women are not literate enough or
aware enough to fully comprehend poetry in all its diverse forms. However, policy makers and decision makers should be targeted since they are formulators of public opinion.

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے مجموعی طور پر ہمارے میڈیا (اخبارات۔ ریڈیو۔ ٹی وی) پر کوئی اثرات مرتب کیے؟

جواب: On the electronic media, the image of women has enhanced most positively in the past few years. Issues regarding women have been boldly talked about. Negative stereo types have been replaced with more positive images. News reports

about women and discrimination of gender have increased. Awareness on gender has become an official policy on PTV.

سوال ۴: عورت کے ایشوز کے اظہار کے لیے شاعری کے جمالیاتی پہلو کو آپ کتنی اہمیت دیتی ہیں؟

جواب: Every creative person has his or her own medium of expression. Be it a painter, a singer, a sculptor or a poet. Presenting any form of "creativity" has to have an attractiveness in it. The expressions in poety are almost always coated and wrapped in beautiful metaphors and words. Poetry is an expression of the poet's thoughts using appropriate words. Women issues are not beautiful experiences. They are harsh, cruel, even violent. But the poet will
usually use such words that will describe the issues in a manner that provokes the conscience of the reader, makes him ponder and think, makes him aware of the injustices being meted out to other fellow human beings. A poet is the voice of our conscience who uses gentle and soothing words to express the ugly realities around us.

فاطمہ حسن

شاعرہ۔ادیبہ

انٹرویور۔شبنم شکیل

سوال ا: خواتین کے ایشوز کے لیے جو کچھ کام کیا ہے۔ کیا آپ اس سے مطمئن ہیں اور اظہار مکمل طور پر کر پائی ہیں؟

جواب: میری شاعری اور کہانیوں میں بالکل ابتدا ہی سے خواتین کے مسائل کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ بنیادی طور پر میں سچے جذبات' احساسات تجربات کے اظہار کو اہمیت دیتی ہوں۔ اس لیے جب بھی میں نے لکھا میرا اظہار ایک عورت اور ایک لڑکی کے احساسات کا آئینہ دار ہوا۔ چنانچہ جب 1977ء میں میرا پہلا مجموعہ ''بہتے ہوئے پھول'' شائع ہوا تو اس میں وہ نظم شامل تھی۔ جسے بعد میں نسائی ادب کے نمونے پر پیش کیا گیا۔ اسی طرح 1977ء سے اب تک جو کہانیاں میں نے لکھیں ہیں ان کا مجموعہ ''کہانیاں گم ہو جاتی ہیں'' 2000ء میں شائع ہوا۔ اس کے دیباچے میں ضمیر علی بدایونی نے جو جدید ادب کے ایک بے حد معتبر نقاد ہیں' لکھا ہے کہ ان کہانیوں میں واضح نسائی شعور ہے اور اسی حوالے سے انہوں نے نسائی ادب کی تاریخ اور نسائی تنقید پر ایک تاریخی مضمون لکھا۔ اس مضمون کے بعد نسائی تنقید پر ان کے اور دوسرے لکھنے والوں کے مسلسل مضامین چھپ رہے ہیں۔ انہوں نے ایک بات واضح کر دی کہ نسائی تنقید کی بنیاد دراصل نسائی شعور کے مطالعہ پر ہے۔

اب میں ماضی کی طرف دیکھتی ہوں تو 1975ء میں جب خواتین کا عالمی سال منایا جار ہا تھا میں نے جو نظم لکھی تھی وہ غیر شعوری طور پر ہمارے عہد کے نسائی شعور کی ترجمانی کر رہی ہے۔

خواتین کے عالمی سال میں

میں ماں سے کہتی ہوں
یہ پیڑ جو میں نے بڑے شوق سے لگائے تھے
اب آسیب بن کر میرے بچپن کا خوف دھراتے ہیں
وہ ہنستی ہے اور کہتی ہے
میری گود تمہارے لیے بہت چھوٹی ہے
پھر میں آنکھوں کا ہراس چھپانے کے لیے
اخبار سامنے کر لیتی ہوں
اور اس کی ڈھونڈتی نگاہیں
ویتنام کی تصویروں میں الجھ جاتی ہیں
وہ دھیرے سے کہتی ہے
پتنگ سے اغوا تک کی تصویروں میں
کیا تم نے کوئی امن کا اشتہار بھی چھاپا
میں تمہیں تمہارے باپ کے خلاف
بولتے دیکھ کر بہت خوش ہوئی
کہ اب میں تمہاری پناہ میں آنا چاہتی ہوں

پھر 1991ء میں جب بچیوں کا سارک سال منایا جار ہا تھا میں نے نظم آ گہی لکھی جو یونیسف کے پوسٹر پر چھپی اور اس سال کے خصوصی ڈرامے 'حوا کی بیٹی'' کا تھیم سونگ بنی۔ جب میں مسلسل ایک ایسی جہت پر کام کر رہی تھی جو میری اپنی ذات اور اپنے شعور کی آئینہ دار تھی۔ تو میں سوچتی تھی کہ دیگر خواتین بھی اپنے تجربات اور احساسات کو اسی طرح اظہار کے پیرائے میں ڈھالتی رہی ہیں۔

ان کی تحریروں کا اس طرح مطالعہ ہونا چاہیے کہ مسلسل مضامین لکھنے کے ساتھ ساتھ پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ ''جدید اردو شاعری کی فروغ میں خواتین کا کردار رسائل کی روشنی میں'' کے موضوع پر لکھ رہی ہوں۔ حال ہی میں فہمیدہ ریاض اور آصف فرخی کے ساتھ ایک کتاب ''خاموشی کی آواز'' مرتب کی ہے۔ مطالعہ کے ساتھ اس کتاب میں تنقیدی اور فلسفیانہ توجیہات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ نسائی تنقید کی مثال بھی پیش کی گئی ہے۔ اب یہ سوال کہ کیا مکمل اظہار کر پائی ہوں تو یہ اطمینان لکھنے والے کو کب حاصل ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور سوچتی ہوں کہ بحثیت عورت مجھے خواتین کے لیے جو کچھ کرنا چاہیے تھا اس میں بساط بھر حصہ لیا ہے۔ ابھی تو لکھنا جاری ہے شاید کوئی بڑا کام ہو جائے۔

سوال ۲: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری سماجی، تہذیبی، سیاسی، اقتصادی جہات پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ کیا شعور بھی بیدار کرتی ہے؟

جواب: جہاں تک اثر انداز ہونے کی بات ہے یہ ایک الگ بحث ہے کہ جس معاشرے میں تعلیم کی شرح فی صد ہو اور خواتین کی تعلیم کی شرح 32 فیصد ہو۔ کتابیں افراد کی قوت خرید سے باہر ہوں وہاں ادب کتنا شعور پیدا کر سکتا ہے۔ وہ تحریریں جو خواتین کے شعور کی آئینہ دار ہیں۔ ان کا ان کے عہد میں ہونے کا پتہ دیتی ہیں اور آنیوالے وقت میں سچی دستاویز ہوں گی۔ کیونکہ کسی بھی دور کی تاریخ کو سند اس عہد کے ادب سے ملتی ہے۔ جہاں تک شعور کی بیداری کا تعلق ہے آرٹ اور ادب اس کے لیے بہت ضروری ہے۔

سوال ۳: میڈیا کے حوالے سے فلم، ٹی وی، ریڈیو عورت کا تصور آگے بڑھاتے ہیں کہ نہیں؟

جواب: بڑھاتے تو ہیں مگر ان کا رویہ وہی ہے جو ابھی تک ہمارے پاپولر ادب کا رہا ہے۔ نسائی تنقید نگاروں کا ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ عام طور پر جو تصویر کشی عورت کی ہوتی ہے وہ دراصل اپنی خیالی عورت کی تصویر کشی ہے۔ وہ اسے ایسا ہی پیش کرتے ہیں۔ جیسا وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ یا تو وہ اسے فرشتہ بنا دیتے ہیں یا شیطان۔ اس کی جسمانی خوبصورتی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کا

ذہن بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ اصل عورت تو کہیں نہیں ہوتی۔ اس رویے کی بھرپور مثال ہمارا میڈیا پیش کرتا ہے۔ خصوصاً فلم اور ٹی وی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خواتین کے پروگرام میں بھی ابھی اصغری اور اکبری کو پیٹا جاتا ہے اور اے آر خاتون، رضیہ بٹ کی لکھی ہوئی fantasy سے بھرپور کہانیوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ فلم کا میڈیم تو اپنے منطقی انجام کو تقریباً پہنچ چکا ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کوئی باشعور خاتون پاکستان فلم برداشت نہیں کر سکتی جس میں ہیروئنیں عجیب و غریب مخلوق ہوتی ہیں جن کا ہمارے کلچر اور حقائق سے دور دور کا واسطہ نہیں ہوتا۔

سوال ۴: عورت کے احساس نظم یا غزل کی صورت میں بہتر طریقے سے اظہار پا سکتے ہیں؟

جواب: شاعری میں شدتِ احساس، جمالیات معنی کی تہداری ہوگی تو وہ خواہ غزل ہو یا نظم متاثر کرے گی۔ نظم کا کینوس وسیع ہے اس لیے نظم سماجی، سیاسی مسائل کا احاطہ کرتے ہوئے مکمل دائرہ بناتی ہے۔ اس لیے جب بھی خارجی مسائل داخلیت کا حصہ بنے ایک اچھی نظم تخلیق ہوئی۔ مگر جو اظہار غزل میں عورت کا ہوگا وہ بھی اس کی اپنی ہی ذات کا آئینہ دار ہوگا۔ اس کے لیے کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔

سوال ۵: عورت کے ایشوز کے اظہار کے لیے شاعری کی جمالیاتی پہلو کی کتنی اہمیت ہے؟

جواب: کوئی بھی فن پارہ اعلیٰ جمالیات کے بغیر تخلیق ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جمالیات ہی تو ہے جو فنون لطیفہ کو دوسرے فنون سے ممتاز کرتی ہے۔ خصوصاً شاعری جس میں اعلیٰ جمالیات کے اظہار کی زیادہ آسانی ہے۔ مثلاً مصور صرف رنگ اور موسیقار صرف ساز سے اپنے احساسات کو پیش کرتا ہے۔ اسی طرح مجسمہ ساز کے لیے بھی dimensions کو پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ تو صرف شاعر ہے جو لفظوں سے تمام تر جمالیاتی پہلو اجاگر کر سکتا ہے۔ شاعری خواہ داخلیت کی آئینہ دار ہو یا خارجی مسائل کی ترجمان اس میں اعلیٰ جمالیاتی رچاؤ کا ہونا ضروری ہے ورنہ اس کی حیثیت ٹرکوں پر بنی ہوئی تصویر اور دوکانوں پر بکتے ہوئے کاغذ کے پھولوں جیسی ہوگی۔

پروفیسر محسن احسان

شاعر۔ پشاور (سرحد)

انٹرویور۔ صبا جاوید

سوال ا: محسن احسان صاحب ایک اچھے شعر کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت ہے؟

جواب: ایک اچھے شعر کی اہمیت پہلے بھی رہی ہے اور اب بھی ہے۔ طالب علم سے لے کر سیاستدان اور دیگر مقررین اپنی تقاریر میں شعر کے استعمال سے ہی اپنے جذبات کا بہترین اظہار کرتے ہیں۔

سوال ۲: معاشرتی اعتبار سے شاعری کا کیا مستقبل ہے خاص طور پر خواتین کی شاعری کا؟

جواب: معاشرتی اعتبار سے ہمارا انداز فکر شعر کی طرف زیادہ راغب رہا ہے اور اس کا معاشرے پر اثر بھی رہا ہے اور جب تک معاشرہ ہے وہ شاعری سے اثر قبول کرتا رہے گا اور شاعری زندہ رہے گی۔ خواتین کی بھی اچھی شاعری ضرور زندہ رہے گی۔

سوال ۳: کیا شاعری دل و دماغ کو اب بھی ویسا یقین بخش سکتی ہے جیسا گذشتہ زمانوں میں ہوا جس کے باعث لوگ غلامی سے آزادی کے راستے پر گامزن ہوئے؟

جواب: بالکل ایسا ہوسکتا ہے اور ایسا ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

سوال ۴: مشاعروں کا ہماری تہذیب وتمدن پر آپ کیا اثر دیکھتے ہیں؟

جواب: مشاعرہ ہماری ایک تہذیبی روائیت ہے اور پہلے زمانوں میں بھی اس سے تفریح کے مواقع میسر آتے تھے ذہنی قربت و روحانی تسکین اور قلبی طمانیت کا باعث

ہوتے تھے وہیں اس کے ساتھ ہی ساتھ تقسیم سے پہلے یہاں کل ہند مشاعرے ہوتے تھے اور پورے ہندوستان سے شعرا آتے تھے تقسیم کے بعد بھی یہ سلسلہ خاصا عرصہ چلا جشن خیبر میں کل پاکستان مشاعرہ کا سلسلہ بھی اچھا تھا۔ اس اعتبار سے شعر انسان کی زندگی میں ایک خاموش پہچان پیدا کرتا ہے اور انسانی دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے اور شاعری کا مزید تہذیب پر اثر دیکھئے کہ بچوں کو اس دور میں ابھی نغمگی سے آشنائی کے لیے نظمیں یاد کرائی جاتی ہیں۔ شعر ان کی شخصیت کی نشو و نما میں بھی بڑا اثر رکھتے ہیں۔

سوال ۵: شاعری کا سیاست میں کیا کردار دیکھتے ہیں؟

جواب: آپ اس سلسلے میں اقبال کی شاعری کو لے لیجئے۔ حالی کی مسدس کو دیکھئے کہ پوری قوم کو رُلا دیا اور بیدار کیا اکبر الہ آبادی نے مذاق کے سے انداز میں قوم کو خبردار کیا۔ نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنے طور پر رول ادا کیا اقبال نے سوچ اور فکر کو اتنا تبدیل کیا کہ غلام قوم جاگ اٹھی اور آزادی کے خواب کو حقیقت میں بدلنے لگی۔ حبیب جالب نے اپنی نظم ترنم سے جلسوں میں پڑھیں۔ مثلاً

''میں نہیں جانتا میں نہیں مانتا''

تو اس کی شاعری نے ہماری سیاست پر اثر ڈالا ہے ہمارے ذہنی فکر کو تبدیل کیا ہے اور قوم کو اپنے طور پر ایک انقلابی ڈھنگ پر ڈال دیا ہے۔

سردار عبدالرب نشتر صاحب نے ایک بار اسمبلی میں محسن بھوپالی کا ایک شعر پڑھا۔

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

اسی طرح صدر غلام اسحاق خان نے صدارت سے استعفیٰ دیتے ہوئے جو آخری تقریر کی اس تقریر میں جو شعر پڑھا وہ تقریر سے زیادہ پُر اثر تھا اور یاد رہا۔

اِس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

بینظیر کے دور میں ایک منسٹر نے میرا شعر پڑھا۔

امیرِ شہر نے کاغذ کی کشتیاں دے کر

سمندروں کے سفر پر ہمیں روانہ کیا

سوال ۶: کیا خواتین کی شاعری بھی زندگی میں کوئی رول رکھتی ہے؟

جواب: خواتین بھی جذبات واحساسات رکھتی ہیں ان کی زندگی میں بھی شعر تبدیلی لاتا ہے گذشتہ ۲۲۔۲۳ سال کے عرصے میں شاعری کے میدان میں بہت سی خواتین شاعرات بھی ابھری ہیں۔اس سے عورت کے نسائی جذبوں کوزبان ملی ہے۔

سوال ۷: معاشی اعتبار سے شاعری کا ہماری سوسائٹی میں کیا رول ہے؟

جواب: شاعری نے ان شعرا کواچھے حالات فراہم کیے جن کی اپنی اوران کی کتابوں کی مقبولیت بڑھی لیکن ۱۴ کروڑ عوام میں اگرایک ہزار کتاب چھپے تو اس اعتبار سے بہت کم ہے جسے معاش کہتے ہیں اس طرح اس کا رول ہے تو نہیں لیکن دوسروں کی معیشت مضبوط کرتی ہے۔مثلاً چھاپنے والوں کی بیچنے والوں کی۔

ڈاکٹر ہارونہ جتوئی

جوائنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر (شعبہ نصاب) وزارتِ تعلیم

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟۔

جواب: Gender issues at homes & work places.

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: ذاتی سطح پر اور سماجی سطح پر۔

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے مجموعی طور پر ہمارے معاشرے پر کوئی اثرات مرتب کیے ہیں؟

جواب: بہت ہی گراں قدر۔ مثبت اثر۔ مگر کام ابھی باقی ہے۔

سوال ۴: آپ کے خیال میں خواتین کی زندگی کا کون سا ایسا شعبہ ہے جس میں اس شاعری کے حوالے سے شعور بیدار ہوا اور آ گاہی پیدا ہوئی یعنی سماجی، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی کس اعتبار سے؟

جواب: ہر لحاظ سے۔ ہر سطح پر۔

سوال ۵: کیا ہمارے تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی کم نہیں؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: بہت کم ہے۔ زیادہ ہونی چاہیے۔

سوال ۶: ہماری نوجوان نسل خاص طور پر طالبات پر یہ شاعری کیا اثرات مرتب کر سکتی ہے؟

جوب: بہت مثبت اثرات ہونے چاہئیں اور ہیں بھی۔

سوال ۷: ہمارے معاشرے میں خواتین کا کون سا طبقہ شاعری سے زیادہ اثر لیتا ہے، یا پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے؟

جواب: زیادہ تر پڑھا لکھا طبقہ۔ مگر T.V کی وساطت سے بہت پُر اثر واقع ہوا ہے۔

سوال ۸: آپ کی رائے میں وہ کونسی شاعرات ہیں جنہوں نے خواتین کے مسائل کی صحیح طور پر عکاسی کی ہے؟

جواب: پروین شاکر۔ کشور ناہید۔ زہرہ نگاہ۔ شبنم شکیل۔ فہمیدہ ریاض۔

سوال ۹: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب: جی ہاں۔

سوال ۱۰: آپ کے خیال میں شاعرات کی نثری نظم زیادہ مؤثر ہے یا پابند؟ غزل پر بھی اپنی رائے دیجئے۔

جواب: ہر ایک کا اپنا مقام ہے غزل بھی بہت اہم ہے۔

سوال ۱۱: شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ موثر ثابت ہو رہا ہے لکھا ہوا لفظ یا electron میڈیا پر؟ (ریڈیو ٹی۔ وی وغیرہ)

جواب: ٹی وی۔ اور اخبارات

سوال ۱۲: کیا مشاعرے اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب: بہت زیادہ۔

سوال ۱۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو کس حد تک؟

جواب: بہت حد تک مگر اور زیادہ ہونا چاہیے۔

سوال ۱۴: کونسی شاعرات کے ہاں اس women's lib سے متعلق موضوعات کو سلیقے اور توازن سے پیش کیا گیا ہے؟

جواب: بہت سی شاعرات نے But it is still not interperted rightly.

اعتزاز احسن

ممتاز سیاستدان، قانون دان، دانشور

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ا: "women's lib" کی اصطلاح سے آپ کے ذہن میں کیا تصور ابھرتا ہے؟

جواب: "women's lib" کی اصطلاع کے جو معنی مغرب میں لیے جاتے ہیں یا اس بارے میں جو تصور مغربی حوالوں سے ذہن میں پیدا ہوتا ہے ہمیں اپنے ماحول میں اس تصور سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ مغرب کی عورت آج سے سو سال پہلے معاشرے میں اپنے برابری کے مقام کے لیے جدوجہد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ جب تعلیم، ووٹ اور ملازمت میں اس کے حقوق تسلیم کیے گئے۔ ان سے بہت پہلے شادی بیاہ اور طلاق کے معاملات میں اس کے اپنے صوابدیدی انتخاب کا حق تسلیم ہو چکا تھا۔ پاکستان میں آج تک ایسا نہیں ہوا ہے اور اسلام میں دیے گئے عورت کے انسانی حقوق کا پرچار کرنے والے بھی آج تک یہ حقوق اپنی خواتین کو عطا کرنے کا انکار ہی نہیں کرتے بلکہ ان حقوق کو حاصل کرنے والی عورتوں پر جبر و تشدد بھی کرتے ہیں۔ جبکہ گزشتہ چند دہائیوں سے مغرب کی عورت ان حقوق سے بھی بڑھ کر اضافی آزادیاں مانگ رہی ہے۔ یہ اس کی اپنی جدوجہد ہے۔ جس میں وہ یقیناً کامیاب ہوگی کیونکہ تاریخ کبھی رجعت اختیار نہیں کرتی۔

ادھر ہمارے ہاں کی عورت ابھی تعلیم کے حصول۔ آزادانہ ووٹ کے استعمال اور ملازمت اختیار کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے تو رجعت پسند اس کو مغرب کی

women's lib کہہ کر معتوب کرتے ہیں۔ جبکہ عموماً آج بھی شادی بیاہ کے مسئلوں پر تو عورت کی اپنی خواہش یا مرضی کا عمل دخل ہوتا ہی نہیں۔ لہٰذا ہمارے ہاں women's lib کا مفہوم خواتین کے بنیادی اور انسانی حقوق کی بازیابی کی تحریک ہی لینا چاہیے۔ اور یقیناً اس جدوجہد میں ہر ذی شعور مرد کو عورت کا ساتھ دینا چاہیے۔

سوال ۲: خواتین نے اپنی شاعری میں کس طرح اس تحریک کے مقاصد کے حصول کے لیے کوشش کی ہے؟

جواب: مردوں کی طرح اکثر خواتین شعراء کسی بھی تحریک سے وابستہ نہیں رہیں۔ روائتی شاعری ان کا مزاج رہا ہے۔ ایسی شاعرات ادا جعفری کے نقش قدم پر شاعری برائے شاعری کرتی رہیں ہیں گو اس شاعری میں بہت اچھی شاعری بھی شامل ہے۔ مثلاً رضیہ فصیح احمد۔ سیما شکیب۔ فاخرہ بتول۔ رخشندہ نوید۔ نوشی گیلانی۔ ریحانہ قمر۔ عائشہ ملک کی شاعری۔

سوال ۳: کونسی شاعرات نے اس women's lib سے متعلق موضوعات کو سلیقے اور توازن سے پیش کیا ہے؟

جواب: میری رائے میں جن شاعرات نے بھی women's lib کے موضوعات کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے یہ کام سلیقے اور توازن سے ہی کیا ہے۔ گو انداز اپنا اپنا اپنایا ہوگا۔ مگر ایشوز پر موثر شاعری کا اپنا توازن اور سلیقہ ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جہاں عہد حاضر میں ہمارے ہاں چند شاعرات نے women's lib کا جھنڈا باقاعدہ بلند کر کے لہرا دیا ہے اور پاکستانی شاعرات کی کئی ایک بہت ہی اعلیٰ پائے کی نظمیں لکھ دی ہیں وہاں ایسی شاعرات بھی ہیں جن کی بہترین شاعری انہی ایشوز کو اجاگر کرنے کے لیے اشارے اور استعارے پر انحصار کرتی ہے۔ ان شاعرات جنھوں نے اس جدوجہد کو براہِ راست اور ایک مشن سمجھ کر اپنایا ہے اور متاثر کرنے والی شاعری کی ہے میں فہمیدہ ریاض۔ کشور ناہید سرِ فہرست ہیں جبکہ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں ہی میں نظم کہنے والی نسرین انجم

بھٹی بھی انہی کی ہم سفر ہے۔ ان شاعرات نے عورت کے ایشوز پر جارحانہ انداز میں شاعری کر کے عورت کے جذبات اور احساسات کے شاعرانہ bill boards آویزاں کر دیے ہیں اور اس براہِ راست کلام کی وساطت سے اس جاری معرکے میں عورت کی صف رجعت پسند حریفوں کے اگلے مورچوں تک پہنچادی ہے۔ یہ خواتین شعراء اس معرکے کا ہراول دستہ ہیں۔ کشور ناہید کی ''ہم گنہگار عورتیں'' اس معرکۂ حق و باطل کی ایک نمایاں مثال ہے۔

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں
کہ جن کے جسموں کی فصل بیچیں جو لوگ
وہ سرفراز ٹھہریں
نیابتِ امتیاز ٹھہریں
وہ داورِ اہلِ ساز ٹھہریں

مگر ان مذکورہ بالا شاعرات کے ساتھ ساتھ اسی معرکے میں بلند مقام کے حصول کی جدوجہد میں استعارہ اور مختلف زاویوں سے وار کرنے والی چند شاعرات کا بھی حصہ ہے۔ زہرہ نگاہ۔ شبنم شکیل۔ پروین شاکر اور ثمینہ راجہ جیسی شاعرات نے جو بات استعارے کا سہارا لے کر کی ہے وہ اکثر اوقات مخالف کے سر پر سیدھے مارے گئے پتھر سے بھی زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے۔ لیکن دونوں اقسام کی شاعری نے عورت کے احساسات۔ اس کی محرومیوں۔ اسکے آدرشوں اس کے خوابوں اور اس کے اندر کی ابھرتی ہوئی بغاوت کو خوب نمایاں کر کے

آج کے معاشرے میں تبدیلی کی ضرورت کے احساسات کو شدت بخشی ہے۔

آدھی ریت سے باہر ہوں میں۔ آدھی ریت میں گڑی ہوئی ہوں

اب یہ عورت ریت میں ذرّہ بھر بھی گڑا رہنا نہیں چاہتی نہ ہی اس کو یوں مجبور و محصور رکھا جاسکتا ہے۔ اور آج کے مردوں کے لیے یہی آج کی ہر شاعرہ کا پیغام ہے۔

نسرین انجم بھٹی

شاعرہ

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ا: خواتین کے issues کیلئے شاعری کے حوالے سے آپ نے جو کچھ بھی کام کیا۔ آپ اس سے مطمئن ہیں؟ کیا آپ اپنا اظہار مکمل طور پر کر پائیں؟

جواب: ایک پسماندہ طبقے کے طور پر پاکستانی اور مجموعی طور پر دنیا بھر کی عورت کے issues ایک نہیں تو ایک جڑ سے ضرور ہیں۔ ایک تاریخ کے مطابق دنیا میں کب عورت کی حکمرانی تھی۔ اور پھر کب مرد کی حکمرانی اور عورت کی پسپائی شروع ہوئی اور آج تک ہوتی چلی آئی۔ عورت کو میں نے طبقہ کہا صنف نہیں کیونکہ صنف ہونے میں اس کا اپنا کوئی شعوری دخل نہیں۔ جبکہ طبقہ ہونے میں مردوں کا' اس کا اپنا اور پورے نظام کا دخل ہے۔ اس طبقے کے پسماندہ ہونے کا دکھ ہی میری شاعری کا دکھ ہے۔ بلکہ درد دکھ یہ کہ افرادی طور پر مردوں سے زیادہ ہونے کے باوجود اکیلی اور بے اختیار ہے۔ معاشرے کا جبر انہیں جینے نہیں دیتا۔ اس کے اندر کا صبر اسے مرنے نہیں دیتا۔ اگرچہ اس کی طاقت ہی سے یہ معاشرے قائم ہیں وہ ہر جگہ بالاتر ہے۔ محبت میں بھی مشقت میں بھی۔

اس معاشرے میں عورت کتنی بھی آزاد ہو معاشرے کی دیکھی ان دیکھی قدروں کی یرغمال ہے۔ میں بھی اسی معاشرے کی دین ہوں کتنی بھی سچ کی صورتیں دیکھی ہوں گی۔ انہیں سے شاید کوئی ایک ہی بتا سکی ہوں گی کیونکہ پھر لوٹ کے گھر جانا ہے۔ اور گھر ابھی ہمارے قابل نہیں ہوئے۔ ہماری عورت آدھا

انسان ہے اور آدھا جانور۔ سنگر سلائی مشین پر بنی ہوئی عورت دیکھ کر میرا شک یقین میں بدل جاتا ہے کہ ہاں واقعی عورت آدھا انسان اور آدھا جانور رہی ہو گی۔ کبھی آدھی مچھلی آدھی عورت کبھی پروں والی پری کبھی دس ہاتھوں دس سروں والی کالی دیوی۔ کتنے روپ دکھائے۔ مگر اصل عورت نہ دکھائی۔ اصل عورت ہمارے اندر بیٹھ کر آنکھوں کے جھروکوں سے اپنی نقلی شکلیں نقلی روپ اور ڈرا ہوا سراپا دیکھتی برداشت کرتی اور بیت جاتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ سچ نہیں مگر سچ کے سوا بھی نہیں۔ اُس کا سچ یہی ہے جتنا وہ جھیل جائے جتنا وہ بول جائے۔ اس معاشرے میں عورت کا سچ مرد کا جھوٹ ہے۔ کہیں گے تو اگلا دن نہیں چڑھے گا۔ میں نے اپنی نظموں میں، سچ بولنے اور محسوس کرنے کی صرف خواہش کی ہے۔ سچ نہیں بولا۔ میری مضبوطیاں ان کے ساتھ ہیں جو کھل کر سچ بولتی ہیں۔ شکر ہے کہ کوئی اپنا اظہار ہی کر پائے کجا کہ مکمل طور پر کوئی اپنا اظہار کر پائے ہاں میری طاقت اور خواہش یہی ہے کہ میں جو محسوس کروں لکھ لکھ کر ہوائیں رنگ ڈالوں۔

سوال ۲: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری معاشرے کی سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی جہات پر کس طرح اثر انداز ہوئی۔ کیا وہ اس سلسلے میں کوئی شعور پیدا کر سکی؟

جواب: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری جب گل وبلبل کے مضامین سے نکلی اور اپنے سامنے کھڑے مسائل کو face کرنے لگی تو یقیناً اس نے اپنے چاروں اطراف کو آنکھیں بخشیں اور سماج کو بدلا۔ کہیں دبا دبا احتجاج کہیں صرف رونا۔ کہیں فیشن کا سہارا لے کر دقیانوسی ماحول کو توڑنا کہیں اپنے talent اور ذہانت سے مشکل پیشوں کو اپنانا اور انہیں اپنا تجربہ اور برتری ثابت کرنا۔ کہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر کے اپنا مؤقف حاصل کرنا کہیں وزیراعظم کی کرسی تک پہنچنا۔ یہ سب نازک احساس کی مالک باشعور لکھنے والوں کے بتائے ہوئے۔ اور سمجھائے ہوئے راستے ہیں جو آج کی عورت گرتے پڑتے اپنا رہی ہے۔ وہ ثابت کر رہی ہے کہ مرد مجازی خدا نہیں۔ مجازی انسان ہے۔ حقیقی ساتھی ہے

اسے ویسا ہی بن کر رہنا چاہیے جیسا وہ عورت سے چاہتا ہے۔ یہی عورت کا خواب وخواہش ہے۔ جو جنت اس کے پاؤں کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ اسے وہاں سے نکال کر اس زمیں پر رکھ کر دیکھنا چاہتی ہے۔ اسے جینا چاہتی ہے۔ عورت آبادی کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ سوچ اور عمل کے حساب سے بھی مرد کے برابر ہے۔ یہ شعور اسے ہے اور وہ اپنی تحریروں سے اجاگر کر رہی ہے۔ میں نے پنجابی مجموعہ ''نیل کرائیاں نیکلاں'' میں بیٹیوں کی وار یعنی epic لکھی ہے۔ جس میں ذاتوں اور رشتوں میں بٹا ہوا معاشرہ اپنی بیٹیوں کی طرح برتاؤ کرتا ہے۔ بیٹیوں کے پیدا ہونے پر رونے والے گھرانے اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں عورت لوک دانائی کی بنیاد ہے۔ اسی لیے لوک ادب کی بھی موجد ہے۔ لوری سے لے کر سہاگ اور شاہانے گانے والی بابل اور بین تخلیق کرنے والی۔ محبوب کے وصل اور جدائی کے گیت جوڑنے والی عورت ہی تو ہے۔ میں نے اپنی نظموں میں عورت کو ہیرو کہا ہے۔ ایک مثال ہے:

میں رب بھوئیں تے لاہ لیا
تے مرزا رکھیا ناں

خواتین کی شاعری نے دیگر اصناف فن کو بھی متاثر کیا ہے۔ مصوری میں جو خواتین سامنے آئیں۔ انہوں نے خواتین کے مسائل ان کی زندگی کو موضوع بنایا۔ گلوکاراؤں نے شاعری بھی کی اور اسے گایا بھی۔ یہاں تلک کہ آج World Social Form کا موضوعی گیت اقبال بانو کی آواز میں چنا گیا ہے۔ تخت گرائے جائیں گے۔ جو فیض احمد فیض کی نظم ہے۔
خواتین رقاصوں نے رقص کو بھی جلا بخشی اور نئے موضوعات پر کوریوگرافی کی۔ تھیٹر اور ساتھ آرٹ فلم کی حد تک سمجھا اور ادا کیا۔ اس طرح خواتین کی شاعری زندگی کی تمام جہات پر اثر انداز ہوتی ہے۔
سوال ۳ میڈیا کے حوالے سے عورت کا تصور اصغری خانم یعنی سیاہ و سفید سے آگے بڑھ

پایا یا نہیں؟

جواب: پاکستانی میڈیا پر ابھی تک حکومتی پالیسیوں کا رواج ہے۔ جو یقیناً بہت حد تک مذہبی ہیں اور بہت حد تک معاشرتی ہے۔ ہمارا ملک مذہبی معاشرے کا ملک ہے۔ کسی اور مذہب کی عورت اگر کوئی رقص کرتی ہے تو سمجھا جاتا ہے ان کے مذہب میں جائز ہے۔ اگر کوئی شراب نوشی کرتا ہے تو کہا جاتا ہے ان کے ہاں یہ جائز ہے۔ اگر کوئی مسلمان شریف گھرانے کی بچی گانا گانے کا شوق کرلے تو گھر کے آخری کمرے میں جا کر ریاض کرے تاکہ محلے والے سن نہ لیں۔ معاشرے کا خوف معاشرے کا جبر ہمارے اپنے اندر کا خوف ہے۔ مولوی کا خوف ہے۔ یہ مولوی ہمارے باپ بھی ہیں۔ بھائی بھی شوہر بھی۔ چنانچہ ہم اپنی فلم اور ڈرامے اور ادب کو ان حدوں میں رکھ کر لکھتے اور بناتے ہیں جو خاندان کے تمام افراد اکٹھے بیٹھ کر دیکھ سکیں۔ ہمارے ہاں عورت کا تصور اسی حد تک آگے بڑھ پایا ہے imlementation کی حد تک۔ لکھنے اور سوچنے میں کوئی قباحت نہیں۔ ویسے modern ہونا ترقی پسند ہونا اور fashionable ہونا ہمارے ہاں ابھی تک clear concept کے ساتھ نہیں آئے۔ اسی لحاظ سے عورت کا تصور بھی آگے بڑھا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اس میدان میں کوشش نہیں ہوئی لیکن بہت کم۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، نورالہدیٰ شاہ۔ عطیہ داؤد۔ عذرا عباس۔ سارا شگفتہ جیسی روشن آنکھیں بھی ہمارے پاس ہیں۔ آنے والے دنوں میں ان سے بہت ساری امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

سوال ۴: عورت کے issues نظم یا غزل کس صورت میں بہتر طریق پر اظہار پاتے ہیں؟

جواب: عورت کے issues منظوم شکل میں نظم کی صورت میں بہتر طریق پر اظہار پاتے ہیں۔

سوال ۵: عورت کے issues کے اظہار کے لیے شاعری کے جمالیاتی پہلو کو آپ کتنی اہمیت دیتی ہیں؟

جواب: شاعری میں اس کا جمالیاتی پہلو بہر حال اس کی poetic sensibility میں پنہاں

ہوتا ہے۔ شاعری کا سچ ہی اس کی خوبصورتی ہوتی ہے۔ جذبے اور احساس کی نرمی اور نزاکت بڑی سے بڑی تلخ حقیقت کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔ شاعری سے شاعری کا جمال منہا نہیں کیا جا سکتا۔ عورت خود شاعری کرے یا شاعری کا موضوع ہو وہ کسی صورت میں بھی crude نہیں ہو سکتی۔ یہی شاعری کا کمال ہے اور جمال بھی۔ یہی شاعری ہے باقی غیر از شاعری۔

سوال ٦: مزید کوئی نکتہ۔ کوئی بات۔ کوئی تجویز؟

جواب: کوئی نہیں۔

یاسمین حمید

شاعرہ۔لاہور

انٹرویور۔شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟
سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟
سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے مجموعی طور پر ہمارے معاشرے پر کوئی اثرات مرتب کیے ہیں؟
سوال ۴: خواتین کے ایشوز اور شاعری کے حوالے سے آپ نے جو کچھ بھی کام کیا کیا آپ اس سے مطمئن ہیں۔ کیا آپ اپنا اظہار مکمل طور پر کر پائی ہیں؟

جواب قیام پاکستان سے پہلے خواتین کی اردو ادب میں موجودگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک دو نام شاعری میں اور چند نام نثر میں۔ جن میں قابل ذکر خواتین کے نام ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ادا جعفری اور ان کے بعد کی شاعرات کی روداد تو پاکستان بننے کے بعد ہی کی ہے اور سب جانتے ہیں کہ اک قلیل عرصے میں خواتین نے بہت بھرپور طریقے سے ادبی تخلیقی منظر نامے کو
ایک نئے اور مختلف قسم کے شعور میں گندھی ہوئی شاعری سے متعارف کرایا' مختلف حسیت' مختلف موضوعات' مختلف تجربات اور اسالیب شاعری کو دیے اگر پچھلے پچپن برس میں منظرِ عام پر آنے والی اہم اور قابل ذکر شاعرات کے کلام کو یکجا کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ contribution کتنا وقیع ہے۔

پچھلے دس برس میں شعر کہنے والی خواتین کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے مگر یہ بات بھی صحیح ہے کہ ان میں سے بیشتر معیاری ادب تخلیق نہیں کر رہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے تعداد میں مرد لکھنے والے بھی بہت ہیں لیکن غیر معیاری تخلیقات سے کتابیں اور رسالے بھرے پڑے ہیں۔

جہاں تک معاشرے پر شاعری کے impact کی بات ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ آج کا زمانہ ادب یا arts کا زمانہ نہیں رہا۔ نئی نسل کا رجحان سائنس اور اقتصادیات یا معاشیات کی طرف زیادہ ہے۔ تعلیمی ادارے بھی grade oriented اور profession oriented تعلیم ہی کو ترجیح دے رہے ہیں اس لیے کہ اس کی مانگ ہے۔ بیسویں صدی کے وسط سے پہلے کے تمام زمانے مذاہب اور liberal arts کی کشاکش کے زمانے تھے۔ فلسفہ ادب اور تاریخ علمی ترجیحات کی اولین سطح پر تھے۔ صنعتی انقلاب کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک دنیا لبرل آرٹ کی طرف راغب رہی۔ علم برائے معاشی حصول کے زمانے تک آتے آتے بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ پچھلے تیس برس میں اس عمل کی رفتار تیز تر رہی ہے جیسے باقی تمام دنیا اس عمل کے زیرِ اثر ایک نئی نہج پر چلنے لگی ہے اسی طرح ہمارا معاشرہ بھی متاثر ہوا ہے۔ ترقی یافتہ معاشروں میں پھر بھی یہ ممکن ہے کہ جن ذہنوں کا فطری جھکاؤ arts کی طرف ہے وہ ان علوم کی اعلیٰ تحصیل کی طرف متوجہ ہو سکیں لیکن کم ترقی یافتہ اور غریب ممالک میں معاشیات کے بھوت نے ایسے امکانات کو بہت کم کر دیا ہے بلکہ تقریباً ختم کر کے رکھ دیا ہے۔

اس طرح کی صورت حال میں شاعری کا impact معاشرے پہ اس طرح ہو جیسے اس کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ میرے خیال میں مشکل ہے۔

ہمارے معاشرے میں ایک اور چیز جس کا فقدان مجھ جیسے اور بھی لوگ شاید محسوس کر رہے ہوں وہ ہے معیار کی پستی، ہر سطح پر، ہر شعبے میں خواہ وہ علمی ہو یا غیر علمی۔ یہ آج کے تمام کم ترقی یافتہ معاشروں کا المیہ ہے۔

ایک انتہائی اہم بات یہ بھی ہے کہ جس معاشرے میں شعوری خواندگی تو کیا اپنا نام

تک لکھنے والوں کی شرح اسقدر کم ہو وہاں ادب اور پھر شاعری کی طرف بھلا کیسے کوئی متوجہ ہوگا۔ ہم اس صورت حال کی نشاندہی تو کرتے رہتے ہیں لیکن اس کو سدھارنے کی تدابیر پر عمل کرنے یا ان سے مثبت نتائج برآمد کرنے میں ابھی کامیاب نہیں ہو سکے۔

ایک اور سطح پہ غور کیا جائے تو یہ معاملہ اتنا سیدھا سادہ بھی نہیں کہ اس کا یک سطحی جواب دے دیا جائے اور بس۔ کسی بھی art form کا مسئلہ بہت گنجلک ہے۔ حالات کے ناموافق ہونے کے باوجود جس کو تخلیقی سطح پر کام کرنا ہے وہ ضرور کرے گا۔ اس قسم کے حالات میں تخلیق کاروں کی دو اقسام سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جو اسطرح کی صورتِ حال کا استحصال کر سکتے ہیں اور اس سے زیادہ سے زیادہ دنیاوی یا مادی سطح پہ فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور جس طرف تمام تر دنیا خوش باش' رواں دواں ہے اس کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے ہیں۔ ان میں بعض ادبی سطحی پہ بھی کامیاب رہتے ہیں اور بعض کہیں کے بھی نہیں رہتے۔ دوسری قسم ان ادیبوں' شاعروں کی ہے جو خاموشی سے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ان میں بعض حالات کی زیادتی سے زچ رہتے ہیں' بعض اس منزل سے آگے نکل جاتے ہیں لیکن وقت بہر حال کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرتا رہتا ہے۔ کم سے
کم اب تک تو یہی دیکھنے میں آتا رہا ہے۔

میں یہ کہہ رہی تھی کہ آرٹ کا معاملہ بہت گنجلک ہے یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس سے کسی ایسے فائدے کی توقع کی جا سکے۔ جو کسی ٹھوس یا مادی شکل میں دیکھا جا سکے۔ یہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں جس کے اثرات ایسے ہوں کہ نتائج فوری طور پر برآمد ہو جائیں۔ نہ آرٹ کے تاثر کو چھوا جا سکتا ہے نہ اس کے نتائج کو پرکھنے کے لیے کوئی لگا بندھا پیمانہ ہی بنایا جا سکتا ہے۔ چند ایک مثالوں سے مستثنیٰ یہ تو ایک process ہے جو سال بہ سال' صدی بہ صدی چلتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر جب پہلے آنیوالے باقی نہین رہتے تب بعد میں آنیوالے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں اور ادبی تاریخ کا تجزیہ کر کے طے کرتے ہیں کہ کس نے کیا کیا۔ وہ معاشرہ کیسا تھا جس میں ایک مخصوص

طرح کا ادب تخلیق ہوا۔ تاریخی، معاشرتی سیاسی واقعات سے کوئی تخلیق کار خود کتنا متاثر ہوا اور اس کی اپنی کاوشیں وقت سے کس طرح ہمکلام ہوئیں۔

Ezra Pound نے ایک بات کہی تھی جو مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''آرٹ کبھی بھی کسی شخص سے کچھ کرنے یا کچھ سوچنے یا کچھ بننے کے لیے نہیں کہتا ہے۔ یہ زندہ رہتا ہے جیسے اشجار زندہ رہتے ہیں۔ اس پر ہم اظہارِ حیرت کر سکتے ہیں 'اس کے سائے میں بیٹھ سکتے ہیں''۔

Eliot نے کہا ہے کہ ''آرٹ کے ذریعے آرٹ سے ماورا مقاصد بھی پورے کیے جا سکتے ہیں لیکن ان مقاصد کو فنکار ان سے بے تعلق رہ کر زیادہ بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے''

حسن عسکری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''تخلیق ایسی دہشت ناک چیز ہے کہ اگر تخلیق کار اسے کھیل نہ سمجھے تو اس کے قریب بھی نہ جائے''۔

میرے خیال میں آرٹ معاملات کو طے نہیں کرتا۔ اس کے بہت سے defined مقاصد میں سے شاید یہ ایک مقصد ضرور ہو مگر آرٹ اپنے آپ میں اور خصوصاً شاعری اس مقصد سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ کہیں زیادہ پھیلاؤ رکھتی ہے اور اسے ایک مرکز پہ سمیٹ لینے کی کاوش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اب اگر وہیں پلٹ کر آئیں جہاں سے بات شروع ہوئی تھی تو مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں خواتین نے بڑا ادب تخلیق کیا ہے۔ نثر میں بھی اور شاعری میں بھی۔ یہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بھی ہے اور کہیں کہیں ان سے آگے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ عورت اب ذہنی طور پر پابند نہیں ہے۔ وہ جو سوچتی ہے، جس طرح سوچتی ہے اسے بیان کرتی ہے۔ عورت نے جو کچھ لکھا اس کا impact اردو ادب پر ضرور ہوا ہے اور اردو ادب کے قارئین پر بھی جن کی تعداد بدقسمتی سے روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے تو میں خود اپنے کام سے کبھی بھی مطمئن نہیں ہوتی۔ لیکن اس سوال کے حوالے سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ مجھے اس بات کا اطمینان ضرور ہے کہ میں نے جو بھی کہا، جیسا بھی کہا وہ خالصتاً original ہے۔ میں نے اپنی بات کہی ہے اور بغیر کسی ذہنی پابندی کے کہی ہے۔

عظمیٰ گیلانی

آرٹسٹ

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: تعلیم، بچوں کی پرورش اوران کی تعلیم وتربیت۔

سوال ۲: کیاان مسائل کوحل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: ایک کتاب 'لاتعداد عورتوں کے مسائل پر ڈرامے۔

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے مجموعی طور پر ہمارے معاشرے پر کوئی اثرات مرتب کیے ہیں؟

جواب: ہاں electronic میڈیا، ریڈیو، ٹی۔وی۔فلم پر۔

سوال ۴: آپ کے خیال میں خواتین کی زندگی کا کون سا ایسا شعبہ ہے جس میں اس شاعری کے حوالے سے شعور بیدار ہوا اور آگاہی پیدا ہوئی یعنی سماجی، اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی کس اعتبار سے؟

جواب: خواتین کی شاعری نے بہت زیادہ کردار ادا کیا ہے۔ لیکن شہری مڈل کلاس عورتوں کے لیے۔ دیہی خواتین بدنصیبی سے جہالت کی وجہ سے مستفیض نہیں ہو پائی ہیں۔

شبنم شکیل

شاعرہ

انٹرویور۔ خالدہ حسین

سوال ا: شاعری کے حوالے سے خواتین کے ایشوز (issues) کے لئے آپ نے جو کچھ بھی کام کیا کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

جواب: میں بالکل مطمئن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنا وقت شاعری کو دینا چاہیے تھا میں دے نہیں پائی اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ میری پچھلے سات برس کی لکھی ہوئی غزلیں اور نظمیں اپنے شائع ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔ البتہ میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ میں نے جو کچھ بھی لکھا خلوصِ دل سے لکھا ہے اور پوری کوشش کی ہے کہ میری شاعری میں مبالغہ یا جھوٹ کی کم سے کم آمیزش ہو۔ میرے ایسے اشعار جن کا تعلق براہِ راست عورت کی ذات سے تھا۔ انہیں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس کی وجہ میرے اظہار کا انداز تھا۔ میں نے کوشش نہیں کی بلکہ خود بخود جو کچھ بھی کہا دھیمے لہجے میں کہا اور اپنی شاعری کو نعرہ بننے سے بچایا۔ بہر حال میرا کام جاری ہے۔ میں اس وقت زندگی کی اس سٹیج پر ہوں کہ جہاں زندگی غور کرنے والے پر اپنے آپ
کو منکشف کر دیتی ہے۔ مجھ پر بھی زندگی نے یہ مہربانی کی ہے چنانچہ اب جو کچھ بھی لکھ رہی ہوں اس میں میرے کچھ روحانی تجربے بھی شامل ہیں۔

سوال نمبر۲: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری معاشرے کی سماجی' اقتصادی' تہذیبی و سیاسی جہات پر کس طرح اثر انداز ہوئی؟ کیا وہ اس سلسلے میں کوئی شعور بیدار کر سکی ہے؟

جواب: اردو ادب پر سرسید کی تحریک کے بعد جو تحریک سب سے زیادہ معاشرے کی سماجی' تہذیبی' اقتصادی اور سیاسی جہات پر اثر انداز ہوئی وہ ترقی پسند تحریک تھی۔ حقیقتاً

اس نے ہمارے معاشرے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ خواتین کی وہ شاعری جسے ادبی حلقوں میں اور عوام میں پذیرائی حاصل ہوئی وہ یقیناً اسی تحریک کے زیرِ اثر ہے۔ یعنی خواتین کی وہ شاعری جس میں جرأت، صداقت اور حقیقت نگاری سے کام لیا گیا تھا اس نے لوگوں کے ذہنوں تک رسائی حاصل کی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم کا تناسب بہت کم ہے اس لیے شاعری پڑھنے والے بھی کم ہی ہیں۔ ہماری پچاس فیصد آبادی جو دیہاتوں میں آباد ہے وہ کتاب سے بہت کم آشنا ہے۔ ہمیشہ سے ہمارا متوسط طبقہ اور کبھی کبھی بالائی طبقہ بھی ادب میں دلچسپی لیتا رہا ہے اور سچ پوچھیے تو ہر تحریک متوسط طبقے سے ہی شروع ہوتی ہے یہیں پروان چڑھتی ہے اور پھر باقی طبقوں میں پھیلتی ہے۔ سو اس حوالے سے میرے دل کو اطمینان ہے کہ خواتین کی شاعری بھی کسی حد تک ہمارے متوسط طبقے کو بہت سے حوالوں سے بیدار اور آگاہ کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔ شاعری ہو یا دوسرے فنونِ لطیفہ ہوں ان کا اثر پڑھنے والے پر ڈائریکٹ نہیں ہوا کرتا۔ لاشعوری طور پر بتدریج آہستہ آہستہ ذہنوں پر اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وہ یقیناً ہو رہے ہیں۔

سوال نمبر ۳: میڈیا کے حوالے سے (اخبارات، ٹی وی، ریڈیو، فلم) عورت کا تصور اصغری خانم، یعنی سیاہ وسفید سے آگے بڑھ پایا ہے یا نہیں؟

جواب: جی بالکل کسی حد تک ہمارے میڈیا نے بھی عورت کے امیج کو اس کے صحیح تناظر میں پیش کرنے کی کوشش شروع کی ہوئی ہے۔ جیسے جیسے ذرائع ابلاغ بڑھتے جا رہے ہیں اور دنیا ایک گلوبل ویلج میں تبدیل ہو رہی ہے لوگوں کے ذہنوں میں عورت کا شعور بھی اب سو سال پرانا نہیں رہا۔ آج کی عورت جو پڑھی لکھی ہے باشعور ہے یا معاشی طور پر بھی خود کفیل ہے۔ وہ اس عورت سے قدرے مختلف ہے جو آج سے پچاس یا سو سال پہلے کی عورت تھی۔ اور اس امیج کو بدلنے میں لکھنے والوں کی بہت contribution ہے کیونکہ میڈیا پر بھی پیش ہونے والی ہر چیز کی بنیاد لکھا ہوا لفظ ہوتا ہے البتہ ایک چیز کا افسوس ہے کہ بعض اوقات ہمارا پرنٹ میڈیا محض سنسنی خیزی

کے لیے عورت کے حوالے سے ایسی خبریں بھی بڑھا چڑھا کر شائع کرتا ہے جن میں عورت کا وقار مجروح ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ میرے خیال میں ہمارے میڈیا کے تمام ذرائع کو اپنے اندر ایک مثبت تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ اور عورت کے حوالے سے تو خاص طور پر مثبت اور تعمیری سوچ کو سامنے لانا چاہیے۔

سوال نمبر ۴: عورت کے ایشوز (issues) نظم (براہِ راست) یا غزل (استعارہ) کس صورت میں بہتر طریق پر اظہار پاتے ہیں؟

جواب: جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں شاعری کوئی ایسی چیز نہیں جو فوری طور پر آپ کے ذہن میں کوئی بہت بڑی تبدیلی لا سکے۔ شاعری کا اثر آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ کبھی تو نظم میں ایسی بات کہہ دی جاتی ہے لگتا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ غزل کا ایک شعر پچاس نظموں پر بھاری پڑ جاتا ہے۔ اس لیے فارم یا ہیئت یہاں پر اتنی اہمیت نہیں رکھتے اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ کہا گیا وہ کیا تھا اور کس انداز میں کہا گیا تھا۔

سوال نمبر ۵: عورت کے ایشوز (issues) کے اظہار کے لیے شاعری کے جمالیاتی پہلو کو آپ کتنی اہمیت دیتی ہیں؟

جواب: احساسِ جمال کے بغیر تو کسی بھی فن پارے کو مکمل نہیں کہا جا سکے گا۔ یہاں بھی میں یہ کہوں گی کہ تمام فنونِ لطیفہ میں بنیادی چیز خیال اور اس کا جمالیاتی پہلو ہے۔ جب ہم بات کرتے ہیں تو محض لفظوں کے انتخاب سے پورے جملے کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ یہ حال شاعری کا بھی ہے۔ اس میں بھی جب تک حسن اور تناسب کا خیال نہیں رکھا جائے گا شاعری ذہن پر اچھا اثر نہیں ڈالے گی۔ شاعری' افسانہ' ڈرامہ اور ناول تو خیر ہوئے اگر نقاد میں بھی ذوقِ سلیم کی کمی محسوس ہو تو اس کی تنقید کئی حوالوں سے نامکمل سمجھی جائے گی۔ شاعری کوئی صحافت نہیں ہے کہ آپ نے جو دیکھا بیان کر دیا۔ اس میں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ بیان کرنا کیسے ہے۔ میرا ایک شعر ہے۔

شاعر ہیں یہ سوچنا ہو گا کیسے سب کچھ کہنا ہے
دل کی بات لبوں تک لانے میں کچھ وقت لگے گا

شاہدہ حسن
شاعرہ۔ کراچی

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے issues پر جو کچھ کام کیا ہے۔ کیا آپ اس سے مطمئن ہیں اور اظہار مکمل طور پر کر پائی ہیں؟

جواب: میں نے خواتین کے issues کو موضوع بنا کر براہِ راست نہیں لکھا۔ مگر میرا vision بہر حال اس عہد کی ایک حساس اور باشعور عورت ہی کا vision ہے۔ اس اعتبار سے میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی ذاتی اور سماجی زندگی کے تعلق سے جو فکری تبدیلیاں اپنے آپ میں محسوس کیں اس سے زندگی کے بارے میں میرا ایک نقطۂ نظر سامنے آیا ہے۔ اسے میں نے اپنی شعری لفظیات میں بیان کیا ہے آپ اسے میرے طرزِ احساس کے طور پر محسوس کر سکتی ہیں۔ دراصل تخلیقی اظہار کی کوئی طے شدہ صورت نہیں ہوتی۔ یہ اپنی کلیت میں اسی شعور کا احساس دلاتا ہے جو کسی ذہن کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔ میری شاعری میں بھی میری بڑھتی ہوئی زندگی کے بہت سے تجربات شامل ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں اور جس عہد میں، میں جی رہی ہوں اس کی سماجی او رفکری زندگی کے مظاہر کی عکاسی بھی موجود ہے۔

سوال ۲: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری، ہماری سماجی، تہذیبی سیاسی اور اقتصادی جہات پر کس طرح اثر انداز ہوئی ہے۔ کیا وہ اس سلسلے میں کوئی شعور بیدار کر سکی ہے؟

جواب: اثر انداز تو یقیناً ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ یہ فرد اور سماج کے لیے ایک ذہنی تبدیلی کی نقیب ہوتی ہے۔ لیکن اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہمیں خواتین کی تحریروں کے سنجیدہ اور مربوط مطالعے کی اشد ضرورت ہوگی۔ ہمارے یہاں ایسے مطالعوں کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے اور نہ ہمارے نقاد اور دانش ور حضرات اس رجحان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اب خواتین خود اس طرف توجہ دے رہی ہیں کہ ان تحریروں کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ خواتین لکھنے والیوں نے قدیم زمانوں سے لے کر آج تک' ہمیشہ اپنے محسوسات کا اظہار کیا ہے۔ اس اظہار میں اس عہد کی معاشرتی' سیاسی' معاشی اور فکری زندگی کے بہت سے عکس موجود ہیں۔ قدیم یونان کی شاعرہ سیفو کی تخلیقات ہوں یا تین ساڑھے تین ہزار سال قبل کے شمالی ہند کی لکھنے والیوں کے شعری نمونے یا طلوع اسلام کے ابتدائی دنوں میں علم وادب کے چراغ جلانے والی عورتیں یا بدھ مذہب کی راہبات کی تحریریں۔ تاریخ کے صفحات پلٹتے جایئے۔ اندازہ ہوتا رہے گا کہ عورتوں کے قلم سے مشرق اور مغرب دونوں معاشروں میں' ایسی تحریریں مسلسل پیش کی گئی ہیں جو اپنے معاشرے کی عکاس تھیں۔ اردو ادب میں بھی باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے نسوانی کردار' ہمارے ہی معاشرے کے کردار ہیں اردو کے قدیم تمثیلی قصوں اور ناولوں میں بھی ان نسوانی کرداروں کے توسط سے' ہمیں عورتوں کی تعلیم کے مسئلے اور مسلمان عورتوں کے رسوم ورواج کی قیود کو سمجھنے میں مدد ملی۔ تو اس طرح ان سارے مسائل کے بارے میں شعور و آگہی پیدا ہوئی۔

سوال ۳: میڈیا کے حوالے سے فلم' ٹی وی' ریڈیو' عورت کا تصور آگے بڑھانے میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب: ہمارا سرکاری میڈیا تو وہیں کا وہیں ہے۔ وہ اپنے قیود و ضوابط کا پابند رہتا ہے۔ زیادہ تر عورت کا وہی تصور پیش کرتا ہے جو ہمارے اس منجمد روایتی شکنجوں میں جکڑے ہوئے معاشرہ کے ذہن میں پہلے سے طے شدہ ہے۔ یعنی بے شعور'

مظلوم اور اُفتادہ عورت۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا بھر میں اطلاعاتی انقلاب کی بدولت ہم اپنے ریموٹ کا بٹن دباتے ہی کسی بھی چینل سے connect ہو سکتے ہیں۔ اس لیے دنیا بھر میں آزادی اظہار کے حوالے سے جو نت نئے رنگ نمایاں ہو رہے ہیں اس سے ہم غافل نہیں رہ سکتے۔ مغربی معاشروں میں میڈیا' عورت کو جس طرح پیش کر رہا ہے میں سمجھتی ہوں اس میں بیک وقت بے حد منفی اور بے حد مثبت دونوں تصورات موجود ہیں۔ ایک طرف جدید عورت کا یہ روپ دکھایا جاتا ہے کہ وہ عہد حاضر کی دانش مندانہ روایات کی امین' باشعور اور باصلاحیت عورت ہے جو بغاوت' احتجاج اور غصے کے مراحل طے کرنے کے بعد اب عملی میدان میں قدم رکھ چکی ہے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ روپ بھی خوب اچھالا جاتا ہے جس میں وہ محض ایک نمائشی شے کے طور پر پیش کی جاتی ہے تو یہ دونوں تصورات ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ دیکھیں ہم اب کس تصور کو پذیرائی دیتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں پاکستانی معاشرہ میں اب ہماری باصلاحیت عورتوں کو اپنے غیر روایتی اور فعال کردار کی ادائیگی پر بھرپور اصرار کرنا چاہیے۔ اور اپنی تحریروں کے ذریعے اس تصور کو پوری قوت سے آگے بھی بڑھانا چاہیے۔

سوال ۴: عورت کے حوالے سے کوئی نظم یا غزل____

جواب میرے دوسرے مجموعے ''یہاں کچھ پھول رکھے ہیں'' میں شامل یہ کلام:

نظم

عنوان: تمہارے ساتھ رہنا ہے

بہت سے رنگ ہیں میرے

ہمیشہ خوب صورت

اور تر و تازہ

جنہیں تم چھو نہیں سکتے

بہت سی بارشیں ہوتی ہیں مجھ میں
جن کی آوازیں
کبھی تم سن نہیں سکتے

بہت سے خواب ہیں
خوش رنگ یادوں سے بھرے رستوں پہ
چل کے جو
مری آنکھوں تک آتے ہیں
مگر تم ان کی آہٹ کو
نہیں محسوس کر سکتے

بہت سے غم ہیں
جو کروٹ بدلتی رات کے
پہلو سے لگ کر مسکراتے ہیں
مگر اس مسکراہٹ کی خبر

تم کو نہیں ہوتی

یہ دُوری ہے۔ ہمیشہ سے
جسے شاید
مسلسل مجھ کو سہنا ہے
مگر پھر بھی ــــ تمہارے ساتھ رہنا ہے

(اپنی ہم زاد کے لیے)

امریکی عورت کے نام تازہ تر احساس کے ساتھ

مری ہم زاد!
یہ آواز کیسی ہے
سماعت سے پرے
احساس میں چبھتی ___
پرانی زنگ آلودہ کسی زنجیر کی
آواز ہے شاید
تمہارے اور مرے پاؤں سے لپٹی
___ ہلاکت کی وہی زنجیرِ تنہائی
سویرے سے اندھیری شام تک
میں نے بھی جس کو بارہا
خود اپنے گھر آنگن میں کھینچا ہے
کبھی گھر سے نکل کر
دھول اُڑاتے'
دھوپ اوڑھے راستوں میں
کارخانوں' دفتروں میں
سارے ایوانِ مشقت میں
مرے قدموں سے
چہرے سے
مرے عہدوں سے
منصب سے
مری ہر سوچ سے
ساری اُڑانوں

خواہشوں، خوابوں سے
سارے فیصلوں سے
کتنے قرنوں کی یہی زنجیر لپٹی ہے!!

یہ سوچا تھا
تمہارے شہرِ حیرت میں جب آؤں گی
تو دیکھوں گی
کہ تم اس آہنی زنجیر سے باہر
فضا میں کس طرح پرواز کرتی ہو؟
پرندوں کی طرح اب کیسے جیتی ہو

مگر یہ کیا!
تمہارے پاس آتے ہی
لہو پیتے زمانوں کے نظاموں کی
اُسی مانوس سی زنجیر کی آواز
پھر مجھ کو سنائی دے رہی ہے
ساحلی تفریح گاہوں پر
کسینو اور ریسلنگ رِنگ کے اندر
کبھی بنگو کلب کے شور میں
اور بار کی مدہوش شاموں میں

کبھی عریاں اشاروں
حُسن کی نیلامیوں کے اشتہاروں میں
مدر! ڈے اور فادر! ڈے پہ بُتی

بھیک جیسی
چند لمحوں کی محبت میں
بہت سے آنسوؤں کی
اُس ندامت میں
کسی بھی (talk show) ''ٹاک شو'' میں جو
کنواری ماؤں کی آنکھوں سے بہتے ہیں

مری ہم زاد!
یہ تنہائی کی زنجیر کیسی ہے
کہ اب تک کُھل نہیں پائی!!!

سوال ۵: عورت کے issues کے اظہار کے لیے شاعری کے جمالیاتی پہلو کی کتنی اہمیت ہے؟

جواب: عورت کے issues کو معاشرہ کے دیگر مسائل کی طرح ہی اہم سمجھنا چاہیے۔ اور اسے اپنے دور کی حسیّت کا لازمی جزو ہونا چاہیے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ان پر صرف عورت ہی لکھے۔ مرد کو بھی اس صورت حال پر قلم اٹھانا چاہیے۔ رہ گئی بات کہ اس اظہار میں جمالیاتی پہلو کی کیا اہمیت ہے تو میں سمجھتی ہوں بڑی اہمیت ہے۔ اور وہ یوں کہ اگر اسے تخلیقی ہنر مندی کے ساتھ برتا جائے گا تو اس کی ایک دائمی حیثیت قائم ہو سکے گی۔ ورنہ روزانہ اخبارات کے صفحات' ایسی چیزوں کے بھرے ہوتے ہیں۔ انہیں کون یاد رکھتا ہے۔ لیکن اگر یہی issues کسی مؤثر کہانی یا شاعری میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں تو ہمارے perception کا ایک لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔

پروفیسر آفتاب احمد

پرنسپل گورنمنٹ گرلز کالج جناح ٹاؤن۔ کوئٹہ (بلوچستان)

انٹرویور۔ بیگم ثریا اللہ دین

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: تعلیم و سماجی بہبود

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: جی ہاں۔ ۳۲ سال کی سروس میں تدریس تعلیم کے ساتھ طالبات کی اخلاقی، سماجی اور معاشرتی و معاشی مدد کے لیے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ الحمد للہ بہت کچھ دیا ہے ان شعبوں کو۔

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔ لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا۔ ریڈیو۔ ٹی۔ وی۔ فلم؟

جواب: خواتین کی شاعری نے میڈیا کو متاثر نہیں کیا۔ اپنے اپنے طور پر میڈیا کا ہر شعبہ خواتین کو نمائندگی دیتا ہے لیکن موثر ترین ٹی۔ وی اور کسی حد تک ریڈیو بھی اس عمل میں معاونت کر رہا ہے۔

سوال ۴: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب: جہاں تک عورت کے ذاتی تشخص کے منوانے اور انفرادی حیثیت کو تسلیم کرانے کی بات ہے۔اس کے لیے شاعر ہونا یا شاعری کا موضوع بننا نہ تو اہمیت رکھتا ہے اور نہ ایسا ہو رہا ہے۔ خواتین کی شاعری اتنا موثر کردار ادا نہیں کر رہی۔ کیونکہ چند شاعرات کو چھوڑ کر کسی نے بھی عورت سے متعلق موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا جس کے پیچھے یہی عمل کارفرما ہے کہ عورت کو معاشرہ کا فعال رکن تسلیم نہیں کیا جاتا اور عورت خود بھی اپنی حیثیت کو منوانے کی قوت نہیں رکھتی۔

سوال۵: کیا ہمارے تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی کم نہیں؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: خواتین شعراء کی نمائندگی ہے ہی نہیں۔ نہ میٹرک تک کے نصاب میں نہ انٹر میڈیٹ کی سطح پر۔

سوال۶: ہماری نوجوان نسل خاص طور پر طالبات پر یہ شاعری کیا اثرات مرتب کرسکتی ہے؟

جوب: اگر خواتین شعرا کی شاعری کو highlight کیا جائے تو ہماری نوجوان نسل ان کے کام کو آگے بڑھانے میں مؤثر کردار ادا کرسکتی ہے۔ کیونکہ اس نسل کا vision زیادہ وسیع ہے اور وہ ان خامیوں کو دور کرسکتی ہے۔

سوال۷: ہمارے معاشرے میں خواتین کا کون سا طبقہ شاعری سے زیادہ اثر لیتا ہے یا پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے؟

جواب: کوئی بھی نہیں۔

سوال۸: آپ کی رائے میں وہ کونسی شاعرات ہیں جنھوں نے خواتین کے مسائل کی صحیح طور پر عکاسی کی ہے؟

جواب: پروین شاکر۔ فہمیدہ ریاض۔ شبنم شکیل۔ ادا جعفری۔

سوال۹: آپ کے خیال میں شاعرات کی نثری نظم زیادہ مؤثر ہے یا پابند؟ غزل پر بھی اپنی رائے دیجیے۔

جواب: غزل کی طرف تو آج کی نسل متوجہ ہی نہیں ہے۔ چند شاعرات تو ہیں ٹرینڈ دینے والی ان کی غزلیات قابلِ تحسین ہیں۔ پابند نظم اور غزل مؤثر ذریعہ ہیں۔ نثری نظم سے بہتر ہے کہ بات نثر میں ادا کی جائے۔

سوال ۱۰: کیا مشاعرے اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب: نہیں۔ کیونکہ خواتین کی نمائندگی تعلقات کی بنا پر ہوتی ہے۔ خواتین مشاعرہ کا نیا رجحان چلا ہے۔ لیکن بھرتی کی شاعرات کی تعداد زیادہ ہے۔

سوال ۱۱: women's lib کی اصطلاح سے آپ کے ذہن میں کیا تصور ابھرتا ہے؟ کیا خواتین نے اپنی شاعری میں اس تحریک کے مقاصد کو اچھی طرح سے پیش کیا ہے؟

جواب: الفاظ و اشعار کی حد تک خواتین نے اپنے اپنے طور پر کہیں کہیں عورت کی آزادی کی جھلک دکھائی ہے۔ لیکن عملاً women's lib کے لیے کوئی کام نہیں ہوا۔ ایسی اصطلاح کا مطلب مغرب والی عورتوں کی آزادی نہیں بلکہ سماجی، ثقافتی رسم و رواج کی زنجیروں سے آزاد کرانا مقصود ہے۔

سوال ۱۲: کونسی شاعرات کے ہاں اس women's lib سے متعلق موضوعات کو سلیقے اور توازن سے پیش کیا گیا ہے؟

جواب: پروین شاکر۔ شبنم شکیل۔ ادا جعفری۔ ریحانہ روحی۔ ادا جعفری۔

سوال ۱۳: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خواتین کی شاعری ہمارے قانون دانوں کے ذہن پر مثبت طور پر اثر انداز ہو سکتی ہے؟

جواب: خواتین کی شاعری خود اپنے آپ کو مثبت انداز میں پیش نہیں کر سکتی تو قانون دانوں کو کیا متاثر کر سکے گی۔ آپ کے اس سوالنامہ کا مجموعی طور پر میرا جواب یہ ہے کہ نہ تو خواتین شاعرات نے اپنے آپ میں اپنے کلام کو مؤثر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے زیادہ تر صدائے بازگشت ہے اور نہ مردوں کے اس معاشرہ نے عورت کی شاعری کو قبول کیا ہے۔

مہتاب اکبر راشدی

دانشور

سیکرٹری انفارمیشن۔ سندھ

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: خواتین کے لیے میرے پیشِ نظر تعلیم کا حصول ہمیشہ ایک بنیادی issue رہا ہے۔ اب بھی ہمارے ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ جو خواتین پر مشتمل ہے۔ اس بنیادی حق سے محروم ہے۔ اس سلسلے میں کبھی رسم و رواج آڑے آ جاتے ہیں۔ کہیں وہ مرد کی تنگ نظری کا شکار ہو جاتی ہے اور کہیں مرد کی جہالت علم کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتی۔ لہٰذا میرے نزدیک یہ ایک سب سے بڑا issue ہے۔ اس سے بھی متعلقہ بہت سارے دوسرے معاملات اُٹھتے ہیں۔ جن میں خواتین کی اپنے حقوق سے واقفیت کم علمی کی وجہ سے بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھرپور کردار ادا نہ کرنا۔ مشکل حالات میں اچھے روزگار کا حصول معاشرے میں اپنے حقوق سے لاعلمی کی وجہ سے عدم اعتمادی کا شکار ہونا۔ باصلاحیت ہونے کے باوجود' مواقع نہ ملنا یا نظر انداز ہو جانا۔ یہ سب ایسے مسائل ہیں۔ جن کا شکار ہر طبقے کی عورت ہو رہی ہے۔ اور ان تمام مسائل سے ہی میری دلچسپی ہے۔ خاص طور پر اپنی زندگی کے متعلق اس کو خود فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہونا سب سے اہم مسئلہ ہے۔

سوال ۲: کیا خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنے کے حوالے سے آپ کی اپنی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: میں ایک عرصے تک ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے سندھی میں خواتین کا پروگرام "سگھڑین سَتھ" (group of friends) کی میزبان رہی۔ یہ آج سے بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس پروگرام کے ذریعے۔ سندھ کے دیہی علاقوں کی خواتین سے کافی رابطہ رہا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس پروگرام کے ذریعے ہم نے خواتین کو ان کے مسائل کو سمجھنے میں کافی مدد کی۔ ان کے خطوط سے ہمیں اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے اندر علم کے حصول کی لگن تھی۔ روزمرہ کے مسئلے مسائل بھی وہ ہمارے پروگرام میں لاتی تھیں۔ جنہیں ہم کچھ experts سے گفتگو کے دوران ان کے حل بتاتے تھے۔ اس کے علاوہ سندھ کی ایک بہت جانی پہچانی Sindh Graduate Association N.G.O کی میں ایک فعال رکن رہی ہوں۔ اور 1996 سے 2002ء تک اس کی خواتین شاخ کی صدر رہنے کے دوران، ہم نے women's economic empowerment پر کافی کام کیا۔ اس سلسلے میں سندھ کے کافی دور دراز علاقوں مثلاً ضلع لاڑکانہ، دادو اور کراچی کے suburbs میں نے خواتین کو skill development کی تربیت دے کر انہیں مارکیٹنگ سے بھی روشناس کروایا۔ اس طرح اب کافی خواتین گھر بیٹھے اپنا چھوٹا موٹا کاروبار کر رہی ہیں۔ ہماری یہ NGO اب بھی اس منصوبے میں کافی فعال ہے۔ اس کے علاوہ ٹی۔ وی۔ سیمینار اور ورکشاپس میں میری شرکت خواتین کے حقوق اور مسائل کے سلسلے میں، ایک مستقل سلسلہ ہے، جو جاری ہے۔

سوال ۳: کیا خواتین کا شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔ لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا، ریڈیو۔ ٹی وی۔ فلم؟

جواب: مجھے میڈیا پر خواتین کی شاعری کا کوئی خاص اثر تو نہیں محسوس ہوتا۔ کبھی کبھار کوئی انفرادی حوالے تو مل جاتے ہیں۔ ورنہ خواتین کی شاعری کو اُجاگر کرنے کی کوئی

شعوری کوششیں نہیں ملتیں۔ کبھی کبھار پروین شاکر زہرہ نگاہ اور ادا جعفری کی کوئی ایک آدھ غزل نظم آ گئی، یا کبھی کسی ڈرامے میں کسی غزل، نظم کا استعمال ہوا تو ہوا۔ لیکن ہم اس عمل کو میڈیا پر کوئی اثر چھوڑنے کا عمل نہیں کہیں گے۔ لیکن خواتین شعراء کی تھوڑی بہت موجودگی ضرور سمجھیں گے۔ میں سمجھتی ہوں کہ خواتین شاعری زیادہ تر لکھے ہوئے لفظ میں زیادہ مؤثر ثابت ہو رہی ہے۔ electronic media میں ابھی اس کا اتنا استعمال میں نے نہیں دیکھا (یا اگر ہے تو شاید میں اس سے بے خبر ہوں)۔

سوال ۴: عورت کی ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے۔ کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے کوئی کردار ادا کیا ہے؟

جواب: خواتین کی شاعری نے اس سلسلے میں بڑا بھرپور کردار ادا کیا ہے اور اپنے "ہونے" کا احساس دلایا ہے۔ اپنے احساسات اور جذبات کو اس نے خود بیان کر کے مردوں کو ان کی اب تک حاصل کی ہوئی اجارہ داری کو ختم کر دیا ہے۔ بلکہ اب تو مرد اس میدان سے ہٹ ہی گئے ہیں۔ اس سلسلے میں عورت کی آواز بہت مؤثر طریقے سے ابھر کر آئی ہے اور اس کا تاثر بہت بھرپور رہا ہے

سوال ۵: کیا ہمارے تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی کم نہیں؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: آپ کی رائے سے مجھے اتفاق ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ نہ ہونے کے برابر ہے اور سندھی میں تو بالکل سرے سے ہی نہیں۔

خواجہ نجم الحسن

پاکستان ٹیلی وژن

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے issues ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: socio - economic and right of choice.

سوال ۲: کیا خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنے کے حوالے سے آپ کی اپنی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: Yes. I have highlighted several women issues specially problems relating to Jahez.

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے؟ لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا' ریڈیو' ٹی۔وی' فلم؟

جواب: Lyrics. Specially written by .oets.

سوال ۴: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس وپیش سے کام لیتا رہا ہے۔ کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے کوئی کردار ادا کیا ہے؟

جواب: People like Fehmida, Kishwar, Shabnum, Zehra & Parveen have really conbributed in this respect.

مسز ثریا اللہ دین پراچہ

سماجی کارکن۔ کوئٹہ (بلوچستان)

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: تعلیم۔ آزادی رائے تعلیم یافتہ/ہنر مند خواتین کی فعال بحالی۔

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے ۹ گرلز سکولوں کا قیام۔ ہنر مند بنانے میں جدوجہد ووکیشنل سنٹرز کا قیام۔ ملازمت کے مواقع فراہم کرنا۔ اس کی ٹریننگ سنٹرز کا قیام۔ صحت کے مراکز قائم کئے ہیں اور سماجی بہبود میں کامیاب تجربات کئے جس پر تمغہ امتیاز حاصل کیا۔

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔ لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا۔ ریڈیو۔ ٹی۔ وی۔ فلم؟

جواب: خواتین شاعرات نے کوئی خاص انقلابی کام نہیں کیا جس سے خواتین کی حیثیت کو منوایا جاتا لیکن بہت گنجائش ہے اگر electronics میڈیا خاص طور پر TV پر انہیں اپنا کلام پیش کرنے کے کثرت سے مواقع مل سکیں۔ T.V بہترین میڈیا ہے mases تک رسائی کا۔

سوال ۴: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس

اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب: خواتین کی شاعری کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس سے خواتین کی حیثیت کو تسلیم کرانے میں مدد ملتی۔ کیونکہ عام طور پر صرف طالب علمی کے زمانے میں خواتین شاعری کرتی دکھائی دیتی ہے۔لیکن وہ بھی آسان شاعری محبت اور غم کی داستانوں تک شاعری محدود ہوتی ہے۔ اخبارات میں بھی کلام نہیں چھپ پاتا اور نہ استاد ملتے ہیں جو ان کی اصلاح کریں لہٰذا بہت کم شاعرات ایسی ہوں گی جنہوں نے خواتین کے مسائل اور ان کی حیثیت کو منوانے پر قلم اٹھایا ہو۔ جب تک اس جانب رجحان نہیں بڑھے گا عورت کی مظلومیت کی داستانیں سنتے رہیں گے یا رسائل میں پڑھتے رہیں گے اصل مقصد سے دوری المیہ ہے۔

ڈاکٹر شاہین مفتی

شاعرہ

پرنسپل ابنِ امیر کالج برائے خواتین۔ جلالپور جٹاں

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: شاعری کے حوالے سے خواتین کے issues کے لیے آپ نے جو بھی کام کیا' کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

جواب: الف) میں مردوزن کو انسانی بےبسی کی اکائی ہی میں دیکھتی ہوں اس لیے اپنی تحریروں کو صرف نسوانیات کا حصہ نہیں سمجھتی جو مناسب لگتا ہے جس بات کے اظہار کو سہل سمجھتی ہوں لکھ دیتی ہوں___ اطمینان تو بہرحال تخلیق کار اور تخلیق کی موت ہی ہے۔

سوال: کیا آپ اپنا اظہار مکمل طور پر کر پائیں؟

جواب: ب) میری تحریروں کا بنیادی اظہار علامت' تمثیل اور اخفاء سے ترویج پاتا ہے میں نے کوشش کی ہے کہ اپنی سطح پر بہت سے معاملات کی تخلیقی وضاحت کرتے ہوئے کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچوں نتیجہ میرے اور میرے قارئین کے مابین مختلف بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح اظہار والے معاملے کو ففٹی ففٹی سمجھیے۔

سوال ۲: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری معاشرے کی سماجی' اقتصادی اور سیاسی جہات پر کسطرح اثر انداز ہوئی۔

جواب: ہمارے ہاں آغاز میں تو شاعرات کی حوصلہ افزائی محفل کی ''شوبھا'' بڑھانے کے لیے کی گئی یا بااثر بیگمات کے شوق مجلس آرائی سے کچھ مالیاتی دھندے

سلیقے سے نپٹائے گئے تاہم ۱۹۶۰ء کے بعد کی شاعرات نے رازِ دروں مے خانہ کو سرِ عام دوہرانے کی جسارت کی اس سے شاعرات کا سماجی اور انفرادی رُتبہ متعین ہونا شروع ہوا' ڈومیسٹک افیئرز کی شاعری میں کچھ خارجی عوامل شامل ہوئے جنسی اور نفسی شاعری کے ساتھ تھوڑی سی فکری تربیت کی بھی عادت پڑی' مشاعرہ کئی خواتین کا روزگار ثابت ہوا____ لیکن مجموعی طور پر معاشرے میں کوئی واضح تبدیلی نہیں آ سکی۔

سوال: کیا وہ اس سلسلے میں کچھ شعور بیدار کر سکیں؟

جواب: مجموعی سطح پر پاکستانی عورتوں کی شاعری فی الحال نفسی کارگزاریوں اور معاشرتی واویلے کے گرد گھوم رہی ہے لیکن سیاسی سطح پر ابھی کوئی شاعرہ اپنے آنچل کو پرچم نہیں بنا سکی' کچھ خواتین شاعرات کارکن عورتیں بننے میں مشغول ہیں اور اس مقام پر وہ شاعری سے بچھڑ گئی ہیں آپ تو جانتی ہیں ہمارے معاشرے میں صدیوں سے ''مرزا جٹ'' کا ایک محاورہ رائج ہے۔

''بھٹ رناں دی یاری تے کھری جہناں دی مت''

اس طرح با قاعدہ دانشوری کے معاملات نیم دانش مندی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

سوال ۴: میڈیا (اخبارات، ٹی وی' ریڈیو' فلم' کے حوالے سے عورت کی تصویر اصغری خانم یعنی سیاہ وسفید سے آگے بڑھ پائی یا نہیں؟

جواب: میڈیا ایک کاروبار ہے اس کا کام معاشرتی سدھار نہیں بلکہ حکومتی تحفظات اور معاشی سودمندی ہے۔ ہر برس وہ کسی ایسے مسئلے (issues) پر کام کرتا ہے جس کے سلسلے میں غیر ملکی وسائل اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ مثلاً منشیات' ایڈز' کالا یرقان' ماحولیات' جزوی دیہاتی تعلیم' منصوبہ بندی' ان دنوں وہ دوسری شادی کے پرچار پر لگا ہے' جب سے دوسرے ملکوں کا کیبل پر حملہ ہوا ہے بے چاری اصغری خانم بھی اپنی عقل مندیوں سمیت کونے میں کھڑی ہے' اب یہاں اکیسویں صدی کی امراؤ بیگم اور ان کی جدید کنچنیوں کا راج ہے' آنے والے

دنوں میں صرف دیکھنے کی حس باقی بچے گی اور مرد وزن کو جسمانی آزادی کے لیے زیادہ تگ ودو کرنی پڑے گی۔

سوال۴ عورت کے issues نظم کے براہِ راست طریقِ کار میں بہتر اظہار پاتے ہیں یا غزل کے استعارے میں؟

جواب: میرے نزدیک عورتوں کے بنیادی ایشوز تو وہی ہیں جو مردوں کے بطور ''فردِ محض'' مقرر کئے گئے ہیں۔ تنہائی' بے بسی' لاقانونیت' شرم' عدم انصاف' بے توجہی' بے وفائی' شرمندگی' ذات پات کی تقسیم' بے جوڑ رشتے' غصہ' جبر' غم' سیاسی سماجی جبر' موت' امراض' محبت وغیرہ وغیرہ ان کے لیے کسی مخصوص نسلی یا جبلی استعارے کی ضرورت نہیں' شاعری انہی معاملات تک خالص طریقِ کار سے پہنچنے کے سلسلے میں انفرادیت کا پیراہن پہنتی ہے' ہمارے ہاں ''ریختی'' کی طرح خواتین شاعرات نے کوئی ایسا قابلِ ذکر لسانی تجربہ بھی نہیں کیا کہ وہ دبستان کی صورت اختیار کر جائے' کہیں کہیں عورت کی جسمانی ساخت کے حوالے سے کچھ بیانات ہیں اور وہ بھی کچھ ایسے اچنبھے کا باعث نہیں' غزل کے ایماء کو ادا جعفری' پروین شاکر' پروین فنا سید' شبنم شکیل' ریحانہ روحی' ریحانہ قمر نے اچھا نبھایا ہے' نظم آزاد میں کشور ناہید' فہمیدہ ریاض' منصورہ احمد' ثمینہ راجہ' نوشی گیلانی' ناہید قمر اچھا تجربہ کر چکی ہیں۔ نثری نظم میں نسرین انجم بھٹی ناہید قاسمی' عذرا عباس' فاطمہ حسن' یاسمین حمید' شگفتہ اعجاز' اسما راجہ اور کئی دوسری شاعرات سنجیدگی سے کام کر رہی ہیں' مجموعی طور پر فطری پیچیدگیاں اور لسانی بلاغت شاعرات کا کوئی ایک راستہ متعین کرتی ہے۔ میں اپنی کئی نظموں کو ابلاغی سطح پر اپنے فکری تجربے کا اچھا ترجمان سمجھتی ہوں۔

سوال۵: عورت کے issues کے اظہار کے لیے شاعری کے جمالیاتی پہلو کو آپ کتنی اہمیت دیتی ہیں؟

جواب: یہاں اظہار کی دو سطحیں ہیں اگر تو آپ مہم جوئی اور پراپیگنڈہ قسم کی شاعری پر یقین رکھتے ہیں تو پھر اسے کاسمیٹکس نہیں ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں تو یہی کافی

ہے۔

ہم تو جانیں سیدھی بات

صابن ہو تو سات سو سات

لیکن اگر آپ کی خواہش ہے کہ سات سو سات صابن کی خوشبو تمام دن آپ کے ساتھ رہے تو پھر آپ کو خوشبو کی جمالیات اور نفسیات پر ایمان لانا پڑے گا۔

----- مجھے ایسے ہی خوشبودار صابن پسند ہیں۔

ناصرہ جاوید اقبال

ریٹائرڈ جج ہائی کورٹ۔لاہور

انٹرویور۔شبنم شکیل

سوال ا: خواتین کے کون سے ایسے issues ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: ا۔حدود کے قوانین کا خاتمہ (۲) غیرت کے نام پر قتل کا مسئلہ (۳) ایسی رسوم کا قلع قمع جن کے تحت عورتوں کی سودہ بازی ہوتی ہے۔(۴) خواتین میں خاص طور پر دیہات میں تعلیم کی ضرورت۔

سوال ۲: کیا خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: میں نے بحثیت وکیل بعد ازاں بحثیت جج خواتین کے حقوق کا تحفظ کیا ہے۔ میرے فیصلے اس امر کی گواہی دیتے ہیں۔اب میں ان مسائل پر قومی اور بین الاقوامی اداروں کی کانفرنسوں میں شریک ہوتی ہوں۔

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ مؤثر ثابت ہورہا ہے۔لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا۔ریڈیو۔ ٹی۔وی۔فلم؟

جواب: فی الحال نہیں۔فی الحال جس حد تک متاثر کیا۔وہ لکھا ہوا لفظ ہی ہے۔

سوال ۴: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب: میری دانست میں خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے ابھی اہم کردار ادا کرنا ہے۔

ڈاکٹر نجمہ نجم

وائس چانسلر، فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی۔راولپنڈی

انٹرویور۔شبنم شکیل

سوال ا: خواتین کے کون سے ایسے issues ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: All issues of women are important for me.

سوال ۲: کیا خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: I have contributed through education & research.

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا۔ریڈیو۔ ٹی۔وی۔فلم؟

جواب: of course media is more powerful in reaching out readers and viewers and can effectively express and impact.

سوال ۴: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس وپیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب: I am sure it must have, because there are well known women who have been able to use poetry to express women's issues - and they have influenced both men and women widely.

ثمینہ احمد

آرٹسٹ

انٹرویور۔ شبنم شکیل

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: خواتین کے تمام issues سے مجھے دلچسپی ہے خصوصاً ''شخصی آزادی'' ہے۔

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: جی ہاں۔ میں نے مختلف NGOs کے ساتھ خواتین کے مسائل حل کرنے میں مدد کی ہے۔

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔ لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا۔ ریڈیو۔ ٹی۔وی۔ فلم؟

جواب: جی ہاں خواتین کی شاعری نے میڈیا کو متاثر کیا ہے electronic media زیادہ مؤثر ہے۔

سوال ۴: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب: جی ہاں۔

مسرور عالم خان

ایگزیکٹو پروڈیوسر۔ حالاتِ حاضرہ۔ پاکستان ٹیلی وژن کوئٹہ (بلوچستان)

انٹرویور۔ بیگم ثریا اللہ دین

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: تعلیم

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے ٹی وی پر پینل discussions کی ہیں۔ عورت فاؤنڈیشن کے سیمینار میں عورتوں کے مسائل سماجی بہبود، معاشرتی و معاشی مسائل کو cover کیا۔ مکران جیسے دور دراز علاقہ میں جا کر سیاسی طور پر خواتین میں شعور پیدا کرنے کے لیے دستاویزی پروگرام بنائے ہیں۔

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔ لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا۔ ریڈیو۔ ٹی۔ وی۔ فلم؟

جواب: بذریعہ ٹی وی زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔

سوال ۴: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب: نہیں۔ No

سوال ۵: کیا ہمارے تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی کم نہیں؟ آپ کی کیا رائے

ہے؟

جواب: I don't know.

سوال ۶: ہماری نوجوان نسل خاص طور پر طالبات پر یہ شاعری کیا اثرات مرتب کر سکتی ہے؟

جوب: اگر شاعری میں قوت ہو تو awareness بیدار کر سکتی ہے۔

سوال ۷: ہمارے معاشرے میں خواتین کا کون سا طبقہ شاعری سے زیادہ اثر لیتا ہے یا پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے؟

جواب: شعبہ تعلیم یا باشعور خواتین۔

گوہر شبنم شیروانی

شعبہ اردو
پروفیسر گورنمنٹ کالج برائے خواتین۔ کوئٹہ (بلوچستان)

انٹرویور۔ بیگم ثریا اللہ دین

سوال ۱: خواتین کے ایشوز کیلئے آپ نے جو کچھ بھی کام کیا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟ کیا اپنا اظہار مکمل طور پر کیا یا نہیں؟

جواب: کوئی بھی کام اپنی موجودہ جگہ پہ کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ اس میں ارتقا کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ تاہم (اپنی کتاب ''دشتِ احساس'' کے حوالہ سے) میری شاعری ایک عورت کے وجود اور اس کے مسائل کا بھرپور اظہار ہے۔ جسے میں مکمل اظہار نہیں کہہ سکتی کیونکہ زندگی بذاتِ خود اور زندگی کے تمام جذبے و احساسات ہمیشہ تکمیل کے مراحل سے گزرتے رہتے ہیں۔

سوال ۲: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری معاشرے کے سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی جہاد پر کس طرح اثر انداز ہوئی؟ کیا وہ اس سلسلے میں کوئی شعور بیدار کر سکی ہے؟

جواب: عورت بھی اس معاشرے کا ہی ایک حصہ ہے۔ عورت اور اس کے مسائل معاشرے پر بہر طور اثر انداز ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عورت کی شاعری نے سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی شعور کو بیدار کیا ہے، لیکن اس شعور کو سمجھنے کیلئے جس شعور کی ضرورت ہے اس کی معاشرے میں کمی ہے۔ اس شعور کو پانے کیلئے ہمیں اپنی علمی، اخلاقی اور انسانی سطح کو بلند کرنا ہوگا۔

سوال ۳: میڈیا کے حوالے سے عورت کا تصور اصغری خانم یعنی سیاہ و سفید سے آگے بڑھ پایا

ہے یا نہیں؟

جواب: میڈیا کے حوالے سے عورت کا تصور اصغری خانم کے مثالی کردار سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ فی زمانہ ایسے کردار تو کیا ایسے نام بھی شاذ ہی نظر آئیں گے۔ البتہ ایک بات جو دکھ کا باعث ہے وہ علم اور تعلیم کی کمی ہے۔ جنوبی ایشیا میں پاکستان تعلیم پر سب سے کم خرچ کرنے والا ملک ہے۔ ہماری نصف سے زیادہ آبادی ناخواندہ ہے اور اس نصف میں عورتوں کی تعداد نصف سے بھی زیادہ ہے۔

سوال۴: عورت کے ایشوز (مسائل) نظم میں (براہ راست) یا غزل میں (استعارہ کی صورت میں) بہتر طریق پر اظہار پاتے ہیں؟

جواب: عورت کے مسائل (شاعری کے حوالہ سے) غزل کی نسبت نظم میں بہتر طریق پر اظہار پاتے ہیں۔ کیونکہ نظم میں کیفیت' جذبے یا مشاہدے کو براہِ راست اور بلا تکلف اظہارِ بیان مل جاتا ہے۔ جبکہ غزل میں قافیہ ردیف اور تشبیہہ استعارے کا تکلف بیان کو دقیق بنا دیتا ہے۔

سوال۵: عورت کے مسائل (ایشوز) کے اظہار کے لئے شاعری کے جمالیاتی پہلو کو آپ کتنی اہمیت دیتی ہیں؟

جواب: عورت کے مسائل کے اظہار کیلئے شاعری کے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اس پر انحصار بھی نہیں کیا جا سکتا' البتہ اظہار کا سلیقہ ہونا ضروری ہے۔ میرے نزدیک سچائی کا سادگی اور سلیقے سے اظہار ہی حسن ہے۔ بقول شاعر
''بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے''

"Truth is Beauty, Beauty is Truth"

ریحانہ مطیع اللہ

پرنسپل فرنٹیر کالج فار ویمن۔ پشاور (سرحد)

انٹرویور۔ صبا جاوید

سوال ۱: قیام پاکستان کے بعد آپ کے خیال میں شاعرات نے کوئی تخلیقی عمل آگے بڑھایا ہے۔

جواب: جی ہاں تخلیق کا عمل تو تدریجی عمل ہے یہ بدستور ارتقائی راستوں سے گزرتا رہا ہے اور گزرتا رہے گا۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں کے جو بدلتے حالات تھے۔ مہاجرین کی آمد و رفت بحالی مہاجرین' بحالی ملک اور پھر نئے ملک کی نئی مشکلات ان سب نے شاعرات کی تخلیقات میں اضافہ کیا کئی نئی شاعرات بھی سامنے آتی گئیں۔ کشور ناہید پروین شاکر' فاطمہ حسن' شبنم شکیل' نوشی گیلانی اور پھر آگے چل کر ریحانہ روحی' رخشندہ نوید' رخسانہ نازی ہمارے پشاور میں پشتو کی سلمی شاہین اردو میں نرجس افروز' صبا جاوید' شمشاد نازلی' قدسیہ قدسی صوفیہ بشریٰ فرخ وغیرہ ہیں۔

سوال ۲: صوبہ سرحد کے کلچر پر شاعری کا کیا رول دکھائی دیتا ہے؟

جواب: کلچر تو ایک مخصوص فضا میں زندگی بسر کرنے کا نام ہے لیکن شاعری میں جس طرح کی ترغیب دی جاتی ہے یعنی حالات کو بدل ڈالنے کی اور گھٹن سے نجات کی' محنت و استقلال کی' منزل کے تعین کی اور شعور کو اجاگر کرنے کی عفو درگزر کی' آگے بڑھنے کی تو اس اعتبار سے شاعری نے یہاں کے ماحول کو بہت حد تک بدلا ہے لوگ تعلیم کی جانب راغب ہوتے ہیں پردہ کو مناسب طریقے سے

زندگی میں اپنا رہے ہیں۔ انتقام اور بدلہ لینے کی بجائے معاف کرنے کی پالیسی اپنا رہے ہیں۔

سوال ۳: شاعری کا اثر معاشرے پر یا اپنی ذات پر آپ کیسا دیکھتی ہیں؟

جواب: معاشرہ اور میں دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں میرا عمل معاشرے کو متاثر کرتا ہے اور معاشرے کا عمل مجھ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن شاعری کا اثر دونوں پر پڑتا ہے مجھے زمانۂ طالب علمی میں بہترین سٹوڈنٹ ہونے کا اعزاز حاصل رہا اور انعام میں جو کتابیں ملتیں وہ بھی شاعری سے متعلق ہوتیں۔ میں اپنی فرصت میں بڑے شوق سے پڑھیں۔ ان کتابوں کا اثر یہ ہوا کہ مجھے لڑکیوں کے اس بڑے کالج میں تین ہزار لڑکیوں کو بہترین سٹوڈنٹ میں بدلنے کا طریقہ آیا اور اپنے سٹاف ممبرز کی صلاحیتوں کو نکھارنے کا سلیقہ آیا۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ معاشرے پر بھی مجموعی طور پر اس کا اثر بہترین ہی ہوا ہے۔

سوال ۴: کیا سرحد کی طالبات شاعری کے ذریعہ سے کوئی تاثر قبول کر سکتی ہیں؟

جواب: جی ہاں جب وہ ایسی شاعری پڑھتی یا سنتی ہیں۔

۱۔ ہم مائیں بہنیں اور بیٹیاں۔ قوموں کی عزت ہم سے ہے (حالی)

۲۔ میری کٹیا میں ہے روشن ایک ہی جلتا دیا باقی
ستم گر تا ک میں اس کی ہوائیں کاٹتی ہوں میں (سحر حسن کراچی)

اک ظلم کی شاہد تھی اس کی یہ خموشی بھی
انصاف کے رستے میں وہ آدھی گواہی تھی (زرین یامین نیوجرسی)

پروفیسر شمیم کوثر

اسسٹنٹ پروفیسر اُردو۔ کوئٹہ (بلوچستان)

انٹرویور۔ بیگم ثریا اللہ دین

سوال ا: خواتین کے ایشوز کے لیے آپ نے جو کام کیا ہے کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟ کیا آپ اپنا اظہار مکمل کر پائیں؟

جواب: خواتین کے مسائل ان گنت ہیں۔ وہ ازل سے دکھوں میں گھری رہی ہے۔ دکھ کی چادر اوڑھ کر کبھی صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ اور کبھی خاموشی کے گہرے سمندر میں پناہ لیتی ہے۔ میں نے جو کام کیا۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں اس سے مطمئن ہوں کہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا اور اظہار مکمل طور پر کر پائی۔ اسلام سے پیشتر عورت کے ساتھ سلوک اور پھر اسلام نے ارفع مقام عطا کر دیا۔ لیکن ہمارا معاشرہ روایات سے انحراف کر کے کہیں نہ کہیں عورت میں کم مائیگی کا احساس ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ عورت مظلومیت کی چکی میں سدا پستی رہی ہے۔ اسی سوچ نے میری تلاش کو ادھر ادھر بھٹکنے پر لگا دیا۔ اور کھوج میں ہوں۔ اظہار کا وسیلہ ملے اور ترسیل ہو پائے کوئی مصرعہ ایسا ملے جو عورت کے زخم پر مرہم بنے اس کے دکھ کا مداوا کر سکے۔ ہمیں تو اظہار کے راستے ٹٹولنے پڑتے ہیں۔ اس لیے مطمئن ہو کر چپ سادھنا مشکل مرحلہ ہے۔

سوال ۲: مجموعی طور پر خواتین کی شاعری معاشرے کی سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور سیاسی جہات پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے کیا وہ اس سلسلہ میں کوئی شعور بیدار کر سکتی ہے۔

جواب: جی ہاں۔ بالکل۔ خواتین کی شاعری نے گہری معنویت اور تہہ دار مفہوم کے ذریعے ان الفاظ کو برتا ہے۔ جو جمالیاتی تخیل کو بیداری بخشتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ آج عورت خواہشات کو قتل ہوتا نہیں دیکھ سکتی وہ سماجی رویوں۔ اقتصادی نشیب وفراز، تہذیبی وثقافتی پہلوؤں اور سیاسی پیچیدگیوں کے مراحل سے آشنا ہے۔ آج معاشرہ ان رویوں اور رجحانات کے سلسلہ میں جو جہتیں کر رہا ہے۔ عورت اس کرب کی شدت کو محسوس کرتی ہے اور انقلابی انداز اپنا کر ماحول کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ خواتین کی شاعری نے ہر دور میں روح کو چھو کر نیا جذبہ پیدا کیا ہے۔ جنگوں میں رزمیہ اشعار کہے۔ ۱۹۶۵ء میں سرحدوں پر شاعری نے اور عورت کی صدا نے ولولہ جوش بڑھایا۔ عورت نے تو پابند رہ کر بھی فعال کردار ادا کیا۔ اب تو آزادانہ تبدیلیاں اس کے لیے نکھار بن کر آئی ہیں۔ اب عورت وہ نہیں جو سائے سے ڈر جائے۔ جو اپنی ہی رونے کی آواز سے چونک جائے۔ اس نے اپنے قلم کے ذریعے معاشرے کے ان رویوں کو تقویت دی ہے۔ جو ترقی میں شعور کی بیداری کا باعث ہیں۔

سوال ۳: میڈیا کے حوالے سے (اخبارات ٹی۔وی۔ریڈیو۔فلم) عورت کا تصور اصغری خانم یعنی سفید وسیاہ سے آگے بڑھا پایا کہ نہیں؟

جواب: میڈیا نے ہر سطح پر اپنے طور کوشش کی اور کر رہا ہے کہ وہ عورت کے اس تصور سے نکال دے لیکن شاید ایسا ہوا نہیں۔ بھوک۔ ننگ۔ افلاس۔ دیگر آفتوں سے نجات کی خواہش نے سر اٹھایا۔ اخبارات نے فعال کردار ادا کیا۔ ٹی وی اور ریڈیو پر مختلف پروگرامز یا ڈرامے نشر ہوئے فلمیں بھی بنیں۔ لیکن عورت آج تک انہی دو کرداروں اصغری اور اکبری میں معلق ہے۔ کبھی کبھار موضوع میں تبدیلی لا کر زبان کا ذائقہ بدلا گیا تا کہ تعمیری سوچ منافقت اور اردگرد پھیلی آلائشوں اور غلاظتوں سے معاشرے کو پاک کر سکے۔ جیسے ۵۰ منٹ پروگرام میں خواتین کے مسائل کو پیش کیا گیا تھا۔ لیکن شاعری کے حوالہ سے بہت کم کام ہوا ہے۔ خصوصاً بلوچستان کی بات ہو تو تشنگی باقی ہے۔

سوال۴: عورت کے مسائل نظم ۔ یا غزل ۔ کس صورت بہتر طریق اظہار پاتے ہیں؟

جواب: جی پہلی بات تو یہ کہ بلوچستان کے حوالہ سے میں اردو نظم پر کام کر رہی ہوں ۔ اور کچھ مزاج کی بھی بات ہوتی ہے میرا جھکاؤ نظم کی جانب رہا ہے گو کہ غزل کی صنف بڑی اہمیت کی حامل ہے ۔ لیکن میرے خیال میں عورت اپنے خیالات و احساسات کی ترجمانی نظم میں بآسانی کر سکتی ہے ۔ جدید اردو نظم میں شعرا کے ہاں عورت مفاہیم کے ہمراہ تشکیل پاتی ہے ۔ نظم اظہار کا بہترین وسیلہ ہے ۔ حیرت انگیز جاذبیت پابند وقید سے پاک لہجہ محبت کی چاشنی سے مزین ہو یا طنز کی کاٹ سے لبریز جذبات کی نزاکتوں اور معاشرتی رویوں کو گھٹن سے الگ کر کے نئے زاویوں کے ساتھ کھلی فضا میں پیش کیا جا سکتا ہے ۔ غزل کی اہمیت اپنی جگہ مگر عورت کی کیفیات خیالات ' جذبات بڑے نازک اور گہرے ہوتے ہیں ۔ ایسے میں دو مصرعے اسے بیان کرنے سے قاصر ہیں ۔ اس کے مسائل غزل میں کھل نہیں سکتے ۔ جب کوئی سانحہ حیرت میں نہ ڈالے ۔ متاثر نہیں کر سکتا ۔ کشور ناہید ۔ فہمیدہ ریاض ۔ پروین شاکر ۔ فاطمہ حسن اور دیگر شاعرات ۔ (جن میں بلوچستان کی شاعرات) بھی ہیں ۔ اظہار کیلئے نظم کی صنف کو کامیابی سے اپنایا ہے ۔ حالی نے نظم کیلئے خیال پیش کیا لیکن خود غزل کہی ۔ اصل میں نظم میں علامت موضوع اور تصویر مختلف جہتوں کے ساتھ ابھرتی ہے اور معانی آفرینی کی راہیں مسدود نہیں ہوتیں ۔ عورت کے مسائل نظم کی صورت بہتر طریق اظہار پاتے ہیں احتجاج ہو یا خاموشی ۔ ہلکے پھلکے جذبات اور جمالیاتی ذوق کی تسکین نظم کی صورت ہو سکتا ہے ۔

سوال۵: عورت کے ایشوز کے اظہار کیلئے شاعری کے جمالیاتی پہلو کو آپ کتنی اہمیت دیتی ہیں؟

جواب: قدیم عربی اس کو شاعر تسلیم کرتے جو موثر اور دلکش الفاظ کہے اور پھر کلام الٰہی کی آیات کے جمال وحسن کو دیکھ کر انہوں نے اسے شاعری کا نام دیا ۔ کیوں؟ اس لیے کہ شاعری کے ساتھ جمالیاتی پہلو جڑا ہوا ہے ۔ دلکش مناظر ۔ چاندنی ۔

پھول سرمئی شامیں۔ خزاں میں پتوں کا گرنا۔ پازیب کی جھنکار۔ یہ سب کیفیات اپنے اندر جمال رکھتی ہیں۔ ورنہ ممکن تھا ناصر کاظمی چاند کے ہمراہ گاڑی چھوڑ کر ملتان سے بہاولپور تک چل پڑتے۔ یہ جمالیاتی پہلو ہے جو جذبے کی سطح پر ردِ عمل کے اس زاویے کو چھوتا ہے جو شعری فضا کو جنم دیتی ہے۔ تب احساسات کو سمونے کے لیے دلکش۔ لطیف استعارے اور الفاظ تلاش کیے جاتے ہیں۔ شاعری تو جمالیاتی پہلو کا ایک حصہ ہے۔ یہ محبت کا وہ رنگ ہے جو اسے سونا ہونے سے محفوظ رکھتا ہے۔ ہم شاعری سے رشتہ استوار کرنے کیلئے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے چاہے موضوع اصلاحی یا مسائل کی راہ تلاش کرنے کا ہو۔ اور خصوصاً جب عورت اجالے کا باعث ہو مگر خود فنا ہو رہی ہو۔

مجید اصغر

صحافی۔ایڈیٹر روزنامہ جنگ کوئٹہ (بلوچستان)

انٹرویور۔بیگم ثریا اللہ دین

سوال ۱: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: میرے نزدیک قومی زندگی میں خواتین کی برابری کی بنیاد پر شرکت ترقی کے مساوی مواقع، تعلیم، عزت نفس کی بحالی اور مردوں کے بے جا تشدد کا خاتمہ خواتین کے بنیادی مسائل ہیں جن پر توجہ دی جانی چاہئے۔

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: ابلاغ کے حوالے سے خواتین کے مسائل کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں میری حقیر سی کنٹری بیوشن یہ ہے کہ میں نے روزنامہ جنگ کوئٹہ میں پہلی بار خواتین کا الگ صفحہ شروع کرایا۔ خواتین کے سماجی و سیاسی مسائل پر بحث و مباحثہ کا ماحول پیدا کیا اور مضامین اور رپورٹیں شائع کیں۔

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا۔ریڈیو۔ٹی۔وی۔فلم؟

جواب: خواتین کی شاعری نے مجموعی طور پر ہمارے معاشرے پر کوئی نمایاں اثرات مرتب نہیں کئے۔ایک وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں خواتین کی شاعری کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔اسے معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایک طرح کی مزاحمت پائی جاتی ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ تر رومانوی مسائل سے

آگے نہیں بڑھ سکی۔ سماجی اور سیاسی مسائل پر کم ہی لکھا گیا ہے۔

سوال ۵: کیا ہمارے تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی کم نہیں؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہمارے تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سوال ۶: ہماری نوجوان نسل خاص طور پر طالبات پر یہ شاعری کیا اثرات مرتب کر سکتی ہے؟

جواب: نوجوان نسل خصوصاً طلبا و طالبات پر شاعری زیادہ اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ کسی کی بات یا ذات سے متاثر ہونے والی عمر بھی یہی ہوتی ہے۔ شاعری نے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو منفی سرگرمیوں اور مشاغل سے روکنے میں بڑی حد تک مدد دی ہے۔

سوال ۷: ہمارے معاشرے میں خواتین کا کون سا طبقہ شاعری سے زیادہ اثر لیتا ہے یا پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے؟

جواب: ہمارے معاشرے میں خواتین کا صرف پڑھا لکھا طبقہ شاعری سے زیادہ اثر قبول کرتا ہے۔ ان میں بھی وہ خواتین زیادہ اثر لیتی ہیں جن کا تعلق درس و تدریس یا لکھنے پڑھنے کے شعبوں سے ہوتا ہے۔

سوال ۸: آپ کی رائے میں وہ کونسی شاعرات ہیں جنھوں نے خواتین کے مسائل کی صحیح طور پر عکاسی کی ہے؟

جواب: خواتین کے مسائل کی صحیح عکاسی محدود ہے چند شاعرات ہی کے حصے میں آئی ہے۔ ان میں پروین شاکر۔ شبنم شکیل۔ فہمیدہ ریاض کے نام نمایاں ہیں۔

سارہ گل مسرور

سٹوڈنٹ آف ایم بی اے
انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز یونیورسٹی آف بلوچستان

انٹرویور۔ بیگم ثریا اللہ دین

سوال ا: خواتین کے کون سے ایسے مسائل ہیں جن سے آپ کو خصوصی دلچسپی ہے؟

جواب: I am a strong advocate of librating women to be professional women, as they have knowledge & skill to do so.

سوال ۲: کیا ان مسائل کو حل کرنے کے حوالے سے آپ کی بھی کوئی contribution ہے؟

جواب: No not yet. But I Intend do so.

سوال ۳: کیا خواتین کی شاعری نے ہمارے میڈیا کو متاثر کیا ہے؟ شاعرات کا کلام کس میڈیا پر زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے۔ لکھا ہوا لفظ یا electronic میڈیا۔ ریڈیو۔ ٹی۔ وی۔ فلم؟

جواب: No. Poetry by women has no significant effect on the upliftment of women. But print media is more effective.

سوال ۴: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب: The general perception prevailing in our society is that poetyry as an art is more for males than females. Females can prove to be able to portray women rights in a better manner. But currently I do not feel any such efforts by women.

سوال ۵: کیا ہمارے تعلیمی نصاب میں خواتین شعرا کی نمائندگی کم نہیں؟ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: Yes. It should be increased.

سوال ۶: ہماری نوجوان نسل خاص طور پر طالبات پر یہ شاعری کیا اثرات مرتب کر سکتی ہے؟

جوب: In an age of computer technology and global advancement, poetry has become a very insignificant source of womens upliftment today. Youngster are practical & absorb least morals from poetry.

سوال ۷: ہمارے معاشرے میں خواتین کا کون سا طبقہ شاعری سے زیادہ اثر لیتا ہے یا پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے؟

جواب: Females from lower middle class or middle class.

سوال ۸: آپ کی رائے میں وہ کونسی شاعرات ہیں جنہوں نے خواتین کے مسائل کی صحیح طور پر عکاسی کی ہے؟

جواب: x

سوال ۹: عورت کے ذاتی تشخص اور اس کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے میں ہمارا معاشرہ خاصے پس و پیش سے کام لیتا رہا ہے کیا خواتین کی شاعری نے اس اعتبار سے بھی کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

جواب: Well, there is a bit of social recognition but it is not sufficient.

سوال ۱۰: آپ کے خیال میں شاعرات کی نثری نظم زیادہ مؤثر ہے یا پابند؟ غزل پر بھی اپنی رائے دیجئے۔

جواب: (غزل) (نثری نظم)

سوال ۱۱: کیا مشاعرے اس سلسلے میں کوئی کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب: Yes, they help in social recognition of females and as a platform to raise voice for women rights.

سوال ۱۲: women's lib کی اصطلاح سے آپ کے ذہن میں کیا تصور ابھرتا ہے؟ کیا

خواتین نے اپنی شاعری میں اس تحریک کے مقاصد کو اچھی طرح سے پیش کیا ہے؟

جواب: Women should feel more secure and they should be allowed to decide whats right & wrong for themselves from the beginning. Women's poetry has no contribution.

سوال ۱۴: کونسی شاعرات کے ہاں اس women's lib سے متعلق موضوعات کو سلیقے اور توازن سے پیش کیا گیا ہے؟

جواب: None

امجد قمر

ایم اے فائنل شعبہ جرنلزم پشاور یونیورسٹی (سرحد)

انٹرویور۔ صبا جاوید

سوال ا: قیام پاکستان سے لے کر آج تک شاعرات نے تخلیقی عمل کو کیسے آگے بڑھایا ہے؟

جواب: خواتین نے جہاں تمدن، تہذیب، معاشرت اور سیاست میں نمایاں حصہ لیا۔ وہاں اب زبان وادب اور شعروشاعری کے آسمانوں پر بھی ستاروں کی طرح جگمگاتی رہیں۔ ہر عہد میں ایسی خواتین کی تعداد کافی رہی ہے۔ جو ادیبہ اور شاعرہ بھی تھیں قیام پاکستان کے بعد ہمیں چند چیدہ چیدہ اور شاعرات نظر آتی ہیں۔ جن کا کلام اپنے اندر بہت درد اور گہرائی رکھتا ہے۔ لیکن ادب پر مرد کی اجارہ داری نے ان کے کلام کو منظر عام پر نہ آنے دیا۔ ان شاعرات میں رضیہ انور امروہوی، سلمیٰ تصدق حسین، کنیز فاطمہ حیا لکھنوی، اختر جہاں انجم، عزیز جہاں ادا بدایونی، شمیم جالندھری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جبکہ جدید شاعرات کی دنیا کا سرمایہ نظر آتی ہیں۔ ان خواتین شعرا کا موضوع سخن زیادہ تر رومانوی رہا۔ ان کے ہاں غزل کا رواج عام پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ چند شاعرات نے وطن سے محبت انقلاب اور قومی جذبوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ مثلاً حیا لکھنوی لکھتی ہیں:

اسیران کہن اب تک وطن کی بات کرتے ہیں
چمن سے دور ہیں لیکن چمن کی بات کرتے ہیں

تغافل کا گلہ ہے اور شکوہ بے نیازی کا
یہ ناداں آج بھی رسمِ کہن کی بات کرتے ہیں

اسی طرح سلمیٰ تصدق حسین کی شاعری انسان کے اندر ایک تازہ ولولے کو جنم دیتی ہے۔ کہتی ہیں:

حریمِ زندگی میں بے نیازِ این واں ہو جا
خودی کی سر بلندی سے حریفِ آسماں ہو جا
یہ میٹھے نغموں سے نہیں وابستگی اچھی
نوا کو تلخ تر کر شعلۂ آتش بجاں ہو جا
تری فطرت میں مضمر شانِ خلاقی کے جوہر ہیں
اٹھ کر سیلِ بے پروا کی صورت بے کراں ہو جا

آپ اپنی شاعری میں اقبال کے نظریات سے متاثر نظر آتی ہیں کیونکہ آپ کی شاعری میں اقبال کی شاعری کا عکس جھلکتا ہے۔ اسی طرح نزیر جہاں کے ہاں بھی انقلابیت کا رنگ نظر آتا ہے اور ان کی شاعری اپنے اندر جستجو اور جوش کے جذبات رکھتی ہے۔

ہم گردشِ دوراں کے مارے یہ گردشِ دوراں بدلیں گے
اب مورو ملخ کے لشکر ہی اورنگِ سلیماں بدلیں گے
ہر جور خزاں کا سہنے کو کانٹے ہی رہیں گے سینہ سپر
ایسے ہی کہاں پھولوں کے جگر جو رنگ گلستاں بدلیں گے

ان کے ہاں مایوسی سے بغاوت کا عنصر پایا جاتا ہے۔

اے شمع کبھی مایوس نہ ہو ہر روز کے جلنے بجھنے سے
یہ سوز تیرا یہ اشک تیرا آئینِ شبستاں بدلیں گے

اردو ادب کی شاعرات کی اکثر تعداد سماجی خدمت کے کاموں میں مصروف نظر آتی ہے۔ اور وہ اپنے اپنے دور میں اس میدان میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔

چونکہ ان شاعرات کو معاشرے نے بننے کا موقع نہیں دیا اسلیے ان کا کلام فقط ان کی اپنی بیاض کی زینت بن کر رہ گیا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ تو پروین شاکر کی نظم گوئی اور غزل گوئی نے میری اندرونی کیفیات کو جلا بخشنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی شاعری فطرت کے سب سے اہم کرداروں مرد و عورت کے درمیان گھومتی ہے۔ اس کے علاوہ شاعری میں عورت کے مسائل کو بھی ہلکا لیکن پُر اثر رنگ ملا ہے۔ سو میں نے ان کی شاعری سے مرد وعورت کے تعلق اور عورت کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

سوال ۲: کیا صوبہ سرحد کی طالبات شاعری سے متاثر ہو سکتی ہیں؟ میڈیا سے شاعری کا تعلق واضح کریں؟

جواب: جہاں تک شاعری اور میڈیا کا تعلق ہے۔ تو میڈیا نے شاعری کو زیادہ پلنے کا موقع نہیں دیا۔ اور نہ ہی شاعری کی کسی صنف نے میڈیا کو کسی ایسی سطح پر موضوع سخن نہیں بنایا جو قابل ذکر ہو کیونکہ دورِ جدید کی شاعری اصناف مرد و زن کے درمیان گھومتی نظر آتی ہے اور اس میں سے انقلاب کا جوش معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے کافی توجہ کی ضرورت ہے۔ جہاں تک سرحد کی طالبات کو متاثر کرنے کا تعلق ہے تو شاعری کے میدان میں یہ بہت بڑی ترقی ہوگی کہ کوئی شاعر اس قسم کی کوشش کرے اور اپنے فن کو اس مقصد کے لیے استعمال کرے۔

شاعری انسان کے اندر کے جذبات کو اپیل کرتی ہے اور نثر سے زیادہ ایک شعر کا حسن انسان کے دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ سو اگر شاعری کو تعلیم بنا دیا جائے۔ تو اس کا نقش شاعری کی طرف زیادہ راغب نظر آتا ہے۔ سو نہ صرف سرحد کی طالبات بلکہ تعلیمی سطح پر ہر جگہ نصاب میں ایسی شاعری شامل کی جائے جوان کے جذبات کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات کو بھی متاثر کر سکے۔ جس طرح اقبال کی شاعری نے مومن کو ولولہ عطا کیا۔ فیض اور جالب کی شاعری نے اپنا ان مٹ اثر چھوڑا۔ اور نوجوانوں نے ان کے نظریات کو adopt کیا بالکل اسی طرح اگر شاعری کو تعلیم کا رنگ دے کر طالبات کی تربیت کی جائے تو ان میں

حوصلہ وعبت پیدا کی جاسکتی ہے اور شاعری ایسی جو انہیں ان کے حقوق وفرائض متعین کرنے میں مدد کرے۔اور مقصدیت پیدا کرے۔

سوال ۳: سوسائٹی میں شاعری اور سیاست کا کیا رول ہے؟

جواب: شاعری اور سیاست کا کافی گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے تو شاعری اور سیاست ایک ہی تصویر کی جھلک دکھائی دیتے ہیں پاکستان میں شاعروں نے لوگوں کو سیاسی شعور عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خاص طور پر اقبال' اکبرالہ آبادی' نظیر اکبر آبادی جیسے لوگوں کی شاعری نے ایک انقلاب کو جنم دیا اور ان کی شاعری سے متاثر ہو کر پاکستان کے حامیوں نے جدوجہد کا رویہ اختیار کیا اور پاکستان حاصل کرلیا۔ اقبال کی تحریک پاکستان کے سلسلے میں شاعرانہ خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد فیض احمد فیض' ابن انشاء اور حبیب جالب جیسے شعرا بغاوت اور انقلابیت کا درس دیتے نظر آرہے ہیں۔ فیض احمد فیض کے ہاں اشتراکیت کا رنگ نمایاں ہے۔ یہ شعرا اپنے پر اثر لہجے کی وجہ سے سیاسی نظریات کو تبدیل کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اور ان کی شاعری نے نوجوانوں میں نئی سیاسی سوچ کو جنم دیا۔ جس میں بغاوت کا عنصر پایا جاتا ہے۔

پاکستانی شاعرات ۔ کتابیات

آسناتھ کنول: ''پانیوں کا پھول'' لاہور' الحمد ۲۰۰۳ء صفحہ ۱۸۴

ادا جعفری: ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' لاہور' مقبول اکیڈمی ۱۹۵۰ء صفحہ ۱۶۰
''شہرِ درد'' لاہور' مقبول اکیڈمی' ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۰۶
''غزالاں تم تو واقف ہو'' لاہور' مقبول اکیڈمی' ۱۹۷۲ء صفحہ ۱۷۵
''سازِ سخن بہانہ ہے'' لاہور' مقبول اکیڈمی' ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۵۹
''سازِ سخن'' (انتخاب کلام) دہلی' مکتبہ جامعہ' ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۵۲
''حرفِ شناسائی'' کراچی' دانیال' ۱۹۹۹ء صفحہ ۱۷۰
''موسم موسم'' (کلیات) کراچی' اکادمی بازگشت' ۲۰۰۲ء' صفحہ ۷۶۸

انیلا خان: ''بند گلی کے کھلے کواڑ'' لاہور' ۱۹۹۶ء

بشریٰ رحمٰن: ''صندل میں سانسیں جلتی ہیں'' لاہور ۱۹۹۸ء صفحہ ۲۲۴

بشریٰ فرخ: ''ادھوری محبت کا پورا سفر'' راولپنڈی' حرف اکادمی' ۲۰۰۳ء صفحہ ۲۰۸

بلقیس محمود: ''مجھے بولنے دو'' اسلام آباد' ۱۹۹۷ء صفحہ ۳۱۲

بینا گوئندی: ''سوچتی آنکھیں'' لاہور' عزیز بک ڈپو' ۱۹۹۳ء صفحہ ۱۴۴

پروین شاکر: ''خوشبو'' لاہور' التحریر' ۱۹۷۷ء
''صد برگ'' لاہور غالب پبلشرز ۱۹۸۰ء صفحہ ۲۷۹
''خود کلامی'' لاہور مکتبہ فنون ۱۹۸۵ء صفحہ ۱۸۳
''انکار'' اسلام آباد' مراد پبلی کیشنز' ۲۰۰۳ء صفحہ ۱۹۶
''گیتا انجلی البم'' (ترجمہ) اسلام آباد' مراد پبلی کیشنز' ۱۹۹۵ء صفحہ ۹۶
''ماہِ تمام'' (کلیات) اسلام آباد' مراد پبلی کیشنز' ۱۹۹۴ء

""عکسِ خوشبو'' اسلام آباد لفظ لوگ پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء صفحہ ۲۷

کفِ آئینہ (انتقال کے بعد) ۱۹۹۶ء

پروین فنا سید: ''یقین'' راولپنڈی ۱۹۹۳ء صفحہ ۱۵۸۔ تمنا کا دوسرا قدم

پروین، وحیدہ روشن: ''اربعات'' لاہور آئینہ ادب ۱۹۸۰ء

تسلیم، رحیل ڈانی ایل: ''اعراف'' لاہور ۲۰۰۲ء

توقیر نقوی سیدہ: ''پلکوں کی چھاؤں میں'' لاہور ۲۰۰۲ء صفحہ ۲۷۲

ثریا شہاب: ''خود سے ایک سوال'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز

ثمینہ راجہ: ''ہویدا'' ۱۹۹۵ء

''شہرِ صبا'' ۱۹۹۷ء

''اور وصال'' لاہور، الحمد ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۴۲

''خوابنائے'' لاہور، الحمد ۱۹۹۸ء صفحہ ۸۴

''باغِ شب'' لاہور، الحمد ۱۹۹۹ء صفحہ ۱۶۰

''بازدید'' لاہور الحمد ۲۰۰۰ء صفحہ ۱۶۳

''ہفت آسمان'' راولپنڈی، نواب سنز ۲۰۰۱ء صفحہ ۱۷۶

''پری خانہ'' لاہور، الحمد ۲۰۰۱ء صفحہ ۲۳۲

عدن کے راستے پر

جزا الاحسان جزا: ''سوچ کنارے'' لاہور۔ سنگِ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء صفحہ ۱۶۰

حمیرا رحمان: ''اندمال'' کراچی دانیال

''انتساب''

حمیرہ شمع رضوی: ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' لاہور، الحمد ۲۰۰۲ء صفحہ ۱۲۷

خوشنودہ بیگم: ''تم نہیں آئے'' لاہور ۱۹۹۹ء

درِ انجم عارف: ''رتجگوں کا شہر'' لاہور، سحر سنز پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء صفحہ ۱۱۸

''نوائے زیرِ لب'' لاہور ۱۹۹۰ء

رابعہ رحمٰن: ''نیند مجھے کب آئے گی'' لاہور، الحمد ۲۰۰۳ء صفحہ ۲۲۰

رابعہ سرفراز: ''سدا وہ میرے ساتھ'' (ترجمہ) فیصل آباد قرطاس ۲۰۰۳ء صفحہ ۱۳۶
راحت معظم: ''صرف تم'' لاہور الحمد ۲۰۰۱ صفحہ ۱۱۲
رباب انجم: ''تنہائیوں میں خدا'' لاہور دبستانِ شعروادب ۲۰۰۰ء صفحہ ۱۲۸
رخشندہ نوید: ''پھر وصال کیسے ہو'' لاہور الحمد ۱۹۹۵ء صفحہ ۱۴۴
رضیہ اسماعیلی: ''میں عورت ہوں'' لاہور تخلیقات ۲۰۰۰ء
روبینہ بٹ: ''آپ ہم سے خفا نہیں ہوئے'' لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۹ء
''صرف تم'' لاہور ایضاً ۲۰۰۱ء صفحہ ۹۵
روحی ناز: ''تم سے ملنے کے بعد'' لاہور پرنٹ لائن پبلشرز ۲۰۰۰ء صفحہ ۱۱۲
روشن آراء نزہت: ''تمہارے لیے'' لاہور ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۲۷
ریحانہ روحی: ''عشق زاد'' کراچی نخلستان ادب ۲۰۰۰ء صفحہ ۲۲۴
ریحانہ قمر: ''مگر تم اپنا خیال رکھنا'' لاہور الرزاق ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۱۲
''تم ہو تو میں بھی ہوں'' لاہور الرزاق ۲۰۰۱ صفحہ ۱۷۷
''ہم نہ ملیں شاید'' لاہور الرزاق ۲۰۰۲ء صفحہ ۱۴۴
زہرا نگاہ: ''ورق'' لاہور اساطیر ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۵۵
''شام کا پہلا تارا'' لاہور اساطیر ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۸۳
سارا شگفتہ: ''آنکھیں'' لاہور فکشن ہاؤس ۱۹۹۷ء صفحہ ۱۸۴
سلمٰی اسما شاہ: ''محبتوں کے بعد'' اسلام آباد ماڈرن بک ڈپو ۱۹۹۷ء
سعدیہ روشن صدیقی: ''افق'' کراچی ایس آر۔ پبلی کیشنز ۱۹۹۹ء صفحہ ۲۰۸
سعیدہ اختر: ''جرسِ رفتہ'' لاہور ۱۹۸۸ء
سعیدہ شبنم: ''گلِ شبنم'' لاہور الحمد ۲۰۰۰ء صفحہ ۱۱۲
شاہدہ حسن: ''اک تارہ ہے سرہانے میرے'' لاہور الحمد ۱۹۹۵ء صفحہ ۲۵۶
''یہاں کچھ پھول رکھے ہیں'' کراچی شہرزاد ۲۰۰۲ء صفحہ ۱۸۰
شاہین حنیف رامے: ''دستِ دعا'' لاہور ماورا پبلشرز ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۶۰
شاہین مفتی: ''امانت'' لاہور ۱۹۸۱ء صفحات ۱۱۲

''مسافت'' لاہور' اساطیر' ۱۹۹۸ء صفحات ۱۶۰
پانی پہ قدم۔ ۲۰۰۴ء

شائستہ حبیب: ''سورج پہ دستک'' لاہور

شائستہ نزہت: ''بلآخر'' لاہور' دستاویز' مطبوعات' ۱۹۹۳ء صفحات ۱۱۲

شبنم شکیل: ''شب زاد'' لاہور' ماورا پبلشرز' ۱۹۹۷ء صفحات ۱۴۳
''اضطراب'' لاہور' سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء صفحات ۱۳۹

شگفتہ نازلی: ''حرف حرف جوت جلے'' لاہور' گلہائے شگفتہ پبلی کیشنز ۲۰۰۱ء صفحات ۱۲۲

شمسہ کنول: ''دھوپ کی زد میں پہلا چاند'' لاہور' سفینہ پبلی کیشنز' صفحات ۱۰۰

شمیم یوسف: ''شمائم'' ۱۹۸۹ء

شہناز مزمل: ''موسم کے سائبان'' لاہور پاک بک ایمپائر' ۱۹۹۴ء صفحات ۲۰۸
''میرے خواب ادھورے ہیں'' لاہور' عمیر پبلشرز ۱۹۹۵ء صفحات ۱۱۱
''پیامِ نو'' لاہور' ماڈرن لائبریری ۱۹۸۹ء
''جذب وحرف'' لاہور' تجدید اشاعت گھر' ۱۹۹۰ء
''جرأتِ اظہار'' لاہور' بکس سروس' ۱۹۹۰ء
''عکس دیوار پر تصویر'' لاہور' ذی شان ۱۹۹۱
''عشق تماشا'' لاہور' ندا پبلی کیشنز ۲۰۰۲ء صفحات ۱۵۱
''قرضِ وفا'' (انتخاب کلام از رضیہ اسماعیل) لاہور ندا پبلی کیشنز ۲۰۰۲ء صفحات ۱۹۹

صائمہ خیری: ''میری نظمیں میرے گیت'' کراچی' اکیڈمی ادبیات' ۱۹۸۶ء

صائمہ علی: ''دھوپ لوں ہتھیلیوں پر'' لاہور' الحمد ۲۰۰۳ء صفحات ۲۳۲

صبا ارشد: ''چشمِ تر میں آجاؤ'' لاہور' القلم پبلشرز' ۲۰۰۲ء صفحات ۱۱۲

صبا شعیب شمسی: ''اکیلی اس گزرگاہ پر'' لاہور' الحمد ۲۰۰۰ء صفحات ۱۵۵

صبا نصرت: ''آنکھوں پر ہاتھ رکھ دو'' لاہور الحمد ۲۰۰۳ء صفحات ۱۶۰

صبیحہ صبا: ''لفظ بے تصویر'' لاہور، الحمد ۱۹۹۸ء صفحات ۱۹۲

''چشم ستارا شمار'' کراچی، العزیز اکادمی ۱۹۹۲ء صفحات ۲۰۸

''لفظوں کا شہر'' ۱۹۷۹ء

''تری صدا آئی'' ۱۹۹۴ء

صغریٰ صدف: ''جدا ہیں چاہتی اپنی'' لاہور، صدف پبلشرز ۱۹۹۹ء

طاہرہ ریاض: ''چاہت بھری باتیں'' لاہور۔ ایسٹرن پبلشرز ۱۹۹۷ء صفحات ۱۱۲

طاہرہ شمیم: ''رودادِ وفا'' حیدر آباد ۱۹۸۶ء

طاہرہ نواز: ''سورج کے راستے میں'' لاہور، الجدید پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

عابدہ تقی: ''ممبر سلونی کی اذاں''

فصیلِ خواب سے آگے۔ عکاس پبلی کیشنز۔ اسلام آباد

عرفانہ عزیز: ''برگ ریز'' لاہور، ۱۹۷۱ء صفحات ۱۵۱

''کفِ بہار'' کراچی مکتبہ افکار، ۱۹۸۵ء صفحات ۲۲۴

''حرفِ شیریں'' لاہور، خزینہ علم و ادب ۲۰۰۲ء صفحات ۱۴۴

''خوشبوئے پیرہن''

''دہشتِ آواز''

''ابر گہر بار''

عذرا شوذب: ''محبتوں کا نصاب سچ ہے'' کراچی، بزم تخلیق ادب پاکستان ۲۰۰۳ء صفحات ۱۷۶

عذرا وحید: ''پانی میں سورج'' ملتان کاروان ادب، ۱۹۸۳ء صفحات ۸۸

''سراب کے پھول'' ملتان کاروان ادب۔ ۱۹۷۹ء

''لبریز'' ملتان کاروانِ ادب ۱۹۸۹ء

عشرت آفرین: ''کنج پیلے پھولوں کا'' کراچی، دانیال، ۱۹۸۵ء

غزالہ خاکوانی الحاج ڈاکٹر: ''میرے پر نہ باندھو'' لاہور جنگ پبلشرز ۱۹۸۷ء ص ۱۵۹

''خود آشنائی'' لاہور فیروز سنز

فاخرہ فاخرہ تبسم: ''آبشارِ غزل'' لاہور ادارہ ادب ۱۹۸۲ء

فاخرہ بتول: ''چاند نے بادل اوڑھ لیا'' لاہور الحمد ۱۹۹۸ء ص ۲۰۷

''سمندر پوچھتا ہوگا'' لاہور خزینہ علم و ادب ۲۰۰۱ء ص ۱۳۸

فاطمہ حسن: ''دستک سے در کا فاصلہ'' کراچی فرید پبلشرز ۱۹۹۳ء ص ۱۱۹

''بہتے ہوئے پھول'' ۱۹۷۷ء

فائزہ ندیم فراز: ''چاند اور میں'' لاہور خزینہ علم و ادب ۲۰۰۱ء ص ۱۳۶

فرح زیدی: ''کاش تم بھی موسم ہوتے'' لاہور مشعل پبلی کیشنز ۱۹۹۸ء

فرحت زاہد: ''لڑکیاں ادھوری ہیں'' کراچی مطبوعات اقدار ۱۹۹۵ء ص ۱۶۰

فرخ زہرا گیلانی: ''بنتِ حوّا'' لاہور ماورا ۲۰۰۳ء ص ۱۴۳

''کہر کے اس پار'' لاہور ماورا ۲۰۰۳ء ص ۲۰۰

فرزانہ خان نیناں: ''درد کی نیلی رگیں'' نوٹنگم (یوکے) ۲۰۰۳ء ص ۱۸۹

فہمیدہ ریاض: ''بدن دریدہ'' کراچی دانیال ۱۹۸۲ء ص ۱۱۹

''دھوپ'' کراچی دانیال ۱۹۸۳ء ص ۹۶

''پتھر کی زبان'' کراچی دانیال ۱۹۸۶ء ص ۸۲

''ہمرکاب'' کراچی پاکستانی ادب پبلشرز ص ۱۰۹

''میں مٹی کی مورت ہوں'' (کلیات) لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۸ء ص ۴۳۶

قمر آراء ڈاکٹر: ''خواب آنگن'' (گیت) لاہور ماورا ۱۹۹۴ء ص ۱۱۳

''چاندنی ہم سفر ہوگئی'' لاہور ۱۹۹۹ء ص ۱۶۴

کشور ناہید: ''لبِ گویا'' ۱۹۶۹ء

''بے نام مسافت'' ۱۹۷۱ء

''نظمیں''

''گلیاں دھوپ دروازے'' ۱۹۷۸ء

''ملامتوں کے درمیاں'' لاہور مکتبہ عالیہ ۱۹۸۱ء ص ۲۴۰

''سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ''

''خیالی شخص سے مقابلہ''

''میں پچھلے جنم میں رات تھی''

''خستہ سامانیِ دل'' (کلیات) لاہور سنگ میل پبلی کیشنز

''دشتِ قیس میں لیلیٰ'' (کلیات) لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء ص ۱۳۱۱

گڑیا: ''یادوں کے جھونکے'' لاہور دعا پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء

گلفام نقوی: ''سہارے مل ہی جاتے ہیں'' لاہور ادارہ سخن ساز ۲۰۰۱ء ص ۱۱۲

گلنار آفرین: ''شام کا تنہا ستارہ'' کراچی رائٹرز بک فاؤنڈیشن ۲۰۰۳ء

گوہر سلطانہ عظمیٰ: ''اندھیرے میں لکھی نظمیں'' لاہور نگارشات ۱۹۷۰ء ص ۱۵۷

ماہ طلعت زاہدی: ''روپ ہزار'' ملتان کتاب گھر ۲۰۰۲ء ص ۳۱۰

مسرت جہاں خٹک: ''ملالہ'' پشاور ۱۹۹۳ء ص ۲۲۴

مسرت کنول: ''مٹھی میں جگنو'' لاہور الحمد ۲۰۰۳ء ص ۱۷۲

مسرت مرزا: ''کم کم بادو باراں ہے'' لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۹ء ص ۲۰۰

منصورہ احمد: ''طلوع'' لاہور اساطیر ۱۹۹۷ء ص ۲۳۰

ناصرہ حاجرہ مشکور: ''جہانِ آرزو'' لاہور نذیر سنز ۱۹۹۳ء

ناہید قاسمی: ''بنجر دل سیراب کرو'' لاہور التحریر ۱۹۹۱ء ص ۲۱۵

نرگس شیخ: ''کلیوں کے خواب'' لاہور الادب پبلی کیشنز ۱۹۸۳ء

نزہت انیس: ''نہیں'' کراچی ادارہ فکر و دانش ۱۹۹۸ء ص ۲۲۱

نجمہ یاسمین یوسف: ''ممتا رنگ ہزار'' لاہور ۲۰۰۱ء ص ۱۵۰

''سیپ سمندر موتی'' لاہور ۲۰۰۱ء ص ۱۲۸

''دستِ دُعا'' لاہور ۲۰۰۱ء ص ۱۱۰

نسرین انجم بھٹی: ''بن باس'' لاہور پلس کمیونی کیشنز ۱۹۹۴ء ص ۲۶۳

نسرین گل: ''گلِ سخن'' اسلام آباد: شاہ پبلی کیشنز ۱۹۹۷ء ص ۱۲۹

''پیش رفت'' لاہور: الحمد ۲۰۰۰ء ص ۱۲۱

نسیم اختر: ''ادھورے سفر'' لاہور: ایشین پبلی کیشنز ۱۹۹۷ء ص ۱۱۲

''ابرِ رحمت'' ساہیوال: مکتبہ تعلیم ۱۹۹۷ء ص ۹۴

''درد کا اک شہر'' لاہور: خزینہ علم و ادب ۲۰۰۰ء ص ۳۲

''وفاؤں کا بھرم'' لاہور: خزینۂ علم و ادب ۲۰۰۲ء ص ۱۲۴

نغمہ خالد ''اگر تم ساتھ دو میرا'' لاہور: شام کے بعد پبلی کیشنز ۲۰۰۱ء ص ۱۰۳

نوشابہ نرگس: ''بے صدا حرف'' ملتان: کاروانِ ادب ۱۹۸۵ء ص ۱۴۳

نوشی انجم: ''خزاں'' ملتان: بک ڈپو ۱۹۹۶ء ص ۱۱۲

نوشی گیلانی: ''محبتیں جب شمار کرنا'' لاہور: الحمد ۱۹۹۳ء ص ۲۴۶

''اداس ہونے کے دن نہیں ہیں'' لاہور: گیلانی پبلی کیشنز ۱۹۹۹ء ص ۱۶۰

نیلما سرور: ''واپسی کا سفر'' لاہور: خالد پبلشرز ۱۹۹۹ء ص ۱۲۸

یاسمین حبیب: ''آسیب سے پرچھائیں تک'' لاہور: الحمد ۱۹۹۶ء ص ۱۶۰

یاسمین حمید: ''پس آئینہ'' ۱۹۸۸ء

''حصارِ بے در و دیوار'' ۱۹۹۱ء

''آدھا دن اور آدھی رات'' لاہور: گورا پبلشرز ۱۹۹۶ء ص ۲۳۷

یاسمین گل: ''اعتراف'' لاہور: اساطیر ۱۹۹۵ء ص ۱۶۰